مقالاتِ تاریخی

پروفیسر علی محسن صدیقی

قرطاس

فالخیل و اللیل و البیداء تعرفنی
والسیف و الرمح و القرطاس و القلم

(المتنبی)

(اور گھوڑے اور رات اور صحرا مجھے جانتے ہیں
اورتلوار اور نیزہ اور کاغذ و قلم)

اسلامی علوم و تاریخ کے موضوع پر پندرہ (۱۵)
منتخب، پُر مغز و نادر تحقیقی مقالات کا بیش بہا مجموعہ

مقالاتِ تاریخی

تالیف

علی محسن صدیقی

پروفیسر (ریٹائرڈ) معارفِ اسلامی و تاریخِ اسلام

کراچی یونیورسٹی، کراچی

قرطاس

فہرست مضامین

انتساب

سیدہ صدیق فاطمہ بیگم

کے نامؐ

جن کی پچاس برسوں سے زیادہ عرصہ پر محیط

پُرخلوص رفاقت نے مجھے اپنے علمی مشاغل کو جاری

رکھنے کا حوصلہ دیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

یہ کتاب میرے اُن مضامین کا منتخب مجموعہ ہے جو اسلامی علوم، بالخصوص اسلامی تاریخ کے موضوع پر، میں نے مختلف اوقات میں تحریر کیے اور مختلف علمی جرائد میں شائع ہوئے۔ قریب قریب ایسے پچاس (۵۰) مضامین کی نقول میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں نے ان میں سے پندرہ (۱۵) مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کیا ہے مضامین کا یہ انتخاب میرے اپنے ذوق کے مطابق ہے اور اس کی ایک وجہ ناشر کی تنگئ داماں بھی ہے۔ اگر عمرِ گریز پا نے مہلت دی اور میں نے مناسب خیال کیا تو باقی مضامین بھی ایک مجموعہ میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ مگر اس سے پہلے برعظیم پاک و ہند کی تاریخ و ثقافت سے متعلق مقالات اور بعض دیگر عنوانات کے تحت لکھے گئے مضامین شائع ہوں گے۔ یوں ماقی مضامین متذکرۂ بالا جس مجموعہ کی زینت بنیں گے وہ سلسلۂ مضامین کا چوتھا مجموعہ ہوگا۔ واالعلم عند اللہ

اس مجموعہ میں شامل مضامین کا عرصۂ تحریر ثلث صدی پر پھیلا ہوا ہے، مگر مؤلف کی فکر میں کوئی قابل ذکر فرق قارئین کو محسوس نہ ہوگا، یوں یہ تمام مضامین ایک ہی سلسلہ میں منسلک اور ایک ہی نہج پر مربوط و مرتب ہوں گے ہاں مرورِ زمانہ سے قلم میں پختگی اور فکر میں رسوخ کسی قدر ضرور نمایاں ہوگا لیکن بحیثیت مجموعی ائتلافات ہی دکھائی دے گا اور اختلاف کا تاثر انشاء اللہ قائم نہ ہوگا۔

اس کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے اُن کی تحریر وتسوید میں انتہائی احتیاط برتی ہے اور جو بات بھی لکھی ہے، کتب مراجع کی ضروری مراجعت کے بعد اُس کی توثیق ضرور کرلی ہے۔ احتیاط مزید کی غرض سے اس مقدمہ کی تحریر سے پہلے تمام مضامین کو میں نے لفظاً لفظاً پڑھا ہے اور جہاں کوئی غلطی نظر آئی، اُس کی تصحیح اور حوالہ جات کی توثیق مزید کردی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی تسامح ہوا ہے، تو اس کی نشاندہی کی درخواست کرتا ہوں۔

خاکسار

علی محسن صدیقی

قرآن میں غیر عربی الفاظ کی حقیقت

قرآن مجید، عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ خود اللہ نے اس کی زبان کو عربی کہا ہے۔ قرآن میں ایسے آٹھ مقامات ہیں جہاں قرآن کی زبان کو عربی کہا گیا ہے۔

۱۔ انا انزلناہ قرآناً عربیاً [۱] (ہم نے اس کو عربی قرآن اتارا)

۲۔ انزلنا حکماً عربیاً [۲] (ہم نے اسے عربی حکم نازل کیا)

۳۔ انزلناہ قرآناً عربیاً [۳] (ہم نے اسے عربی قرآن اتارا)

۴۔ قرآناً عربیاً غیرَ ذی عوجٍ [۴] (عربی قرآن جس میں کجی نہیں ہے)

۵۔ کتاب فُصِّلتْ آیاتُہ قرآنا عربیاً [۵] (کتاب جس کی آیتیں مفصل ہیں، عربی قرآن)

۶۔ اوحینا الیک قرآناً عربیاً [۶] (ہم نے آپؐ کی جانب عربی قرآن کو وحی کیا)

۷۔ انا جعلناہ قرآناً عربیاً [۷] (ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا)

۸۔ وھذا کتاب مصدق لساناً عربیاً [۸] (یہ کتاب ہے جو تصدیق کرتی ہے، عربی زبان میں)

ان کے علاوہ دو جگہوں پر اس لسان عربی کو ''عربی مبین'' کہا گیا ہے:۔

۱۔ وھذا لسانٌ عربیٌ مبینٌ [۹] (یہ زبان ''عربی مبین'' ہے)

۲۔ بلسانٍ عربیٍ مبینٍ [۱۰] (بزبان ''عربی مبین'')

عموماً مفسرین لفظ ''مبین'' کو صفت قرار دے کر اس کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہیں اور اس سے واضح کھولنے والا اور ظاہر کرنے والا مراد لیتے ہیں [۱۱] لیکن اگر اسلام سے قبل عرب کی لسانی تقسیم کا مطالعہ کیا جائے اور قحطان و عدنان کی زبانوں کے امتیازات کو پیش نظر رکھا جائے تو اس نتیجہ پر بہ آسانی پہونچا جا سکتا ہے کہ یہاں ''عربی مبین'' کے معنی واضح عربی نہیں ہیں بلکہ اس سے ایک خاص عربی زبان مراد ہے۔ آل قحطان کی زبان حمیری اور ان کا رسم الخط 'مسند' کہلاتا تھا۔ اور یوں عربی مبین وہ زبان تھی جو بنو اسماعیلؑ بولتے تھے۔ مشہور عالم یاقوت حموی ''معجم البلدان'' میں لکھتا ہے:۔

''چھٹی زبان جسے اللہ نے سرزمین عرب میں بول چال کی زبان بنایا، اور جو اس سے قبل رائج نہ تھی، حضرت اسماعیلؑ کی زبان تھی۔ بنو اسماعیل کی اس زبان کا نام 'مبین' تھا۔ ان کے رسم الخط کو بھی 'مبین' ہی کہتے تھے اور آج وہی عرب کی غالب زبان ہے...... اور یہی (مبین) (بنو اسماعیل یعنی) معد بن عدنان کی زبان ہے''۔ [۱۲]

یہی عربی مبین ''بنو اسماعیل'' کے تمام قبائل کی زبان قرار پائی۔ قریش جو اپنے مورث اعلیٰ کے جانشین اور آل اسماعیل میں سب سے نمایاں اور باعزت تھے ان کی زبان عربی مبین ہی تھی اور اسی لسان قریش اور عربیٔ مبین میں قرآن نازل کیا گیا۔ جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں قرآن کی نقول کی تیاری کا کام شروع ہوا تو ناقلین کے مابین اختلافِ قرأت کی صورت میں آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ اسے قریش کے تلفظ و قرأت میں تحریر کیا جائے کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں اتارا گیا ہے۔ [۱۳]

قرآن کو زبان قریش (عربیٔ مبین) میں نازل کرنے میں صرف یہی مصلحت نہ تھی کہ قریش تمام قبائل عرب کے روحانی پیشوا سمجھے جاتے تھے اور ان کی زبان پورے ملک میں مشترک ذریعہ افہام و تفہم کے باعث ممتاز خیال کی جاتی تھی اور اسی کا پورے عرب میں چلن تھا، بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قریش ایک تاجر پیشہ قوم تھے۔ ان کے تجارتی قافلے حبش، شام و عراق سے گزرتے رہتے تھے۔ اس عہد کی متمدن

اقوام میں روم و ایران سے ان کے قریبی تعلقات تھے [۱۴] اور ان تعلقات نے ان کی زبان کو دیگر السنۂ عربیہ کے مقابلہ میں خاصا وسیع بنا دیا تھااور اس میں اعلیٰ خیالات کی ادائیگی اور بلند مضامین کے ذریعۂ اظہار بننے کی صلاحیت دوسری قبائلی زبانوں سے بدرجۂ اتم زیادہ تھی۔قریش کی زبان ایک زندہ اور ارتقاء پذیر زبان تھی جس میں تہذیب وتمدن کے نت نئے لوازم کوقبول کرنے اور اخذ ونفوذ کی صفت موجود تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ہم سایہ ممالک کی زبانوں سے اثر قبول کیا اور خود بھی ان کو متاثر کیا۔اس زبان نے حبشی، نبطی، سریانی، عبرانی، فارسی اور رومی (یونانی) سے الفاظ مستعار لئے۔عموماً ان الفاظ کا تعلق لوازمات ِتمدن اور مذہبی اصطلاحات سے تھا جہاں تک حبشی اورنبطی زبانوں کے الفاظ مستعار لینے کا مسئلہ ہےتو یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہوگا کہ یہ دونوں زبانیں اصل عربی زبان کی شاخیں ہیں۔یمن کے عرب حکم رانوں نے بحر احمر کے دوسرے ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں اور وہاں ان کی زبان وتہذیب کو فروغ ہوا۔یہ مقامی اثرات سے متاثر ہوئی اور اصل عربی سے کسی قدر مختلف ہوگئی تاہم اسے جنوبی عربی کی ایک شاخ ہی سمجھا گیا [۱۵] اسی طرح نبطی جو انباط کی زبان تھی درحقیقت شمالی عربی کی ایک شاخ تھی۔جب انباط جزیرۂ عرب سے نکل کر عراق وشام کے سرحدی مقامات میں پھیلےتو ان کی زبان مقامی زبانوں سے متاثر ہوئی۔عراق کی آرامی اور شام کی سریانی زبانوں سے اس نے الفاظ مستعار لئے اور یہ نفوذ اس حدتک بڑھا کہ انباط کی زبان ایک مستقل حیثیت کی مالک بن گئی مگر رہی وہ شمالی عربی کی ایک قسم ہی [۱۶] سریانی اور عبرانی زبانوں کا تعلق السنۂ سامیہ سے ہے۔عربی بھی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور یوں یہ دونوں زبانیں عربی کی ہم نسل زبانیں ہیں اور جیسا کہ مسلم ہے امم سامیہ کا مسکن اول سرزمین عرب ہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی زبان عربی ہی تھی تو کلدانیہ وشام میں آباد ہونے والے سامی قبائل نسلاً عرب ہی ہوئے اور ان کی زبانیں جو بعد میں امتداد زمانہ سے عبرانی اور سریانی کہلائیں ابتداء میں عربی ہی کی ایک شکل ہوں گی۔بناء بریں عبرانی اور سریانی زبانیں بھی عربی زبان کی

شاخیں ہیں جو اپنے بولنے والوں کی نقل مکانی کے باعث مقامی اثرات کی اثر پذیری سے الگ زبانیں قرار پائیں[۱۷] اس لئے اگر عربی زبان نے زمانۂ مابعد میں ان زبانوں سے کچھ الفاظ مستعار لئے یا مشترک الفاظ کے وہ معانی و مفاہیم لے لئے جو ان زبانوں کے ساتھ مخصوص ہو گئے تھے تو ہمیں کوئی حیرت نہ ہونی چاہیے۔ان زبانوں میں بہت سے الفاظ مشترک نظر آئیں گے۔نیز بہت سی ترکیبیں اور محاورے بھی باہم دگر مشترک ملیں گے۔دو طرفہ عمل نفوذ و تاثر ہر دور میں جاری رہا۔قریش کی زبان بھی اس سے متاثر ہوئی اور اس نے فاعلی و منفعلی دونوں کردار ادا کئے۔

جہاں تک فارسی اور رومی زبانوں سے اثر پذیری کا تعلق ہے تو اس کے اسباب ظاہر ہیں پہلی صدی عیسوی کے آغاز ہی سے عراق و شام سے متصل سرحداتِ عرب پر حیرہ کی ایرانی طفیلی ریاست اور غسان کی رومی طفیلی حکومت قائم ہو چکی تھیں۔ان ریاستوں کے تمدنی و سیاسی اثرات پورے جزیرہ نمائے عرب پر جلد ہی چھا گئے۔چھٹی صدی عیسوی میں یمن پر حبشیوں نے قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی مگر حبش کا یہ اقتدار دیرپا نہ ثابت ہوا اور ایرانیوں نے یمن کو اپنی شہنشائیت کا ایک صوبہ بنا لیا۔نزول قرآن تک یہی کیفیت رہی[۱۸] نتیجہ یہ ہوا کہ ایران و روم کے تمدنی و سیاسی اثرات سرزمین عرب میں کافی گہرے ہو گئے۔ان سے متعلق الفاظ بھی عربی زبان میں داخل ہو گئے۔فارسی و رومی کے یہ الفاظ جو غیر سامی زبانوں سے تعلق رکھتے تھے عربی زبان میں اپنی اصلی ہئیت میں قبول نہ کئے گئے اور تعریب کی منزل سے گزر کر ایسے نکھرے کہ خالص عربی الفاظ معلوم ہونے لگے۔[۱۹] انہیں عربی اوزان کے مطابق بنایا گیا۔عربی صیغوں پر ڈھالا گیا اور یوں عجمیت کے اثر سے یہ الفاظ پاک ہو کر خالص عربی بن گئے۔قرآن جو قریش کی زبان یعنی عربی مبین میں نازل کیا گیا ہے اس نے بھی متعدد ایسے غیر عربی الفاظ کو قبول کیا جو عربوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ السنۂ سامیہ کے مشترک الفاظ کے ان استعمالات سے بھی کام لیا جو عربی میں رائج نہ تھے اور دوسری زبانوں کے ساتھ مخصوص ہو گئے تھے۔[۲۰]

قدیم مفسرین میں سے کچھ حضرات اس خیال کے حامی ہیں کہ قرآن میں کوئی عجمی لفظ موجود نہیں ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ نے قرآن کی زبان کو عربی کہا ہے۔ جب قرآن کی زبان عربی ہوگی تو اس میں غیر عربی الفاظ کے وجود کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ مشہور ماہر لغتِ عرب ابوعبیدہ بن معمر (متوفی ۲۰۹ھ) اور مفسر و مورخ محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اسی خیال کے حامی تھے اور انہوں نے اس سلسلہ میں بڑا غلو کیا ہے [۲۱] مگر مفسرین اور ماہرین لغت کی ایک کثیر تعداد قرآن میں غیر عربی الفاظ کے وجود کو ہمیشہ تسلیم کرتی رہی ہے۔ متقدمین میں حضرت عبداللہ بن عباس، عکرمہ و مجاہد نے قرآن میں عجمی الفاظ کی نشان دہی کی۔ مشہور لغوی جوہری نے متعدد الفاظ کی اصل سے بحث کر کے ان کی عجمیت ثابت کی۔ایک دوسرے ماہر لغت ابومنصور نے ان دونوں اقوال میں یہ تطبیق کی کہ اصلاً یہ الفاظ عجمی ہیں مگر جب ان کی تعریب ہوگئی تو پھر یہ عربی بن گئے۔ شہاب الدین خفاجی نے یہ الزامی جواب دیا کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس (متوفی ۶۸ھ) عکرمہ (متوفی ۱۰۷ھ) اور مجاہد (متوفی ۱۰۳ھ) نے قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کیا ہے تو طبری و ابوعبیدہ کا بیان ان کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتا ہے کیونکہ یہ حضرات تاویل وتفسیر قرآن کے مسائل میں جمہور امت کے پیشوا ہیں اور طبری وغیرہ کی حیثیت ان کے مقلدین کی ہے۔[۲۲]

حقیقت یہ ہے کہ جن علماء نے قرآن میں غیر عربی الفاظ کے وجود سے انکار کیا ہے وہ اصول لسانیات سے ناواقف ہیں۔دنیا کی ہر زبان دوسری زبان سے متاثر ہوتی ہے اور ان سے الفاظ مستعار لیتی ہے۔یہ عمل شعوری طور پر بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری طور پر بھی۔ وہی زبانیں زندہ رہتی ہیں جو اس اثر پذیری کو قبول کرتی ہیں اور جو زبانیں ایسا نہیں کرتیں وہ مردہ ہو جاتی ہیں۔قدیم آریاؤں کی دیوبانی زبان سنسکرت کا یہی حشر ہوا۔زندہ زبانوں کی یہ امتیازی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے خود بھی متاثر ہوتی ہیں اور انہیں بھی متاثر کرتی ہیں۔یہی حال زندہ تہذیبوں کا بھی ہے۔تھوڑے سے غیر زبان کے

الفاظ کی موجودگی سے کسی زبان کا نام نہیں بدل جاتا اور نہ ہی کسی تہذیبی استنباط سے دوسری تہذیب تبدیل ہو جاتی ہے۔ عربی زبان جس کے ذخیرۂ الفاظ میں لاکھوں الفاظ ہیں چند صد عجمی الفاظ کی موجودگی سے غیر عربی نہیں کہی جا سکتی بعینہ اسی طرح قرآن جس میں (۷۷۹۳۴) الفاظ ہیں[۲۳] ایک سو سے کچھ اوپر عجمی الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے اس کی زبان نہ بدل جائے گی۔ وہ الفاظ و محاورات جو اصلاً غیر عربی تھے مگر قریش کی زبان میں رائج ہو گئے تھے یہ بلاغت کا اقتضاء تھا کہ قرآن انہیں استعمال کرتا کہ افہام و تفہیم کا مقصد ان سے صرف نظر کر کے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے ان الفاظ و محاورات کو اپنے اسلوب خاص میں ڈھال کر استعمال کیا۔

جلال الدین سیوطی نے قرآن میں غیر عربی الفاظ پر ایک کتاب ''المهذب فی ماوقع فی القرآن من المعرّب'' کے نام سے تالیف کی۔ اس کے علاوہ اپنی مشہور کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں اس کتاب کی تلخیص کی۔ سیوطی نے ۱۱۹ غیر عربی الفاظ کی قرآن میں موجودگی کی نشان دہی کی ہے[۲۴] مگر ان الفاظ میں سے بعض الفاظ بوجوہ غیر عربی نہیں ہیں۔ ہم ذیل میں ایسے الفاظ کی کسی قدر وضاحت کرتے ہیں۔

(۱) تین الفاظ جن کو سیوطی نے عجمی الاصل قرار دیا ہے دراصل حروف مقطعہ ہیں۔ ان کے خیال میں (طہ) حبشی لفظ ہے جس کے معنی ''یا محمد'' ہیں۔ ایک دوسری روایت کی رو سے یہ نبطی لفظ ہے جس کے معنی ''یا رجل'' یعنی اے آدمی کے ہیں۔ (ن) کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ''اصنع ماشئت'' یعنی جو چاہو کرو۔ تیسرا حرف (یس) ہے جو حبشی لفظ ہے اور ''یا انسان'' یعنی اے مرد کے معنی میں ہے۔ دراصل (طہ) ط اور ہ ہے (ن) ایک حرف ہے اور (یس) ی و س ہے۔ مفسرین نے عموماً حروف مقطعات کے معنی بیان نہیں کیے ہیں اور ان کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ ان حروف کی تاویل کا علم اللہ ہی کو ہے[۲۵] شاہ ولی اللہ نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں ان حروف مقطعات سے بحث کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ جن سورتوں کے اوائل میں یہ حروف مقطعات ہیں

دراصل یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔اور جن مفاہیم و معانی سے ان سورتوں میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے ان عنوانات (حروف مقطعات) سے وہی معنی اجمالاً مراد ہیں۔اور یہ بات بعینہ ایسے ہی ہے جیسے مصنفین و مولفین اپنی تصانیف و تالیفات کے نام رکھتے ہیں اور ان ناموں کے سامنے آتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کتابوں میں کس قسم کے مضامین بیان ہوئے ہیں [۲۶] بہرکیف حروف مقطعات کو کسی اعتبار سے عجمی الفاظ نہیں کہا جا سکتا اور اگر ایسا سمجھ بھی لیا جائے تو جو معنی ان کے بیان کئے جاتے ہیں ان سے مضامین سورت کا کوئی خاص تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔

(۲) آزر (پدر حضرت ابراہیمؑ) روم (ایک قوم و ملک کا نام) مجوس (ایک قوم) ہود و یہود (ایک مذہب و قوم کا نام) اعلام ہیں۔چونکہ غیر عربی الفاظ کی فہرست میں سیوطی نے اعلام کو شامل نہیں کیا ہے اور مفسرین نے عموماً انہیں عجمہ کی فہرست میں محسوب نہیں کیا ہے اس لئے ہم انہیں ایک الگ فہرست میں دیگر اعلام کے ساتھ اس مضمون کے اخیر میں شامل کریں گے۔

(۳) لفظ (سنا) بمعنی بجلی کی روشنی اور چمک کو ابن حجر نے عجمی بتایا ہے حالانکہ یہ لفظ عربی ہے [۲۷] خود سیوطی کو اس پر حیرت ہے کہ ابن حجر نے اس لفظ کو عجمی قرار دیا ہے [۲۸]

(۴) (غساق) بمعنی ٹھنڈا اور بدبودار، ترکی ہے۔کتاب المبانی کے موئف نے بھی اسے طخارستان کی زبان کا لفظ قرار دیا ہے [۲۹] اسلام سے قبل عربوں کا ترکوں سے کسی قسم کا میل جول نہ تھا و نیز (غساق) کا مادہ (غسق) ہے اور اس کے متعدد مشتقات کا عربی لغات میں ذکر موجود ہے [۳۰]۔بناء بریں یہ خالص عربی لفظ ہے۔شہاب الدین خفاجی نے بھی اس کی تعریب پر شک کا اظہار کیا ہے اور اس کی عربیت کی جانب اشارہ کیا ہے [۳۱] قرآن میں غساق سے پیپ مراد ہے جو اہل دوزخ کی خوراک ہوگی۔سورۃ نباء کی ۲۴۔۲۶ آیتوں میں ہے (لایذوقون فیھا برداً ولاشراباہ الاجھیماً و غساقاًہ جزاءً وفاقاًہ)

(۵) (الاولیٰ والآخرۃ) (بطائن) (سید) اور (مزجاۃ) کے متعلق یہ رائے ظاہر کی

نے قصد کیا یا شروع کیا، طَفِقَ جَعَلَ کَرُبَ اَخَذَ اَوْشَکَ عَسٰی اور کَادَ افعال مقاربہ ہیں ۔ یہ افعال رجا، آغاز کار اور سرعت کے مفاہیم ادا کرتے ہیں [۳۷] ان افعال میں سے کسی کے مُعَرب ہونے کا دعویٰ محتاج ثبوت ہے اور محل نظر بھی۔

(۹) (اخلد) بمعنی مائل ہوا۔ (الیم) بمعنی درد ناک (رمز) بمعنی ہونٹ ہلانا اور (قمل) بمعنی جوں سیوطی کے خیال میں عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ انہی معنوں میں عبرانی میں بھی مستعمل ہوں جن میں عربی زبان میں وہ استعمال کیے جاتے ہیں اور جو قرآن میں مراد ہیں، لیکن یہ خالص عربی الفاظ ہیں۔ عبرانی و عربی ایک ہی نسل کی زبانیں ہیں اس لیے ان میں اشتراک الفاظ ممکن ہے عربی میں کہتے ہیں اخلد الرجل بصاحبہ یعنی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ بمنزلہ لازم و ملزوم کے ہوگیا۔ اس کے مجازی معانی مائل ہونے اور راضی ہونے کے ہیں [۳۸]۔ (الیم) کا مادہ (الم) ہے۔ جس کے معنی درد کے ہیں ''تَاَلَّمَ، الم، الیم، اور مولم'' اس کے مشتقات ہیں [۳۹]۔ (رمز) اشارہ و ایماء کو کہتے ہیں خواہ وہ ہونٹوں، آنکھیں، بھوؤں، منہ، ہاتھوں یا زبان سے ہو اسے رمز ہی کہیں گے [۴۰]۔ (قمل) چھوٹے پسوؤں کو کہتے ہیں جن کے پَر نہ ہوں مثلاً پسو، جوں، کھٹمل وغیرہ ایسے پسوؤں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جن کے سرخ پر و بازو ہوں [۴۱]۔ ان الفاظ کے متعدد معانی، مشتقات اور استعمالات کی وجہ سے جن کا ذکر کتب لغت میں ہے، انہیں عربی ہی سمجھنا ہوگا۔

(۱۰) جن الفاظ کو سریانی الاصل قرار دیا گیا ہے ان میں (سُجَّداً) بمعنی سر ڈھانکے ہوئے، (شہر) بمعنی مہینہ، (طور) بمعنی پہاڑ، (ہون) بمعنی حکماء، اور (ھیت للک) بمعنی جلد آؤ، بھی شامل ہیں۔ (سُجَّداً) کا مادہ سَجَد ہے جس کے معنی سر جھکانا ہے قرآن میں ہے (ادخلوا الباب سجداً) یعنی دروازہ میں جھک کر داخل ہو [۴۲]۔ جن لوگوں نے لفظ ''سجداً'' کو سریانی کہا ہے وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ''دروازے میں ڈھانک کر یا چھپا کر داخل ہو''۔ اسی طرح ''طور'' قرآن میں بطور علم استعمال ہوا ہے۔ اگر سریانی میں

اس سے پہاڑ یعنی کوہ وجبل مراد لیے جاتے ہیں تو اس کا کیا اعتبار ہے۔ یہی صورت ''ھون'' کی ہے جس کے معنی نرم رفتاری کے ہیں۔ اور یہی قرآن کا مفہوم ہے [۴۳] سریانی میں اس کے معنی حکماء ہوں گے۔ مگر قرآن میں یہ معنی مراد نہیں لیے گئے ہیں ''شہر'' عربی زبان میں ''قمر'' یعنی چاند کو کہتے ہیں چونکہ ہر نئے چاند سے نئے مہینے کا آغاز ہوتا ہے اس لیے اس کے معنی مہینہ کے ہو گئے۔ خود اردو میں ''چاند'' سے مجازاً مہینہ مراد لینے کا طریقہ موجود ہے۔ قمر کو شہر اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے ظہور، نمود اور شہرت کے سبب دوسرے سیاروں سے ممتاز ہے۔ عربی محاورہ ہے (اشھر نامذ نزلنا علی ھذا الماء) یعنی ہمیں اس چشمہ پر اترے مہینوں ہو چکے اور شہر، بمعنی مہینہ بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے مشتقات بکثرت ہیں [۴۴] (ھیت لــلـک) خالص عربی ہے عرب ''ھیت'' اونٹ اور کتے کو پکارنے کے لیے بولتے ہیں۔ ایک عربی شعر ہے۔

جـاء یـدل کـرشـاالغـرب　　　　وقـلـت ھیتـاہ فتـاہ کـلـبی

اس کے افعال بھی مختلف صورتوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ [۴۵]

(۱۱) سیوطی نے جن الفاظ کو (آرامی) کہا ہے ان میں سے بعض الفاظ عربی الاصل ہیں۔ (تتبیــراً) تتبیر کے معنی ہلاکت تباہی اور بربادی کے ہیں۔ اس کا مادہ (تبَـرَ) ہے (تبار) ہلاک کے معنی میں اور (تابور) ہلاک کرنے والے اور مجازاً فوج کے دستہ کو، کہ اس کا کام بھی ہلاکت ہی ہے، کہتے ہیں۔ اسی طرح (متبور) ہلاک ہو جانے والے اور ناقص کے معنی میں ہے [۴۶]۔ سیوطی کا بیان ہے کہ (تحت) قرآن میں (بطن) یعنی نچلے حصے اور پیٹ کے معنی میں نبطی ہے۔ سیوطی کا یہ قول اس لیے درست نہیں کہ لفظ (تـحـت) ظرف ہے اور (فوق) کی ضد اور عکس ہے۔ اس کے معنی نیچے کے ہیں۔ عربی میں بطور اسم بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی جمع (تـحـوت) آتی ہے۔ جس کے معنی نچلے طبقے کے لوگ اراذل و انفار ہیں [۴۷]۔ (رھــواً) بمعنی ہلکی چال، نرم رفتاری، تھما ہوا اور آرام کی غرض سے پرندے کا اپنے بازوؤں کو پھیلانا عربی لفظ ہے۔ سیوطی کا یہ خیال ہے کہ سکون کے معنی میں

یہ لفظ نبطی یا سریانی ہے جیسا کہ ظاہر ہے اس لفظ کے جو مفاہیم عربی زبان میں ہیں۔ ان میں سکون شامل ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سکون معنی مجازی ہے اصلی نہیں مگر اس لفظ کو غیر عربی قرار دینا صحیح نہیں [۴۸]۔ (صِرھُنّ) میں (صر) کے معنی شق کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بتائے گئے ہیں اور اسے نبطی کہا گیا ہے اس کا مادہ صار یصور ہے۔ اس کے معنی پکارنے، آواز لگانے، پرچانے، مائل ہونے، سامنے آنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں [۴۹]۔ قرآن میں اس لفظ کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ سے ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اے اللہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا۔ بارگاہِ الٰہی سے یہ جواب ملا کہ اے ابراہیم کیا تمہیں اس کا یقین نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا یقین تو ہے مگر یہ سوال اطمینان قلب کے لیے کیا ہے۔ تب اللہ نے فرمایا کہ تم چار پرندوں کو لوان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں مختلف پہاڑوں پر ڈال آؤ۔ تم جب انہیں بلاؤ گے تو وہ دوڑے ہوئے آئیں گے۔ ایسے ہی قیامت میں مردے اللہ کے حکم سے زندہ کیے جائیں گے [۵۰]۔ علامہ ابومسلم اصفہانی نے اس ترجمہ پر اعتراض کیا اور یہ مطلب لیا کہ تم ان پرندوں کو پرچالو پھر انہیں پہاڑوں پر چھوڑ آؤ۔ جب تم انہیں آواز دو گے تو یہ دوڑے ہوئے تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ اسی طرح قیامت کے دن جب اللہ روحوں کو آواز دے گا۔ تو وہ اپنے جسموں میں واپس آئیں گی [۵۱]۔ دونوں ہی صورتوں میں لفظ (صِرْھُنَّ) کے جو معنی لیے گئے ہیں وہ عربی ہیں اور ان میں عجمیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ (عَبَّدت) کے معنی ہیں تو نے غلام بنالیا۔ اس کا مادہ عبد ہے، سیوطی کی روایت ہے کہ یہ لفظ، تو نے قتل کر دیا، کے معنی میں نبطی ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''عبدت بنی اسرائیل'' تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا [۵۲]۔ اگر قتل کے معنی لیے جائیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو قتل کرا دیا، جو خلاف واقعہ ہے۔ اس لیے اس لفظ کے اگر نبطی میں قتل کے معنی ہیں تو وہ یہاں مراد نہیں ہیں اور یوں یہ لفظ عربی ہے۔ (کَفَّر) بمعنی دور کر، محو کر، نبطی نہیں بلکہ عربی ہے۔ اس کا مادہ کَفَرَ ہے۔ کفر کے معنی ہیں۔ انکار کرنا، چھپانا، ڈھانپ لینا، کسی پیر پر

پردہ ڈالنا، وہ زمین جو لوگوں سے دور ہو [۵۳] اس معنی حقیقی سے (کفر عنا سیئاتنا) ہم سے ہماری برائیوں کو دور کردے یا محو کردے) میں جو معنی مراد لیے گئے ہیں، غیر متعلق نہیں اس لیے یہ معنی مجازی ہیں اور معنی حقیقی سے ان کا تعلق باقی ہے کسی لفظ سے اس کے مجازی معنی مراد لینے سے اس کی اصل تبدیل نہیں ہو جاتی۔ (وراء) پیچھے مگر سیوطی کہتے ہیں کہ ایک ضعیف روایت کی رو سے نبطی زبان میں اس کے معنی (امام) آگے کے ہیں۔ قطع نظر روایت ضعیف کے قرآن میں لفظ وراء پیچھے ہی کے معنی میں آیا ہے اور اس لیے آگے کے معنی مقصود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ وراء ظرف مکان ہے۔ اور اضداد میں ہے۔ اس کے معنی (خلف) آگے اور (امام) پیچھے دونوں ہیں۔ اس کے علاوہ (سوا اور علاوہ) بھی اس کے معنی ہیں [۵۴] (وِزر) کو بھی نبطی قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ملجاء، جائے پناہ اور امن کے ہیں۔ اس کے حقیقی معنی پہاڑ کے ہیں اور چونکہ پہاڑ کی پناہ لی جاتی ہے اس لیے اس لفظ کے معنی مجازی جائے پناہ ہو گئے [۵۵]۔

(۱۲) حبشی، الفاظ میں سے بھی چند لفظوں کو غیر عربی نہیں کہا جا سکتا۔ (دُرِّیٌّ) بمعنی چمک دار عربی ہے۔ کوکبٌ دریٌّ، روشن اور چمک دار ستارے کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ، وراء ہے جس کے متعدد معانی میں سے ایک معنی روشن کرنے کے بھی ہیں [۵٦]۔ (حُرِّمَ) بمعنی حرام کیا گیا عربی ہے مگر بقول سیوطی ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے یہ روایت کی ہے کہ (وَحُرِّمَ) حبشی میں، واجب کیا گیا کے معنوں میں ہے۔ یہاں واوٗ عطف کو حُرِّم کا جز و فرض کر کے یہ نکتہ آفرینی کی گئی ہے جو درخور اعتناء نہیں ہے۔ (سَکر) نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا یہ بیان ہے کہ قرآن میں یہ لفظ سِرکہ، کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ حبشی ہے مگر اہل لغت مفسرین کے اس دعویٰ کو نہیں مانتے [۵۷]۔ (یحورُ) وہ لوٹے گا، اس کا مادہ ''حَورٌ'' ہے، جس کے معنی رجوع (لوٹنے) کے ہیں۔ اس کے بیسیوں مشتقات مختلف معانی و استعمالات کے ساتھ لغت عرب میں مذکور ہیں [۵۸]۔ (یَصُدُّونَ) وہ روکتے ہیں۔ سیوطی کا بیان ہے کہ ابن الجوزی یصدون کے معنی

(یضبحوُن) وہ لوگ شور مچاتے ہیں، لیتے ہیں اور یہ اس لفظ کے حبشی میں معنی ہیں۔ قرآن کی عام تفاسیر میں اس لفظ کے معنی ''روکتے ہیں''، بیان کیے گئے ہیں اس لیے ہمیں اس کے حبشی معنی سے کوئی سروکار نہیں [۵۹]۔ حبشی زبان سے متعلق یہاں اس بات کا پھر ذکر کروں گا کہ یہ زبان جنوبی عربی (حمیری) کی ایک شاخ ہے اس کے علاوہ چھٹی صدی عیسوی میں اہل حبش نے یمن پر قبضہ کرکے اسے اپنی مملکت کا ایک جزو بنالیا تھا اور اس کے بعد یہاں ایک خود مختار حبشی (اکسومی) حکومت قائم ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے چند ہی دنوں پہلے ابرہہ، یمن کا اکسومی فرماں روا مکہ پر حملہ آور ہوا تھا تاکہ کعبہ کی مرکزیت کو ختم کردے [۶۰]۔ نزول قرآن کے قریبی عہد میں عربوں کے حبشیوں سے یہ قریبی حلیفانہ و حریفانہ تعلقات عربی زبان پر بھی اثر انداز ہوئے اور اس موقع پر بہت سے حبشی الفاظ جو اصلاً عربی ہی ہوں گے اپنی بگڑی ہوئی شکل میں عربی میں داخل ہوئے۔ عربوں نے عموماً بمصداق (تلک متاعنا رُدَّت الینا) یہ ہماری ہی پونجی تھی، جو ہمیں لوٹادی گئی، انہیں عربی سمجھا اور کہیں کہیں، اگر مناسب سمجھا تو یہ تصریح کردی کہ یہ اہل یمن کی زبان ہے۔

(۱۳) بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جنہیں سیوطی نے عجمی لکھ دیا ہے، مگر وہ کس زبان کے الفاظ ہیں، ان کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ ان الفاظ میں سے کچھ الفاظ بوجوہ عربی ہیں اور انہیں عجمی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (اَبُّ) بمعنی خشک گھاس اور بروایتے گھاس خواہ خشک ہو خواہ تر، قرآن میں فاکھۃً (میوہ) کے مقابل آیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی روایت ہے کہ فاکھہؒ انسان کی خوراک اور اَبُّ چوپایوں کی خوراک ہے اور اس سے تمام چراگاہیں مراد ہیں۔ ایک عربی شاعر اس کو یوں بیان کرتا ہے۔

جذ منا قیسٌ و نجدٌ دارنا ولنا الابُّ بہ والکلاء [۶۱]

(رَسّ) اس کنویں کو کہتے ہیں جسے کنکریوں سے پاٹ دیا جائے۔ قرآن میں ایک گناہ گار قوم کا تذکرہ اصحاب الرس، کے نام سے کیا گیا ہے [۶۲]۔ زبیدی کا بیان ہے کہ یہ کنواں ثمود یا بقیۂ ثمود کا تھا جو عرب قدیم کی ایک قوم تھی۔ زجاج کی روایت یہ ہے کہ

ثمود کے ایک گروہ کی بستی کا نام رس تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ یمامہ میں ایک گاؤں کا نام رُس تھا۔ جسے زبیدی کے زمانہ میں فلج کہتے تھے [٦٣]، سید سلیمان ندوی کی تحقیق کی رو سے اصحاب الرس آل اسماعیل تھے اور قید ماہ بن اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے [٦۴]۔ بہرصورت اصحاب الرس ایک خاص عربی النسل قبیلہ تھے، اور ان کا نام بھی خالص عربی تھا۔ (وَردَۃ) گلاب کا پھول دراصل ''وردَۃ'' ہر درخت کی کلی کو کہتے ہیں۔ مگر اس کا استعمال سرخ رنگ کے پھول کے لیے زیادہ ہوتا ہے اس کی جمع (وُرُدٌ) ہے۔ زبیدی کے بقول یہ لفظ عربی ہے مگر مصباح میں یہ درج ہے کہ یہ مُعَرّب ہے [٦۵] یہ کس زبان کا لفظ ہے اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ (سَقَرٌ) بمعنی دوزخ بھی عجمی نہیں بلکہ عربی ہے۔ اس کے معنی سورج کی گرمی کے ہیں۔ ساقور، آگ میں گرم کر کے گدھے کو داغنے کے لوہے کو کہتے ہیں۔ [٦٦]

اس وضاحت کے بعد ہم ان الفاظ کی فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں جنہیں سیوطی نے غیر عربی قرار دیا ہے اور جو بوجوہ عجمی الاصل ہیں۔

ا۔ فارسی الفاظ

نمبر شمار	لفظ	معنی	ضروری تفصیل
١	اباریق	لوٹا	ابریق واحد ہے۔ فارسی میں (آب ریز د) تھا [٦٧]
٢	بیع	کلیسا، گرجا	اس کی اصل (بیعہ) ہے، سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے [٦٨] اور یہی قرین قیاس ہے
٣	تنوّر	روئے زمین، روٹی پکانے کی بھٹی	فارسی میں (تنُر) [٦٩]
۴	سجّیل	سخت گندھی ہوئی مٹی، کنکر	یہ لفظ سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے مرکب ہے، سنگ گل [٧٠]

۵	دینار	ایک سونے کا سکہ	فارسی میں (دِنار) تھا[۷۱]
۶	زنجبیل	سونٹھ	سید سلیمان ندوی اسے سنسکرت کا (زرنجابیرا) کہتے ہیں[۷۲]۔ فارسی میں یہ (زنجفیل) تھا[۷۳] غالباً فارسی میں سنسکرت سے اور وہاں سے عربی میں آیا۔
۷	سرادق	شامیانہ شاہی، دہلیز، سراپردہ	فارسی میں سراپردہ تھا[۷۴]
۸	سندس	باریک دیبا، ریشمی کپڑا	ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ لفظ سنسکرت کا ہے۔ بہرکیف اس کے معرب ہونے پر اتفاق ہے[۷۵]
۹	کافور	کافور	سید سلیمان ندوی اسے سنسکرت اور اس کی اصل (کپور) قرار دیتے ہیں[۷۶]
۱۰	کنز	خزانہ	فارسی کا گنج عربی میں کنز ہو گیا[۷۷]
۱۱	مِسک	مشک (نافۂ آہو)	سید صاحب نے اسے سنسکرت اور اس کی اصل (موشکا) بتائی ہے[۷۸]، فارسی میں مشک ہے[۷۹]
۱۲	مقالید	کنجی	اس کا واحد (قلید) ہے۔ فارسی کے (کلید) کی یہ تعریب ہے۔ اقلید بھی ہے[۸۰]
۱۳	یاقوت	یاقوت (ایک قیمتی پتھر)[۸۱]	
۱۴	جہنم	جہنم۔ دوزخ	فارسی میں گناہم تھا۔ مگر زیادہ درست یہ ہے کہ یہ عبرانی کے (کہنام) کی تعریب ہے[۸۲]
۱۵	مرجان	مونگا۔ ایک قسم کا موتی	سیوطی نے اس کی اصل نہیں بتائی ہے۔ مگر شاید یہ فارسی (مارگان۔ جمع مار) کا معرب ہے۔

۲۔رومی (یونانی) الفاظ

نمبر شمار	لفظ	معنی	ضروری تفصیل
۱	رقیم	لوح سنگی، تختی، دوات [۸۳]	
۲	صراط	راستہ	یونانی میں (سراط یا زراط) ہے [۸۴]
۳	فردوس	باغ، انگور کا باغ، تاکستان	ثعالبی اور سید سلیمان ندوی کے خیال میں یہ لفظ فارسی ہے۔اس کی اصل (پریدیزہ) ہے [۸۵]
۴	قِسط	عدل، انصاف [۸۶]	
۵	قِسطاس	ترازو، میزان عدل	اس کی اصل (قصطاس) ہے [۸۷]
۶	قِنطار	بارہ ہزار اوقیہ	اوقیہ ایک رطل کا بارھواں حصہ ہے۔ رطل آدھا سیر ہوتا ہے اوقیہ وزن میں ۴۰ درم کے برابر ہے، یوں ایک قنطار ۴ لاکھ ۸۰ ہزار درم کے برابر ہوا [۸۸]
۷	قراطیس	کاغذ، ورق	اس کا واحد (قرطاس) ہے [۸۹] اصل میں (کارتیس) تھا سیوطی نے اسے صرف عجمی لکھا ہے اس کی اصل کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

۳۔عبرانی الفاظ

۱	اَسباط	قبائل بنی اسرائیل	اس کا واحد (سبط) ہے [۹۰]
۲	بَعیر	بارکش چوپایہ، اونٹ، گدھا	زبور داؤد میں ہے کہ ہر بار برداری کے جانور کو عبرانی میں بعیر کہتے ہیں، سورۂ یوسف کی آیت (لمن جاء بہ حمل بعیر) میں بعیر سے مراد گدھا ہے، یہ روایت مقاتل بن سلیمان کی ہے [۹۱]

۳	حِطّۃٌ	درست، صواب	اس کے معنی ہیں (درست بات کہو)
۴	دارِست	اس عورت نے پڑھا	اس کا مادہ (درس) ہے، مِدراس (بیت المدراس) یہودیوں کی مذہبی درسگاہ[۹۲]
۵	راعِنا	ایک گالی۔	یہود مدینہ شرارتاً آنحضرت ﷺ کے لیے استعمال کرتے تھے[۹۳]
۶	رَبّانیوں	فقہاء	یہ (ربانی) کی جمع ہے [۹۴] اسے سریانی بھی کہا گیا ہے
۷	رحمٰن	اللہ کا نام۔ مہربان	اس کی اصل (رخمن) ہے، یہ مُبرد اور ثعلب کا بیان ہے
۸	صلوٰۃ	یہودیوں کا کنیسہ عبادت گاہ	عبرانی میں (صلوتا) ہے
۹	طُویٰ	بوقت شب، ایک مقام	یہ بھی مروی ہے کہ اس کے معنی آدمی کے ہیں۔
۱۰	فوم	گندم، گیہوں	
۱۱	لینۃ	کھجور کا درخت (نخلہ)	یہ یثرب (مدینہ) کے یہود کی زبان تھی
۱۲	مرقوم	مکتوب، لکھا ہوا، نوشتہ	
۱۳	ہُدنا	ہم نے توبہ کی۔	ماضی معروف تثنیہ وجمع متکلم کا صیغہ
۱۴	سجّین	گناہ گاروں کا اعمال نامہ، مقام اہل دوزخ	سیوطی نے اس کی اصل نہیں بتائی ہے، مگر چونکہ (علّیین، مقام اہل جنت) عبرانی ہے یہ لفظ بھی عبرانی ہی ہوگا۔

۴۔ سریانی الفاظ

نمبر شمار	لفظ	معنی	ضروری تفصیل
۱	اَسفار	کتابیں	سِفر کی جمع ہے اسے نبطی بھی کہا گیا ہے، عموماً اس سے تورات کے اجزاء مراد ہوتے ہیں[۹۵]

۲	ربیّون	مذہبی پیشوا	ربی یہود کے مذہبی پیشوا کو کہتے ہیں۔ ربیّون اس کی جمع ہے (ربانی) اور (ربی) ہم معنی ہیں اور میرے خیال میں دونوں ہی عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔
۳	سَرِیّ	چشمہ۔نہر	سَرِی چھوٹی نہر، اس کی جمع (اسرِیَۃ) اور (سُریان) ہے[۹۶]
۴	عدن	انگور کا باغ، تاکستان	ایک روایت ہے کہ یہ رومی ہے، سید صاحب اسے (عادبین) کا مخفف اور قوم عاد کا مسکن بتاتے ہیں[۹۷]
۵	قیُّوم	کبھی نہ سونے والی ذات	اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیوم کے معنی ایسی ذات کے ہیں جس کا کوئی مقابل نہ ہو [۹۸]
۶	یَم	سمندر، دریا	ابن جوزی نے اسے عبرانی قرار دیا ہے۔ اس کی جمع نہیں آتی[۹۹]

۵۔ نبطی الفاظ

نمبر شمار	لفظ	معنی	ضروری تفصیل
۱	اِصرٌ	عہد، پیمان، بوجھ	اس کے معنی گناہ کے بھی ہیں[۱۰۰]
۲	اکواب	کوزے جام سفال	بے کنڈی کا کوزہ، واحد اس کا (کوب) ہے[۱۰۱]
۳	اِل	اللہ کا نام	قریباً تمام سامی زبانوں میں اللہ کے لیے (اِل یا ایل) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[۱۰۲]
۴	حواریون	دھوبی، مددگار	حواری حضرت عیسیٰؑ کے مددگاروں اور ساتھیوں کو کہتے ہیں[۱۰۳]
۵	سَفَرۃ	پڑھنے والے، لکھنے والے	سافر بمعنی کاتب کی جمع ہے[۱۰۴]

۶	سینا	حسین، خوبصورت	
۷	قِطنا	ہمارا نامۂ اعمال، نوشت	(قط) نوشتہ اور جمع متکلم کی ضمیر ہے
۸	ملکوت	بادشاہت	سیدؒ صاحب نے اسے سریانی زبان کا لفظ قرار دیا ہے [۱۰۵]
۹	مناص	جائے فرار، فرار	

۶۔ حبشی الفاظ

۱	اِبلعی	تو نِگل جا	بَلَعَ اس کا مصدر ہے (ابلعی) فعل امر، صیغہ واحد مونث حاضر [۱۰۶]
۲	ارائک	تخت	واحد اس کا (اریکۃ) ہے جس کے معنی آراستہ تخت کے ہیں [۱۰۷]
۳	اَوَّاہ	رحیم، نرم دل	یہ بھی مروی ہے کہ یہ عبرانی کا لفظ ہے اور یہ ایک قسم کی دعاء ہے
۴	اَوَّابٌ	رجوع کرنے والا، تسبیح خواں	
۵	جبت	شیطان	
۶	حَصبٌ	لکڑی	عربی تلفظ (حطب) ہے۔
۷	حُوبٌ	اِثم، گناہ	
۸	سجلّ	کتاب، آدمی	بعض مفسرین نے اسے فارسی بھی کہا ہے
۹	سینین	حسین وخوبصورت	عام مفہوم میں یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو شام میں واقع ہے [۱۰۸]
۱۰	شطراً	ایک جانب	

۱۱	طاغوت	کاہن	سید صاحب نے اسے سریانی الفاظ میں شمار کیا ہے [۱۰۹]
۱۲	طوبیٰ	جنت کا نام، مبارک	سیوطی کی ایک روایت کی رو سے یہ سنسکرت اور بقول سید صاحب سریانی ہے [۱۱۰]
۱۳	عَرِم	بندِ آب، سَد	اس لفظ کا واحد نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا واحد عرمۃ ہے [۱۱۱]
۱۴	غیض	کمی، خشک کردہ، جذب شدہ	
۱۵	قِسورۃ	شیر	
۱۶	کِفلین	دوچند	عام معنی دو حصے، کفل واحد اور کفلین تثنیہ ہے
۱۷	مِشکاۃ	قندیل	اصلاً مشکاۃ اس چھوٹے طاق کو کہتے ہیں جو دیوار میں چراغ رکھنے کی غرض سے بنایا جائے، بعد میں اس سے چراغ کے معنی مستعار لیے گئے [۱۱۲]
۱۸	منساہ	عصا، ڈنڈا	
۱۹	منفطر	پُر، بھرا ہوا، پھٹنے والا	
۲۰	ناشئۃ	قیام، اٹھنا	(ناشئۃ اللیل) قیام شب بغرض عبادت وغیرہ
۲۱	اِستبرق	سبز رنگ کا موٹا دیبا	سیوطی نے اسے عجمی کہا ہے مگر یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ سید صاحب اسے حبشی کہتے ہیں [۱۱۳]

۷۔ عجمی

۱	سلسبیل	جنت کا ایک چشمہ	سیوطی نے اسے عجمی زبان کا لفظ قرار دیا ہے مگر اس کی اصل نہیں بتائی ہے اسی طرح شہاب الدین خفاجی نے بھی اس کی اصل بتائے بغیر اسے عجمی کہا ہے [۱۱۴]

تصریحات بالا کی رو سے سیوطی کے بتائے ہوئے (۱۱۹) غیر عربی الفاظ میں سے (۴۵) الفاظ کے اخراج کے بعد (۷۴) الفاظ ایسے رہ جاتے ہیں جو قرآن میں عجمی الاصل ہیں۔ مگر سیوطی کے نشان زدہ الفاظ کے علاوہ بھی کچھ ایسے الفاظ قرآن میں موجود ہیں جن کی اصل عربی نہیں۔ ہم ذیل میں ایسے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں۔

نمبر شمار	لفظ	معنی	حوالۂ قرآن	اصل	ضروری تفصیل/حوالہ
۱	احبار	حبر کی جمع یہودی مذہبی عالم	(مائدہ ۴۴)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۴
۲	اساطیر	اسطورہ کی جمع، قصہ کہانی	(انعام۔ ۲۵)	سریانی	استوریا، ہسٹری (تاریخ) ایک ہی ہیں
۳	برزخ	دو چیزوں کے درمیان کی چیز	(مومنون۔ ۱۰۰)	سریانی	دوزخ اور جنت کے درمیان کا مقام/ حالت۔
۴	برہان	دلیل، ثبوت	(نساء۔ ۱۷۴)	حبشی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۵
۵	تابوت	صندوق	(بقرہ۔ ۲۴۸)	عبرانی	
۶	تسبیح	پاکی بیان کرنا	(بنی اسرائیل ۔۴۴)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳ و شفاء الغلیل ص ۵۳
۷	توبہ		(آل عمران ۔۹۰)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳
۸	تین	انجیر	(تین۔ ۱)	سریانی	
۹	جُناح	گناہ، حرج	(بقرہ۔ ۲۰)	فارسی	لغات جدیدہ، ص ۲۵۰

۱۰	خنزیر	سور	(مائدہ۔ ۳)	سریانی	
۱۱	دراہم	درم، درہم، ایک سکہ	(یوسف۔ ۲۰)	یونانی	الفرائد الدریہ، ص ۶۔۹ و لغات جدیدہ، ص ۲۴۴ و شفاء الغلیل ص ۸۳۔
۱۲	زبانیہ	دوزخ کے پیادے (فرشتے)	(علق۔ ۱۸)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳
۱۳	زُبُر	کتابیں (زبور کی جمع)	(آل عمران ۔۱۸۴)	عبرانی	
۱۴	زمہریر	سخت سردی	(دہر۔ ۱۳)	سریانی	
۱۵	زیتون	ایک درخت اور اس کا پھل	(انعام۔ ۹۹)	سریانی	
۱۶	سَبت	ہفتہ، یہودیوں کا مقدس دن	(بقرہ۔ ۶۵)	عبرانی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۵
۱۷	سراب		(نور۔ ۳۹)	فارسی	
۱۸	سرابیل	سربال کی جمع، پاجامہ	(ابراہیم۔ ۵۰)	فارسی	اصل میں شلوار ہے، شفاء الغلیل ص ۱۰۵
۱۹	سراج	چراغ	(فرقان۔ ۶۱)	فارسی	لغات جدیدہ، ص ۲۵۳
۲۰	سکینہ	تسکین، طمانیت	(بقرہ۔ ۲۴۸)	عبرانی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۶
۲۱	صوامع	یہودیوں کی عبادت گاہ	(حج۔ ۴۰)	عبرانی	واحد اس کا صومعہ ہے
۲۲	طوفان		(اعراف۔ ۱۳۳)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳
۲۳	علیّین	نیکوں کا نامۂ اعمال	(مطففین۔ ۱۸)	عبرانی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۶
۲۴	فرات	میٹھا پانی	(فرقان۔ ۵۳)		

۲۵	فیل	ہاتھی	(فیل۔ ۱)	فارسی	الفرائدالدریہ، ص ۹۲ و لغات جدیدہ، ص ۲۵۵
۲۶	قِسِّیسِین	عیسائیوں کے مذہبی عالم، قِسیس کی جمع۔	(مائدہ۔ ۸۲)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۴
۲۷	قیامت	—	(آل عمران ۷۷)	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳
۲۸	کرسی		(بقرہ۔ ۲۵۵)	سریانی	
۲۹	مائدہ	دسترخوان	(مائدہ۔ ۱۱۲)	حبشی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۵
۳۰	نفاق			حبشی	لغات جدیدہ ص ۲۱۵

ان الفاظ کے علاوہ کچھ غیر عربی نام بھی قرآن میں مذکور ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر شمار	نام	اصل	تفصیل
۱	آدم	سریانی	
۲	آزر	آرامی	پدرِ حضرت ابراہیمؑ
۳	ابلیس	عبرانی	شیطان کا علم
۴	ادریس	عبرانی	
۵	اسحاق	عبرانی	
۶	اسرائیل	عبرانی	حضرت یعقوبؑ کا لقب
۷	الیاس	عبرانی	
۸	الیاسین	عبرانی	حضرت الیاس کے نام کی ایک صورت جو سورہ صافات کی آیت ۱۳۰ میں ہے
۹	الیسع	عبرانی	ایک نبی کا نام
۱۰	انجیل	یونانی	
۱۱	ایوب	عبرانی	

۱۲	بابل	آرامی	قدیم عراق کا ایک شہر
۱۳	تورات	عبرانی	
۱۴	جالوت	عبرانی	
۱۵	جبریل	عبرانی	
۱۶	جودی	سریانی	ایک پہاڑ جس پر کشتیٔ نوح ٹھہری
۱۷	داؤد	عبرانی	
۱۸	روم	یونانی	
۱۹	زبور	عبرانی	
۲۰	زکریا	عبرانی	
۲۱	سامری	عبرانی	
۲۲	سلیمان	عبرانی	
۲۳	طالوت	عبرانی	(شفاء الغلیل، ص ۱۲۸)
۲۴	طور	سریانی	لغات جدیدہ، ص ۲۲۳
۲۵	طویٰ	سریانی	شام کی ایک وادی کا نام ہے
۲۶	عمران	عبرانی	پدرِ حضرت مریم
۲۷	عیسیٰ	عبرانی	
۲۸	فرعون	عبرانی	
۲۹	قارون	عبرانی	
۳۰	لوط	آرامی	
۳۱	ماجوج	عبرانی	لغاتِ جدیدہ، ص ۲۱٦
۳۲	ماروت	عبرانی	شفاء الغلیل، ص ۱۸۳

۳۳	مجوس	فارسی	شفاء الغلیل، ص ۱۸۲، یہ اصل میں (منج گوش) بمعنی چھوٹے کانوں والا تھا۔
۳۴	مریم	عبرانی	
۳۵	مسیح	عبرانی	
۳۶	مصر	عبرانی	قرآن میں یہ لفظ شہر کے معنی میں آیا ہے، جو عربی ہے مگر ایک مشہور ملک کے نام کی حیثیت میں عجمہ ہے
۳۷	موسیٰ	عبرانی	
۳۸	میکال	عبرانی	فرشتہ موکل بر روزی رسانی خلق
۳۹	نوح	سریانی	
۴۰	ہاروت	عبرانی	
۴۱	ہارون	عبرانی	
۴۲	ہامان	عبرانی	فرعون مصر کا وزیر
۴۳	یاجوج	عبرانی	لغات جدیدہ، ص ۲۱۶، وشفاء الغلیل، ص ۲۱۵
۴۴	یثرب	عبرانی	
۴۵	یحییٰ	عبرانی	
۴۶	یعقوب	عبرانی	
۴۷	یوسف	عبرانی	
۴۸	یونس	عبرانی	
۴۹	یہود	عبرانی	

مختصر یہ کہ قرآن میں کل (۱۰۴) الفاظ عجمی الاصل ہیں اور (۴۹) ایسے غیر عربی اعلام ہیں جو قرآن میں آئے ہیں اور یوں ان سب کی مجموعی تعداد (۱۵۳) تک پہنچتی ہے۔

حواشی

[۱] القرآن سورہ یوسف، آیت ۲۔

[۲] القرآن سورہ رعد، آیت ۳۷۔

[۳] القرآن سورہ طہٰ، آیت ۱۱۳۔

[۴] القرآن سورہ زمر، آیت ۲۸۔

[۵] القرآن سورہ حٰم فصلت، آیت ۳۔

[۶] القرآن سورہ شوریٰ، آیت ۷۔

[۷] القرآن سورہ زخرف، آیت ۳۔

[۸] القرآن سورہ احقاف، آیت ۱۲۔

[۹] القرآن سورہ نحل، آیت ۱۰۳۔

[۱۰] القرآن سورہ شعرا، آیت ۱۹۵۔

[۱۱] تفسیر علامہ ابی السعود۔ مطبعہ قاہرہ مصر، ۱۲۸۹ھ، جلد ۶، ص ۵۵، (بر حاشیہ التفسیر الکبیر)

[۱۲] یاقوت حموی، معجم البلدان، مطبعہ سعادت مصر ۱۳۲۴ھ......، جلد ۶، ص ۱۴۰۔

[۱۳] تاریخ ابن خلدون (ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء، جلد اول، ص ۴۲۵۔

[۱۴] تاریخ طبری، مطبوعہ دار المعارف مصر ۱۹۶۱ء، جلد دوم، ص ۲۵۲۔ قرآن میں قریش کے انہیں تجارتی سفروں کو "رحلۃ الشتاء والصیف" یعنی سرما اور گرما کے سفروں سے تعبیر کیا گیا ہے (سورہ القریش)

[۱۵] سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۳ء، جلد اول، ص ۲۰۴، ۲۲۳، ولغات جدیدہ دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۷ء، ص ۱-۲۔

[۱۶] سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، جلد دوم، ص ۲۳، ولغات جدیدہ، ص ۲۔

[۱۷] سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، جلد اول، ص ۱۰۷، وجلد دوم، ص ۱۴۴، ومابعد۔

[۱۸] تاریخ طبری، جلد اول، ص ۶۰۹۔ ۶۲۸۔ جلد دوم، ص ۱۲۷۔ ۱۴۶۔ ومابعد، مزید مطالعہ کے لیے جرجی زیدان کی کتاب "العرب قبل الاسلام" مطبوعہ دار الہلال مصر، ۱۹۵۸ء اور ڈاکٹر جواد علی کی کتاب "العرب قبل الاسلام" القسم السیاسی مطبوعہ المجمع العلمی بغداد، ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۹] ابن عطیہ مغربی، مقدمۃ فی علوم القرآن، مکتبۃ الخانجی، مصر ۱۹۵۴ء، ص ۲۰۷، ۲۰۸ (مقدمہ کتاب المبانی)

[۲۰] مصطفیٰ صادق رافعی، اعجاز القرآن، مطبوعہ استقامۃ مصر ۱۳۷۵ھ، ص ۷۵۔

[۲۱] ابن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ سعیدیہ کبریٰ، مصر ۱۳۲۴ھ، ج اول، ص ۶۔۷

[۲۲] شہاب الدین خفاجی، شفاء الغلیل فی مافی کلام العرب من الدخیل۔ مطبوعہ سعادت، مصر ۱۳۲۵ھ، ص ۲۔

[۲۳] سیوطی۔ الاتقان، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی مصر ۱۳۷۰ھ، ج ۱، ص ۷۰۔

[۲۴] سیوطی الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۵۔۱۴۱۔

[۲۵] امام رازی۔ التفسیر الکبیر۔ مطبوعہ مطبعہ باہرہ مصر ۱۲۸۹ھ، ج ۱، ص ۲۲۶ تا ۲۲۸۔

[۲۶] شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر (ترجمۂ عربی) اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۰ھ، ص ۶۴۔

[۲۷] فیروز آبادی، القاموس المحیط، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی مصر ۱۳۷۱ھ، ج ۱، ص ۳۴۷۔

[۲۸] سیوطی الاتقان، ج ۱، ص ۱۴۰۔

[۲۹] مقدمۃ کتاب المبانی۔ مکتبہ خانجی، مصر ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۲۔

[۳۰] فیروز آبادی۔ القاموس المحیط۔ ج ۳، ص ۲۸۱۔

[۳۱] شہاب الدین خفاجی، شفاء الغلیل۔ ص ۱۴۲۔

[۳۲] فیروز آبادی القاموس المحیط، ج ۴، ص ۳۴۰۔

[۳۳] سید سلیمان ندوی۔ ارض القرآن۔ ج ۱، ص ۱۶۳ و ۱۶۴۔

[۳۴] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۲، ص ۶۷، ج ۴، ص ۵۴، ۳۰۲، ۳۰۳۔

[۳۵] فیروز آبادی۔ القاموس المحیط۔ ج ۴، ص ۴۔

[۳۶] صراح من الصحاح۔ مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۳۰۵ھ، ج ۱، ص ۳۷۶ و شہاب الدین خفاجی۔ شفاء الغلیل، ص ۱۶۹۔ خفاجی نے جوہری کا حوالہ غلط دیا ہے صحاح میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

[۳۷] ہدایۃ النحو۔ اصح المطابع، دہلی ۱۳۴۸ھ، ص ۹۷ و ۹۸۔

[۳۸] سید مرتضیٰ زبیدی۔ تاج العروس من جواہر القاموس۔ مطبوعہ مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ، ج ۲، ص ۳۴۵۔

[۳۹] فیروز آبادی، القاموس المحیط۔ ج ۴،ص ۷۷۔

[۴۰] ایضاً، ج ۲،ص ۱۸۔

[۴۱] ایضاً، ج ۴،ص ۴۱۔

[۴۲] زبیدی، تاج العروس۔ ج ۲،ص ۱۷۱و۳۷۲۔

[۴۳] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۴،ص ۲۸۱۔ (ھون) کے معنی وقار، انکساری اور طمانیت کے بھی ہیں۔

[۴۴] زبیدی، تاج العروس، ج ۳،ص ۳۲۱۔

[۴۵] زبیدی، تاج العروس، ج ۱،ص ۵۹۷۔

[۴۶] راغب الاصفہانی، مفردات القرآن، مطبع اصح المطابع، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۷ و لوئیس معلوف المنجد، کیتھولک پریس، بیروت، ۱۹۵۱ء، ص ۵۶۔

[۴۷] زبیدی، تاج العروس، ج ۱،ص ۵۳۲، وصراح، ج ۱،ص ۱۰۷۔

[۴۸] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۴،ص ۳۴۰۔

[۴۹] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۲،ص ۵۷و۷۶۔

[۵۰] قرآن مجید۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۰۔

[۵۱] امام رازی، بحوالہ شبلی نعمانی، علم الکلام۔ مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۲۔

[۵۲] القرآن، سورہ شعرا، آیت ۲۲۔

[۵۳] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۲،ص ۱۳۲و۱۳۳۔

[۵۴] لوئیس معلوف، المنجد، ص ۹۶۰، صراح، ج ۱،ص ۲۸۔

[۵۵] زبیدی، تاج العروس، ج ۳،ص ۶۰۱۔

[۵۶] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۱،ص ۱۵۔

[۵۷] زبیدی، تاج العروس، ج ۲،ص ۲۷۴۔

[۵۸] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۲،ص ۱۵و۱۶۔

[۵۹] مولانا تھانوی، بیان القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی، کراچی، ج ۳، ص ۱۳۰۔

[۶۰] طبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۶۶۰۔

[۶۱] زبیدی، تاج العروس، ج ۱، ص ۱۴۳۔

[۶۲] قرآن۔ سورہ فرقان، آیت ۳۸، وسورہ ق، آیت ۱۲۔

[۶۳] زبیدی، تاج العروس، ج ۴، ص ۱۶۱۔

[۶۴] سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، ج ۲، ص ۶۱ و ۶۲۔

[۶۵] زبیدی، تاج العروس، ج ۲، ص ۵۳۱۔

[۶۶] زبیدی، تاج العروس، ج ۳، ص ۲۷۲۔

[۶۷] لغات جدیدہ، ص ۲۴۸۔

[۶۸] سید سلیمان ندوی، لغات جدیدہ، ص ۲۲۴۔

[۶۹] ابن منظور، لسان العرب، مطبوعہ بولاق، مصر ۱۳۰۷ھ، ج ۵، ص ۱۶۲ و ۱۶۳۔

[۷۰] خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۰۳، وہاوا، الفرائد الدریہ، کیتھولک پریس، بیروت ۱۹۵۱ء، ص ۹۱۱۔

[۷۱] ابن منظور، لسان العرب، ج ۵، ص ۳۷۸۔

[۷۲] ندوی، لغات جدیدہ، ص ۲۲۱۔

[۷۳] ثعالبی، فقہ اللغۃ وسر العربیۃ، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی مصر ۱۳۱۷ھ، ص ۲۸۵ و ۲۸۶ وہاوا۔ الفرائد الدریہ، ص ۹۱۰۔

[۷۴] خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۰۵۔

[۷۵] خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۰۴ وابن منظور، لسان العرب، ج ۷، ص ۴۱۲۔

[۷۶] ندوی، لغات جدیدہ، ص ۲۲۱، وثعالبی، فقہ اللغۃ وسر العربیہ، ص ۲۸۵ و ۲۸۶۔

[۷۷] خفاجی۔ شفاء الغلیل، ص ۱۷۰۔

[۷۸] ندوی، لغات جدیدہ، ص ۲۲۱۔

[۷۹] ثعالبی، فقہ اللغۃ وسر العربیہ، ص ۲۸۶۔

[۸۰] صراح، ج۱، ص۲۵۳۔

[۸۱] خفاجی، شفاء الغلیل، ص۲۱۶ و ثعالبی، فقہ اللغۃ و سر العربیہ، ص۲۸۶۔

[۸۲] ابن منظور، لسان العرب، ج۴، ص۳۷۸ و ۳۷۹ و ہاوا، الفرائد الدریہ، ص۸۔۹، وندوی، لغات جدیدہ، ص۲۱۵۔

[۸۳] ابن منظور، لسان العرب، ج۱۵، ص۱۴۲۔

[۸۴] ابن منظور، لسان العرب، ج۹، ص۲۱۳۔

[۸۵] ثعالبی، فقہ اللغۃ، ص۲۸۵ و ۲۸۶ وندوی، لغات جدیدہ، ص۲۵۵، وخفاجی، شفاء الغلیل، ص۱۴۸۔

[۸۶] صراح، ج۱، ص۵۲۵۔

[۸۷] خفاجی، شفاء الغلیل، ص۱۵۶۔

[۸۸] ثعالبی، فقہ اللغۃ، ص۲۸۷، و المنجد، ص ۱۹ و ۲۶۸ و غیاث اللغات، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۸۵ء، ص۲۳۹۔

[۸۹] ندوی، لغات جدیدہ، ص۲۴۲ وخفاجی، شفاء الغلیل، ص۱۵۹۔

[۹۰] ندوی، لغات جدیدہ، ص۲۱۵۔

[۹۱] زبیدی، تاج العروس، ج۲، ص۵۲۔

[۹۲] خفاجی، شفاء الغلیل، ص۵۷۔

[۹۳] مولانا تھانوی، بیان القرآن، ج۱، ص۳۴۔

[۹۴] خفاجی، شفاء الغلیل، ص۹۴۔

[۹۵] المنجد، ص۳۴۷۔

[۹۶] المنجد، ص۳۴۲۔

[۹۷] سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، ج۱، ص۱۸۶۔

[۹۸] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج۴، ص۱۷۰۔

[۹۹] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۴، ص ۲۹۵۔

[۱۰۰] صراح، ج ۱، ص ۲۸۱۔

[۱۰۱] صراح، ج ۱، ص ۵۲۔

[۱۰۲] ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۴۴۔

[۱۰۳] جن بارہ (۱۲) آدمیوں نے ابتدا میں حضرت عیسیٰ کی متابعت کی ان میں سے دو دھوبی تھے۔ نبطی میں دھوبی کو حواری کہتے ہیں اس لیے ان تمام اصحاب مسیح کو حواری کا نام دیا گیا (تفسیر موضح القرآن، شاہ عبدالقادر دہلوی بحوالہ لغات القرآن، عبدالرشید نعمانی، ج ۲، ص ۲۹۵ و ۲۹۶، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۹ء۔

[۱۰۴] المنجد، ص ۳۴۷۔

[۱۰۵] لغات جدیدہ، ص ۲۲۳۔

[۱۰۶] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۳، ص ۷۔

[۱۰۷] صراح، ج ۱، ص ۱۶۰۔

[۱۰۸] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۴، ص ۲۴۰۔

[۱۰۹] سید سلیمان ندوی، لغات جدیدہ، ص ۲۲۳۔

[۱۱۰] لغات جدیدہ، ص ۲۲۳۔

[۱۱۱] صراح، ج ۲، ص ۲۱۵۔

[۱۱۲] معلم بطرس بستانی، قطر المحیط، مطبوعہ بیروت ۱۸۶۹ء، ج ۹، ص ۱۰۶۷۔

[۱۱۳] لغات جدیدہ، ص ۲۱۵۔

[۱۱۴] خفاجی، شفاء الغلیل، ص ۱۰۵۔

(ماہ نامہ ''چراغ راہ''، کراچی، ۱۹۶۸ء)

OOO

لفظ مولیٰ کی لغوی و اصطلاحی تشریح

عربی زبان میں لفظ ''مولیٰ'' متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ہم ذیل میں اس کی کسی قدر تفصیل بیان کرتے ہیں۔

ا۔لغوی معنی

مولیٰ کا مادہ ''وَلِ یَ'' ہے جس کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔عربی محاورہ ہے''تباعد بعد ولیٍ ''یعنی وہ نزدیکی کے بعد دور ہو گیا۔[۱]

''وَلاء'' (بواوِمفتوح) ملک اور محبت کو کہتے ہیں۔''وِلاء'' (بواوِ مکسور) اس میراث کو کہتے ہیں جس کا انسان کسی ایسے شخص کی آزادی سے جو اس کی ملکیت میں تھا یا جس نے اس کے ساتھ''موالاۃ'' کا عہدو پیمان باندھا تھا، مستحق ہوا ہو۔[۲]

''وَلاء'' (بفتح داد) بمعنی ملک ''مولیٰ'' کا اسم ہے اور مولی مالک کو کہتے ہیں۔[۳]

ان مختلف مشتقات کے مصادر مختلف ہیں۔''وَلایۃ'' (بفتح واوَ) نسب، نصرت اور عتق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''وِلایۃ'' (بکسر واد) امارت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔''وَلاء'' آزاد کردہ شخص کے لیے اور''مَــــوالاہ'' والی اور دوست کے لیے مستعمل ہیں''۔[۴]

لفظ''وِلاء'' اور''توالی'' کا مفہوم حقیقی یہ ہے کہ جن دو چیزوں میں اس کا وقوع ہو، ان میں کسی قسم کا فرق باقی نہ رہے اور دونوں میں سے کسی میں وہ بات نہ پائی جائے جو

دوسرے میں موجود نہ ہو۔ اس معنی حقیقی کی مناسبت سے اس سے بطور استعارہ قرب کا مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ یہ قرب مختلف النوع ہوتا ہے مثلاً باعتبار مقام، نسبت، دین، دوستی، نصرت اور اعتقاد۔ اور یوں اگر دو یا دو سے زائد افراد کے باہم اتحاد مقامی، نسبی، دینی وغیرہ ہوں تو ہم انہیں ایک دوسرے کا مولیٰ، ولی اور متولی کہیں گے۔ ''وَلایة'' (بواوِ مفتوح) کے معنی کسی کو کسی کام کا متولی بنانا اور اُسے اس پر مامور کرنا ہے اور یوں اعراب کے فرق سے اس لفظ کے مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ مگر بعض اہل لغت کی یہ رائے ہے کہ ''ولایة'' (بکسر واوٗ) اور ''ولایة'' (بفتح واوٗ) معنی کے اعتبار سے مختلف نہیں ہیں، جیسے ''وَلایة'' (بفتح دال) اور ''وِلایة'' (بکسر دال) میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مفہوم میں ''ولی'' اور ''مولیٰ'' دونوں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں باہم دگر کوئی فرق نہیں ہے۔ معنی فاعلی میں ''موالی'' اور معنی مفعولی میں ''موالیٰ'' کہا جاتا ہے۔[۵]

اسی طرح اگر کوئی شخص مولیٰ نہ ہو مگر اپنے کو مولیٰ ظاہر کرے تو اس کے لیے ''مولویة'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں۔ ''ھو یتمولیٰ علینا'' یعنی وہ اگرچہ مولیٰ نہیں ہے مگر اپنے کو مولیٰ ظاہر کرتا ہے۔ اس کا اسم ''وَلاء'' ہے۔[٦]

۲۔ استعمال

لفظ مولیٰ مختلف صورتوں میں یعنی کبھی واحد، کبھی جمع، کبھی کسی اضافت کے بغیر اور کبھی اضافت کے ساتھ عربی زبان میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ اکیس (۲۱) بار آیا ہے اور مختلف معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث نبوی ﷺ میں الفاظ مولیٰ، موالی، ولاء، ولی اور تولی بار بار مذکور ہیں۔ کتب صحاحِ ستہ کے علاوہ دیگر مسانید اور کتب سنن میں بھی ان کے مشتقات متعدد احادیث واحکام کے ضمن میں آتے ہیں۔ لفظ مولیٰ ایک ایسا اسم ہے جو جماعت کثیرہ، معانی مختلفہ اور مفاہیم متعددہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ان معانی میں سے اکثر احادیث میں مراد لیے گئے ہیں اور اقتضائے بیان وسیاق وسباق کے لحاظ سے جو مفہوم متبادر ہوتا ہے وہی مرعی وملحوظ رکھا جاتا ہے [۷]۔ ہم

ذیل میں ان مفاہیم کی کسی قدر وضاحت کریں گے۔

۱۔ ناصرو معین (مددگار) :

لفظ مولیٰ، مدد کرنے والے، اعانت کرنے والے اور حامی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الانفال ۴۰)[۸]

اور اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ تمہارا ناصر ہے۔ وہ اچھا معین و مددگار ہے۔

۲۔ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (الحج ،۱۳)[۹]

وہ شخص ایسے (معبود) کی عبادت کر رہا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب الوقوع ہے۔ وہ (معبودِ باطل) برا حامی و مددگار ہے اور وہ (شخص) اس کا برا ساتھی ہے۔

۳۔ هُوَ مَوْلٰكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج ،۷۸)[۱۰]

وہ (اللہ) تمہارا مددگار ہے۔ وہ اچھا ناصرو معین ہے۔

۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (محمد ،۱۱)[۱۱]

یہ اس لیے ہے کہ اللہ مسلمانوں کا ناصرو معین ہے اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

۵۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ (آل عمران ،۱۵۰)[۱۲]

بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (التحریم ،۴)[۱۳]

رسول (ﷺ) کے مددگار ورفیق اللہ، جبریل اور نیک مسلمان ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"قریش والانصار وجهینة و مزینة و اسلم و غفار و اشجع [۱۴] موالی لیس لهم مولیٰ دون اللہ و رسوله" [۱۵]

یعنی قبائل قریش، انصار، جہینہ، مزینہ، اسلم، غفار اور اشجع اللہ اور اس کے رسولؐ کے معین و مددگار ہیں۔

۲۔ سید، مالک، متولی اور ولی :

قرآن مجید میں ہے:

۱۔ وَ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (التحریم ۲)[۱۶]

اور اللہ تمہارا مالک ہے۔ اور وہ بڑا دانا و حکمت والا ہے۔

۲۔ وَاعْفُ عَنَّا وقفه وَاغْفِرْ لَنَا وقفه وَارْحَمْنَا وقفه اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۲۸۶)[۱۷]

اور اے اللہ ہم کو معاف کر دے، ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم کر، تو ہمارا مالک ہے۔ ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔

۳۔ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (الانعام ۶۲)[۱۸]

پھر سب اللہ کے پاس جو ان کا مالک حقیقی ہے لائے جائیں گے۔

۴۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (التوبہ ۵۱)[۱۹]

(اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کہ ہم پر صرف وہی مصیبت آئے گی جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کر دی ہے۔ وہ ہمارا مالک ہے اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

حدیث میں آیا ہے: ایما عبد تزوج بغیر اذن موالیه فهو عاهر۔

جس غلام نے اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو وہ گناہ گار (زانی) ہوا۔

یہی حدیث ان الفاظ سے بھی روایت کی گئی ہے ''ایما عبدٍ نکح بغیرِ اذنِ مولاہ فنکاحہ باطلٌ'' [۲۰]

۳۔ رب:

قرآن میں ہے۔

ا۔ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (یونس ۳۰)[۲۱]

اس مقام پر ہر شخص اپنے اعمال کا حساب دے گا اور یہ لوگ اللہ کی جانب جو ان کا رب ہے لوٹا دیئے جائیں گے اور انہوں نے جو باطل معبود بنائے تھے وہ اُن سے غائب ہو جائیں گے (یعنی اُن کی کچھ مدد نہ کرسکیں گے)۔

۴۔ برادران عم زاد، برادر زادگان اور دوسرے عصبہ (قرابت دار):

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ا۔ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا (مریم ۵)[۲۲]

(حضرت زکریا نے اللہ سے دعاء کی) مجھے اپنے رشتہ داروں سے اپنے بعد اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے اس لیے تو مجھے ایک وارث عطاء کر۔

۲۔ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (الدخان ۴۱)[۲۳]

جس دن کوئی قرابت دار کسی قرابت دار کے کام نہ آئے گا اور نہ ان کی حمایت کی جائے گی۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے:[۲۴]

رأیتُ الموالی الاُلیٰ یخذلو ننی   علی حدثانِ الدھرِ اذ یتقلّب [۲۵]

میں نے اپنے برادران عم زاد کو دیکھا کہ وہ مجھے گردش زمانہ میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔

عہد اموی کا ایک شاعر فضل بن عباس [۲۶] بنو امیہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: [۲۷]

مھلا بنی عمنا مھلا موالینا لا تنبشوا بیننا ما کان مدفونا

مھلا بنی عمنا من نحتِ اثلتنا سیر وا رویدا کما کنتم تسیرونا

اے ہمارے برادرانِ عم زاد نرمی اختیار کرو اور گڑی ہوئی عداوتوں کو نہ اکھاڑو۔

اے ہمارے عم زاد بھائیو ہماری بے عزتی نہ کرو اور وہی چال چلو جو تم پہلے چلتے تھے۔

۵۔ وارث:

قرآن میں ہے۔ ولکل جعلنا موالیَ مما ترکَ الوالدانِ والا قربونَ ط والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم ط [۲۸] (النساء ۳۳)

اور ہر ایسے مال کے لیے جسے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں اور جن سے تم نے عہد و پیمان باندھے ہیں انھیں ان کا حصہ دے دو۔

حدیث میں ہے:۔ ومَن اسلَم علی یدہ رجلٌ فھو مولاہ" (ای یرثُہ کما یرث مَن اعتقَہ) [۲۹] جس مسلمان کے ہاتھ پر کوئی شخص اسلام لایا تو وہ (مسلمان) اس (نومسلم) کا مولیٰ و وارث ہو گیا۔

۶۔ اولیٰ ومناسب (اولیٰ بکم):

قرآن میں ہے:۔ ماوٰکم النار ط ھی مولاکم ط وبئس المصیر (الحدید ۱۵) [۳۰]

تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہی تمہارے لیے مناسب ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

مشہور مخضرمی (جاہلی و اسلامی) شاعر لبید بن ربیعہ عامری [۳۱] کہتے ہیں۔

ففرت کلا الفرجین تحسب انہ مولیٰ المخافۃ خلفھا و اما مھا [۳۲]

(''مولیٰ'' سے مراد ''اولیٰ'' ہے۔ ''مخافۃ مقامِ خوف کو کہتے ہیں۔ ''مولی المخافہ'' کے معنی ہیں سب سے اہم مقامِ خوف [۳۳] شعر کے معنی یہ ہیں کہ وہ وحشی گائے یہ سمجھ کر کہ عقب اور سامنے کے دونوں ہی راستے خوف اور ڈر کے لیے مناسب ہیں (یعنی ان سے بہت ڈرنا

چاہئے)، صبح صبح وہاں سے چل دی)

۷۔ منعم (احسان کرنے والا) ومعتق (آزاد کرنے والا) (بصورت فاعلی):

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:۔ومن تولی قوما بغیر اذن موالیه فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین" [۳۴]

جس شخص نے اپنے آزاد کرنے والے اور محسنوں کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں سے موالات اور عہد و پیمان کرلیا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔

۸۔ منعم علیه (جس پر احسان کیا گیا ہو) و معتق (آزاد کردہ) (بصورت مفعولی)

حدیث میں ہے:۔ مولٰی القوم من انفسهم [۳۵] (قوم کا آزاد کردہ شخص انہی میں سے ہوتا ہے) یعنی اس کے حقوق وفرائض اس کے آزاد کرنے والوں کے مانند ہوتے ہیں چوں کہ مولیٰ کے معنی آزاد کنندہ اور آزاد کردہ دونوں ہی ہیں اس لیے اربابِ لغت و حدیث نے فرق کی غرض سے آزادہ کنندہ کو "المولٰی الاعلٰی، و مولٰی من فوق" اور آزاد کردہ کو "المولٰی الاسفل و مولٰی من تحت" کہا ہے۔[۳۶]

۹۔ عبد (غلام) وتابع [۳۷]:

حصین بن حمام مرّی [۳۸] کہتا ہے:

موالی موالینا لیسبوا نسائنا لعمری لقد جئتم بسنة اشأ ما

ہمارے موالی کے غلام بھی ان کے ساتھ جنگ کی غرض سے آئے ہیں تا کہ ہماری عورتوں کو گرفتار کر کے لے جائیں میری زندگی کی قسم یہ بڑی منحوس بات ہے۔

۱۰۔ حلیف:

حدیث میں وارد ہے:"من 'والی' قوما بغیر اذن موالیه فعلیه لعنة الله والملائکة و الناس اجمعین"[۳۹]

جس شخص نے اپنے موالی کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں سے "عہد و پیمان باندھ لیا" تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

ایک عربی شاعر، جس کے حلیف کو اس کے برادرِ عم زاد نے مارا پیٹا تھا، کہتا ہے:[۴۰]

سآخذ منکم الَ حزنِ لحو شبٍ و ان کانَ مولیً لی و کنتم بنو ابی

اے بنی حزن! میں تم سے عنقریب حوشب کا انتقام لوں گا۔ اگر چہ وہ میرا حلیف ہے اور تم میرے برادرانِ عم زاد ہو۔[۴۱]

۱۱۔ محبّ، دوست اور قریب:

قرآن میں ہے:۔ ادعوھم لا بآءِ ھم ھو اقسطُ عندالله فان لم تعلموا آبآء ھم فاخوانکم فی الدین وموالیکم ط (احزاب:۵)[۴۲]

تم انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کیا کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے، اور اگر تم ان کے باپوں کے نام سے واقف نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں۔

ایک شاعر کہتا ہے:

وَمولیً جفت عنه الموالی کأ نُهُ من البوسِ مطلیٌّ به القار اجرب

(اور کتنے ایسے قریب و دوست ہیں جنہیں ان کے اقربا اور دوستوں نے چھوڑ دیا اور وہ لوگ ان سے یوں کتراتے ہیں جیسے خارش زدہ اونٹ سے، جس پر القطرہ اور تیل مل دیا گیا ہو۔

۱۲۔ پڑوسی: مولی، پڑوسی اور ہمسایہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[۴۳]

۱۳۔ صاحب (والا) مثلاً 'مولی سوئتہ' برائی والا۔[۴۴]

ایک عربی شاعر کہتا ہے:

ولست بمولی سوئتهِ اُوعیٰ بها فان لسوآت اِلامور موالیا[۴۵]

میں برائی والا نہیں ہوں کہ اس کی جانب منسوب کیا جاؤں، کیوں کہ برے کاموں کے کرنے والے دوسرے لوگ ہیں۔[۴۶]

۱۴۔ صہر: (رشتۂ ازدواج کے سبب سے قرابت دار بن جانے والے۔ خسر، داماد و سالے وغیرہ)[۴۷]

۳۔اقسام

عربی زبان میں مختلف استعمالات کی بناء پر اہل لغت نے مولیٰ کی متعدد قسمیں کی ہیں۔مشہور لغوی ابوعبیدہ [۴۸] سے روایت ہے کہ مولیٰ کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔عصبات وورثہ (چچازاد بھائی، چچا، بھائی، بیٹا وغیرہ)

۲۔ناصر، معین ومددگار

۳۔ولی اور متولی امور۔عرب کہتے ہیں رجلٌ ولاء اور قومٌ ولاء یعنی رجلٌ ولیٌ اور قومٌ اولیاء کیونکہ لغت میں لفظ ''ولاء'' مصدر ہے اور مصدر تثنیہ وجمع نہیں ہوتا۔

۴۔مولی الموالات: اور یہ ایسا شخص ہوتا ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے اور اس سے ''موالات'' کرلے۔

۵۔مولی نعمت: اور یہ آزاد کرنے والا آدمی ہے جس نے اپنے غلام کو آزاد کر کے اس پر انعام واحسان کیا۔

۶۔مولیٰ: وہ شخص ہے جسے آزاد کردیا جائے، کیونکہ وہ برادرِعم زاد کی طرح ہوتا ہے اور اس کی حمایت آزاد کرنے والے پر واجب ہوجاتی ہے۔اور اگر ایسا شخص مرجائے اور کوئی وارث نہ چھوڑے تو یہ آزاد کرنے والا شخص اس کا وارث بھی ہوتا ہے۔[۴۹]

دوسرے عالم لغت ابن سلام [۵۰] نے مولیٰ کی مندرجہ ذیل اقسام کی نشاندہی کی ہے:

۱۔مولیٰ فی الدین: اللہ فرماتا ہے ''ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ'' (سورۂ محمد:۱۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''مزینة وجهینة و اسلم و غفار موالی الله و رسوله''۔[۵۱]

۲۔مولی الحلف: حلیف یعنی جس کی عزت تمہاری عزت ہے اور جس کی قوت کا انحصار تمہاری حمایت پر ہے۔

۳۔آزاد کردہ غلام: اسے اس لیے مولیٰ کہا جاتا ہے کہ اس کا انتساب آزاد

کرنے والے کے نسب کے ساتھ ہوتا ہے۔[۵۲]

خلاصہ بحث:

مولیٰ سے متعلق ان تمام معانی واستعمالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سہولت بحث کے لیے اس کی مندرجہ ذیل قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ مولی القرابتہ والولادۃ: رشتہ دار نسبی یا نسبتی مثلاً بھائی، چچا، چچا زاد بھائی، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور سالا وغیرہ۔

۲۔ مولی الحلف والیمین: معاہدہ اور عہد و پیمان کے ذریعہ موالات قائم کرنے والے اشخاص وقبائل حصین بن حمام مری کہتا ہے:

فقلتُ لهم یا آلُ ذبیانُ مالکم تفاقدتم لا تقدمونُ مقدُما
موالیکم، مولی الولادۃِ منهم ومولی الیمینِ حابسٌ قد تقسّما [۵۳]

میں نے ان سے کہا کہ اے بنو ذبیان تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم جنگ میں اپنے شایانِ شان پیش قدمی نہیں کرتے۔ تمہارے موالی، جن میں موالی ولادت (رشتہ دار) اور موالی یمین (حلفاء) سبھی شامل ہیں، رکے ہوئے ہیں اور منتشر ہو گئے ہیں۔

مشہور جاہلی شاعر نابغہ جعدی[۵۴] کہتا ہے:

موالیُ حلفِ لا موالی قرابۃِ ولکنْ قطیناً یساء لون الا تاویا [۵۵]

وہ حلیف ہیں رشتہ دار نہیں ہیں لیکن گھر والے ان سے متعلق عجیب وغریب سوالات کر رہے ہیں۔

۳۔ مولی فی الدین: دینی یگانگی کی وجہ سے جو موالات اور دوستی قائم ہو جائے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْآ اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُم'' (احزاب:۵)

پس اگر تم ان کے باپوں سے واقف نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور مولی (دینی دوست) ہیں۔

۴۔مولیٰ نعمت: آ قا، غلام، غلام کو آزاد کرنے والا اور آزاد شدہ غلام۔ آقا کو جو اپنے غلام کو آزاد کردے ''المولیٰ الاعلیٰ'' اور ''مولیٰ من فوق'' کہتے ہیں جبکہ غلام کو آزادی کے بعد ''المولی الاسفل'' اور ''مولیٰ من تحت'' کہتے ہیں۔

ا۔حدیث میں ہے: ایما عبدٍ نکح بغیر اذنِ مولاہ فنکاحہٗ باطلٌ۔
جس غلام نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔

۲۔حصین بن حمام مری کہتا ہے:

لعمری لقد جئتم بسنة اشأ ما   موالی موالینا یسبوا ا نسائنا

ہمارے دشمنوں کے ساتھ ان کے غلام بھی ہم سے جنگ کرنے اور ہماری عورتوں کو گرفتار کرنے آئے۔ خدا کی قسم یہ بڑی بری بات ہے۔

۳۔حدیث ہے: من تولی قوما بغیر اذن موالیہ فعلیہ لعنة الله والملائکة والناس اجمعین۔ جس نے اپنے آزاد کرنے والوں کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں سے عقد موالات باندھا اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔

۴۔ایک دوسری حدیث ہے: ''مولی القوم من انفسھم'' قوم کا آزاد کردہ غلام انہی میں سے ہوتا ہے۔

۵۔مولی الموالات: ایسا شخص جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اس کا مولیٰ ہو جائے۔ حدیث میں ہے: ''قال تمیم الداری، ساء لت رسول الله ﷺ السنة فی رجل من اھل الشرکِ اسلم علی ید رجلٍ من المسلمین. فقال ﷺ ھوا ولی الناس بمحیاہ ومماتہ''۔[۵۶] تمیم داری روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس مشرک شخص کے بارے میں مسنون طریقہ دریافت کیا جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلے (یعنی اس مسلمان کرنے والے اور مسلمان ہونے والے کے مابین کس قسم کا تعلق رکھنا سنت ہے)۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ (مسلمان کرنے والا) اس (مسلمان ہونے والے) کی موت و حیات میں تمام لوگوں سے

زیادہ مرجح اور حق دار ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے: **من اسلم علی یدہ رجل فھو مولاہ۔** جس (مسلمان) کے ہاتھ پر کوئی (غیر مسلم) اسلام قبول کرتا ہے تو وہ (مسلمان) اس (نو مسلم) کا مولی ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ''مولی النعمۃ'' اور ''مولی الموالاۃ'' عرب جاہلیت میں حمایت اور امداد حاصل کرنے کی غرض سے بنائے جاتے تھے۔ اسلام نے ان دونوں طریقوں کو باقی رکھا۔ ارشاد نبویؐ ہے:

واِنَّ مولیٰ القوم منھم و حلیفھم منھم۔

یہاں ''مولیٰ'' سے ''مولی النعمۃ'' (مولی العتاقۃ، آزاد کردہ شخص) اور ''حلیف'' سے ''مولیٰ الموالاۃ'' مراد ہیں، کیونکہ یہ عربوں کا قاعدہ تھا کہ وہ ''موالات'' کو حلف یعنی قسم سے پختہ کرتے تھے۔ [۵۷]

حواشی

[۱] اسماعیل بن حماد جوہری متوفی ۳۹۸ھ۔ تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ۔ دارالکتاب العربی، مصر۔ جلد ششم۔ صفحہ ۲۵۲۸۔

[۲] محمد فرید وجدی۔ دائرۃ المعارف القرن الرابع عشر/ العشرین۔ مطبع دائرۃ المعارف القرن العشرین، مصر ۱۳۴۳ھ۔ جلد دہم۔ صفحہ ۸۱۱۔

[۳] سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ۔ تاج العروس من جواہر القاموس۔ مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ۔ جلد دہم، ص ۳۹۹۔

[۴] مجد الدین مبارک بن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر۔ مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۲۳ھ جلد چہارم۔ ص ۳۴۶۔

[۵] حسین بن محمد بن مفضل الملقب براغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ۔ المفردات فی غریب القرآن۔ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۰ھ۔ ص ۵۵۔

[٦] ابن منظور افریقی مصری متوفی ۷۱۱ھ۔ لسان العرب۔ مطبعہ میریہ، بولاق، مصر ۱۳۰۷ھ۔ جلد بیستم، ص ۲۹۲۔

[۷] ابن اثیر جزری۔ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر۔ جلد چہارم، ص ۳۴٦۔

[۸] ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر زمخشری خوارزمی متوفی ۵۳۸ھ۔ تفسیر الکشاف عن حقائق التنزیل۔ مطبعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۹۴۸ء۔ جلد دوم، ص ۱۵۔

[۹] ایضاً، ج ۲، ص ۳۴۳۔

[۱۰] ایضاً، ج ۲، ص ۳۵٦۔

[۱۱] ایضاً، ج ۳، ص ۱۲۹۔

[۱۲] ایضاً، ج ۱، ص ۳۵۴۔

[۱۳] ایضاً، ج ۳، ص ۲۴٦۔

[۱۴] قریش فہر بن مالک کا لقب ہے جو کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کی نسل سے تھا۔ انصار، اوس وخزرج کے قبائل کا اسلامی نام ہے، یہ قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے جو کہلان بن سبا کی شاخ اور قحطانی عرب تھے۔ جہینہ کا قبیلہ بنو قضاعہ کی شاخ تھا جس کا نسلی سلسلہ قحطان سے ملتا ہے۔ مزینہ کا تعلق عمرو بن طابخہ بن الیاس بن مضر سے تھا۔ اسلم افصیٰ بن عامر بن قمۂ بن الیاس بن مضر کی فرع تھا۔ قبیلۂ غفار خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن خضر کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اشجع قیس بن مضر کی شاخ تھا۔ (الملک المؤید عماد الدین اسماعیل ابو الفداء متوفی ۷۳۲ھ۔ المختصر فی اخبار البشر۔ مطبعہ حسینیہ۔ مصر، ۱۳۲۵ھ۔ ج ۱، ص ۱۰۷، وابن حزم اندلسی متوفی ۴۵٦ھ۔ جمہرۃ انساب العرب۔ دار المعارف، مصر ۱۳۸۲ھ۔ ص ۴۴۴، ۴۸۰، ۴٦۵، والمختصر فی اخبار البشر، ج ۱، ص ۱۰٦ (بالترتیب)

[۱۵] امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ۔ صحیح البخاری۔ مطبعہ ہاشمی، میرٹھ، ۱۳۲۸ھ۔ ج ۱،

ص ۹۸۔

[۱۶] زمخشری۔ تفسیر کشاف۔ ج ۳، ص ۲۴۵۔

[۱۷] ایضاً، ج ۱، ص ۳۰۸۔

[۱۸] ایضاً، ج ۱، ص ۵۰۹۔

[۱۹] ایضاً، ج ۱، ص ۴۳۔

[۲۰] ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ۔ سنن ابی داؤد۔ مطبعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۸۱ھ۔ ج ۱، ص ۴۸۰۔

[۲۱] زمخشری۔ تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۴۷۔

[۲۲] ایضاً، ج ۲، ص ۲۷۳۔

[۲۳] ایضاً، ج ۲، ص ۱۱۰۔

[۲۴] تبریزی کی روایت ہے کہ یہ شعر مرہ بن عدا فقعسی کا ہے جس کا تعلق بنو فقعس بن طریف سے ہے جو قبیلہ بنی اسد کی ایک شاخ ہے۔ (ابوزکریا یحییٰ بن علی تبریزی متوفی ۵۰۲ھ۔ شرح الحماسہ۔ برحاشیۂ دیوان الحماسہ۔ مطبعہ جمالیہ، مصر ۱۳۳۴ھ۔ ج ۱، ص ۶۱۔)

[۲۵] ابوتمام حبیب بن اوس طائی متوفی ۲۳۲ھ۔ دیوان الحماسہ۔ مطبعہ جمالیہ، مصر ۱۳۳۴ھ۔ ج ۱، ص ۶۱۔

[۲۶] فضل بن عباس بن عتبہ بن ابی لہب۔ بنو ہاشم کا ممتاز شاعر تھا۔ وہ عہد اموی کے مشہور شعراء فرزوق، جریر اور عمر بن ابی ربیعہ کا معاصر تھا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دربار سے وابستہ اور اس کے متوسلین خاص میں تھا۔ سلیمان کے ہاں اس کی پذیرائی نہ ہوئی اور وہ عطا و کرم سے محروم رہا۔ (ابوعلی احمد بن محمد بن حسن مرزوقی متوفی ۴۲۱ھ۔ شرح دیوان الحماسہ۔ لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر، مصر ۱۹۵۱ء، ج ۱، ص ۲۲۴۔)

[۲۷] ابوتمام طائی۔ دیوان الحماسہ۔ ج ۱، ص ۶۶۔

[۲۸] زمخشری۔ تفسیر کشاف۔ ج ۱، ص ۳۹۴۔

[۲۹] ابن اثیر جزری۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر۔ ج ۴، ص ۲۴۶۔

[۳۰] زمخشری۔ تفسیر کشاف۔ ج۱،ص ۲۹۴۔

[۳۱] لبید کی کنیت ابوعقیل ہے۔ وہ بنو عامر بن صعصعہ سے تعلق رکھتے تھے جو ایک مشہور مضری قبیلہ ہے۔ عہد جاہلیت کے مشہور شعراء اور شہ سواروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بعثتِ نبویؐ کے بعد وہ اپنے قبیلے کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ جب عہد فاروقی میں کوفہ آباد ہوا تو لبید نے ہجرت کر کے کوفہ کی سکونت اختیار کی اور یہیں ۴۱ھ میں وفات پائی۔ لبید نے بڑی طویل عمر پائی۔ ان کے تمام اشعار دورِ جاہلیت کے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے کوئی شعر نہ کہا اور جب ان سے شعر گوئی کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اللہ نے مجھے شعر کے عوض قرآن عطاء فرمایا'' یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زمانۂ اسلام میں صرف ایک شعر کہا جو یہ ہے:

الحمد للہ اذلم یاتنی اجلی   حتی لبستُ مِنَ الاسلامِ سربالا

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ لبید کا وہ اسلامی عہد کا شعر مندرجہ ذیل ہے:

ما عاتبَ المرءَ اللبیبَ کنفسہٖ   وَالمرءَ یصلحہ الجلیسُ الصالح

المعلقات السبع جو سات بہترین عرب جاہلی قصائد پر مشتمل ہے، اس میں لبید کا قصیدہ چوتھا ہے۔

(محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار صادر بیروت، ۱۳۷۷ھ، ج ۶،ص ۳۳ و ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ۔ مطبعہ سعادۃ، مصر، ۱۳۲۸ھ۔ ج ۳ ص ۳۲۶)، لبید کا دیوان وی آنا (آسٹریا) میں ۱۸۸۰ء میں چھپا اور اس کا جرمن ترجمہ لیڈن سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا (جرجی زیدان متوفی ۱۹۱۶ء تاریخ آداب اللغتہ العربیہ۔ دار الہلال، مصر ۱۹۵۷ء، ج۱،ص ۱۲۱)

[۳۲] المعلقاۃ السبع۔ قصیدہ لبید عامری۔ مطبع قیومی، کانپور، ص ۴۷۔

[۳۳] ابن منظور افریقی۔ لسان العرب۔ ج ۲۰،ص ۲۹۱۔

[۳۴] امام بخاری۔ صحیح البخاری۔ ج ۱،ص ۲۵۲ (کتاب فضائل المدینہ، باب حرم المدینہ) امام بخاری نے یہ حدیث اس کے علاوہ دو اور مقامات پر روایت کی ہے (ج ۲،ص ۱۰۰۰۔ کتاب

الفرائض، باب من تبرء فی موالیہ اور ج ۲، ص ۱۰۸۴، کتاب الاعتصام بالسنۃ، باب الاقتداء بافعال النبیؐ)

[۳۵] امام بخاری۔ صحیح البخاری۔ ج ۲، ص ۱۰۰۰۔

[۳۶] ابوعیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ۔ جامع الترمذی۔ مطبعہ صاوی، مصر۔ ۱۳۵۲ھ۔ ج ۸، ص ۲۵۶ و ابن حزم اندلسی۔ جمہرۃ انساب العرب۔ ص ۱۴۲، و ۲۲۵۔

[۳۷] مجدالدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی شیرازی متوفی ۸۱۷ھ۔ القاموس المحیط، طبع مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۷۱ھ۔ ج ۴، ص ۰۴ ۔

[۳۸] حصین بن حمام بنوغطفان کی مشہور شاخ بنومرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے بالاتفاق عہد جاہلیہ کے کم گو شعراء میں سب سے عمدہ شاعر سمجھا گیا ہے۔ اس کا مشہور قصیدہ فخریہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

جزی اللہ افناء العشیرۃ کلھا بدارۃ موضوع عقوقا و ماثما

اس قصیدے کو مفضل ضبی نے ''مفضلیات'' میں جو عہد جاہلی کے شعرا کا قدیم ترین مجموعۂ اشعار ہے، نقل کیا ہے۔ شعر زیر حوالہ اسی قصیدے میں شامل ہے۔ اس نے زمانۂ اسلام پایا اور عہد رسالت میں وفات پائی۔ ابن ماکولا کا خیال ہے کہ حصین صحابی تھا۔ (تبریزی۔ شرح دیوان الحماسہ۔ ج ۱، ص ۵۴ و ابن حجر۔ الاصابہ۔ ج ۱، ص ۳۳۶)

[۳۹] امام بخاری۔ صحیح البخاری۔ ج ۲، ص ۱۰۸۴۔

[۴۰] ابوتمام طائی۔ دیوان الحماسہ۔ ج ۱، ص ۹۸ و ۹۹۔

[۴۱] مرزوقی۔ شرح الحماسہ۔ ج ۱، ص ۲۱۳۔

[۴۲] زمخشری۔ تفسیر کشاف۔ ج ۲، ص ۵۳۰۔

[۴۳] ابوتمام طائی۔ دیوان الحماسہ۔ ج ۲، ص ۲۴۔

[۴۴] ابن اثیر جزری۔ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر۔ ج ۴، ص ۳۴۶۔

[۴۵] ابوتمام طائی۔ دیوان الحماسہ۔ ج ۱، ص ۱۳۵۔

[۴۶] مرزوقی۔ شرح الحماسہ۔ ج ۱، ص ۴۱۵۔

[۴۷] ابن اثیر جزری۔ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر۔ ج ۴، ص ۳۴۶۔

[۴۸] ابوعبیدہ معمر بن مثنی یہودی النسل اور فارسی الوطن تھا۔ وہ قریش کی شاخ بنی تیم کا مولی تھا اور ۱۱۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸ھ تک بصرہ میں رہا۔ اس کے بعد ہارون کے وزیر فضل بن ربیع کی دعوت پر بغداد آیا اور یہیں ۲۰۹ھ میں وفات پائی۔ چونکہ وہ لوگوں کے نسب میں طعن کرتا تھا اس لیے اس کے جنازے میں کوئی شریک نہ ہوا۔ مذہبی اعتبار سے اس کا رجحان طبع خارجیوں کے فرقہ اباضیہ کی جانب تھا اور سیاسی لحاظ سے وہ شعوبی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے عربوں کی برائی میں متعدد کتابیں تحریر کیں۔ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا لغت، انساب اور اخبارِ عرب کا عالم تھا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے غریب حدیث میں کتاب تصنیف کی۔ اس کی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے جو تمام کی تمام ناپید ہیں۔ صرف ایک کتاب الخیل موجود ہے جو ۱۳۵۸ھ میں حیدر آباد سے دائرۃ المعارف کی زیرنگرانی شائع ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر اس کی ایک دوسری کتاب ''الدیباجہ'' کو ابن قتیبہ نے بغیر کسی حوالہ کے اپنی کتاب ''ادب الکاتب'' میں نقل کیا ہے۔ اس کے اقتباسات ''عیون الاخبار'' میں بھی موجود ہیں۔ جاحظ نے ''کتاب الحیوان'' میں بھی اس کے مباحث نقل کیے ہیں۔ اس کے تلامذہ میں یونس بن حبیب، ابوعمرو بن علاء اور ابوعبید قاسم بن سلام جیسے علماء شامل ہیں۔ مشہور عباسی شاعر ابونواس نے بھی اس کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ مبرد، جاحظ اور ابن قتیبہ نے اس کی شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں، یاقوت حموی نے ''ارشاد الاریب'' میں اور ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مشہور محدث دارقطنی نے اس کی روایت حدیث کو لینے کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''اس میں کوئی حرج نہیں الا یہ کہ وہ کسی قدر خوارج کی ہم خیالی سے متہم ہے''۔ (ابوعبیدہ۔ کتاب الخیل۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن، ۱۳۵۸ھ۔ حواشی از سالم کرنکوی، ص ۱۷۴۔ ۱۷۸)۔

[۴۹] ابن منظور افریقی۔ لسان العرب۔ ج ۲۰، ص ۲۸۹۔

[۵۰] محمد بن سلام مشہور صحابی قدامہ بن مظعون جمحی قرشی کے موالی میں تھا۔ اس کی ولادت اور

نشو ونما بصرہ میں ہوئی اس کا شمار اساطین لغت وادب عربی میں ہوتا ہے۔ اس کے تلامذہ میں اس عہد کے بہت سے اہل علم شامل ہیں جن میں نمایاں حیثیت مشہور لغوی ثعلب کو حاصل ہے۔ طبقات الشعراء اس کی اہم تصنیف ہے جو عرب کے شعرائے قدیم کے حالات میں قدیم ترین کتاب ہے۔ ابن سلام نے بغداد میں ۲۳۲۔۲۳۱ھ میں وفات پائی۔ (جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی متوفی ۶۴۶ھ۔ انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ۔ دارالکتب المصریہ، ۱۳۷۴ھ۔ ج ۳، ص ۱۴۳۔ ۱۴۵)۔

[۵۱] یہ حدیث لسان العرب جلد بستم صفحہ ۲۸۸ میں اتنی ہی نقل ہوئی ہے۔ پوری حدیث صحیح البخاری جلد اول صفحہ ۴۹۸ (مطبوعہ مطبعہ ہاشمی میرٹھ) میں یوں ہے: ''قریش والانصار وجهينة و مزينة واسلم و غفار و اشجع موالی ليس لهم مولی دون الله و رسوله''.

[۵۲] ابن منظور افریقی۔ لسان العرب۔ ج ۲۰، ص ۲۸۸۔

[۵۳] ابوتمام طائی۔ دیوان الحماسہ۔ ج ۱، ص ۱۲۶۔

[۵۴] نابغہ جعدی کا نام قیس بن عبداللہ یا باختلاف روایت حبان بن قیس بن عبداللہ ہے۔ مشہور مضری قبیلہ بنو قیس کی شاخ بنو جعدہ سے اس کا تعلق ہے۔ وہ عہد جاہلی کا مشہور شاعر ہے۔ اس نے عہد جاہلیہ میں معاد و وجود باری سے متعلق غور وفکر کیا، بتوں کی پرستش چھوڑ دی اور دیگر مشرکانہ رسوم سے اجتناب برتا۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لایا۔ اس نے قبول اسلام کے بعد شعر و شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بڑی لمبی عمر پائی اور ابن زبیرؓ کے عہد خلافت (۷۳۔ ۶۴ھ) میں وفات پائی۔ ابوزید قرشی نے جمہرۃ اشعار العرب میں اس کا قصیدہ بھی شامل کیا ہے۔ (ابن عبدالبر قرطبی متوفی ۴۶۳ھ۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔ بر حاشیہ الاصابہ لابن حجر عسقلانی۔ مطبعۃ سعادۃ، مصر ۱۳۲۸ھ۔ ج ۳، ص ۵۸۱ و ۵۸۲۔)

[۵۵] ابن منظور افریقی۔ لسان العرب۔ ج ۲۰، ص ۲۹۰۔

[۵۶] ترمذی۔ جامع الترمذی۔ مطبعہ علوم، دہلی ۱۲۶۵ھ، ص ۳۵۰۔ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد امام ترمذی نے یہ لکھا ہے کہ ہمیں یہ حدیث تمیم داری کے سوا کسی اور سلسلے سے نہیں ملی۔ ابن

اثیر جزری نے النہایہ جلد چہارم، ص ۲۴۶ میں اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد مندرجہ ذیل جملے تحریر کیے ہیں:

ذهبَ قومٌ الی العملِ بهٰذ الحدیثِ. و اشترطُ آخرونَ اَن یضیفُ الی الاسلامِ علی یدهِ المعاقدةَ و الموالاةَ. وذهبَ آخر الفقهاءِ الیٰ خلافِ ذٰلک وجعلوا هذ الحدیث بمعنی البرِو الصلةِو رعی الزمام. ومنهم من ضعّفَ الحدیث۔

کچھ لوگ اس حدیث پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں نے یہ شرط لگائی ہے کہ قبول اسلام کے ساتھ ساتھ عہد و پیمان اور موالات بھی ضروری ہے۔ دوسرے فقہاء کی رائے اس کے خلاف ہے، اور انہوں نے اس حدیث سے احسان، صلۂ رحم اور رعایت ذمہ کے معنی لیے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی فقہاء ہیں جنہوں نے اس حدیث کو ضعیف بتایا ہے۔

[۵۷] برہان الدین ابوالحسن المرغینانی متوفی ۵۹۳ھ۔ الہدایہ۔ مطبع حیدری، بمبئی ۱۲۷۹ھ۔ ج ۳، ص ۳۔

(المعارف، لاہور ۱۹۸۱ء)

ooo

عرب جاہلیہ میں ''موالی''

اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب کا نظام زندگی بدویانہ تھا اور ایسا ہونا عرب کے حالات کے عین مطابق تھا کیونکہ ایک ایسا ملک جو وسیع صحراؤں، بے آب و گیاہ میدانوں اور طویل کوہستانی سلسلوں پر مشتمل ہو، جہاں کوئی دریا نہ ہو جس کے گرد منظم بستیاں بسائی جائیں اور زراعت کی جا سکے، وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا ذریعہ معیشت گلہ بانی ہی ہوگا اور وہاں کے لوگ چارے اور پانی کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب نقل مکانی کرتے رہیں گے اور یوں عرب کی بنجر سرزمین جسے اللہ نے وادی غیر ذی زرع[۱] کے نام سے یاد کیا ہے، اس کی آبادی کا غالب حصہ انھیں بدوی قبائل پر مشتمل تھا[۲]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام سے قبل کا عرب بحیثیت مجموعی بدوی نظام حیات کا آئینہ دار نہ تھا۔ بلکہ جزیرہ نما کا جنوبی حصہ یمن اسلام سے ہزاروں سال پہلے بھی ایک منظم ضابطہ حیات کا پابند تھا اور وہاں تہذیب و حضارت کی جو شمعیں جلیں ان سے یونان و روم کے قصر ہائے علم و حکمت اور قلعہ ہائے حکومت جگمگا اٹھے تھے۔ یمن کے ان حکمرانوں نے وسیع سلطنتیں قائم کیں، جزیرہ نما کے باہر بحر احمر کے دوسرے ساحل پر حبشہ میں اپنی نو آبادی کی بنیاد رکھی اور اندرون ملک میں پہاڑوں کے مابین مآرب کے مقام پر بند باندھ کر یمن کے ایک معتد بہ علاقے کو زراعت کے قابل بنایا[۳] اور یوں ان کا شمار اس عہد کی متمدن اقوام میں ہوتا تھا[۴] مگر ان یمنی حکمرانوں اور ان کے نظام معاشرت و معیشت کا وسطی اور شمالی عرب پر کوئی اثر نہ پڑا، یہاں کے باشندے حسب سابق بدویانہ نظام حیات کے خوگر

اور ان کا معاشرہ قبائلی نوعیت ہی کا رہا۔اس کے علاوہ ظہور اسلام سے کم وبیش ایک صدی قبل یمن کی قومی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور پورے ملک میں کسی آزاد و منظم حکومت کا وجود نہ تھا۔اس زمانہ میں یمن کا علاقہ براہ راست ایرانیوں کے ماتحت رہا، سرحد عراق پر مناذرہ[۵] (آل لخم) کی حکومت جو بحرین پر بھی برائے نام تسلط کی دعوے دار تھی، ایرانیوں کی طفیلی ریاست تھی، اسی طرح شام کی سرحد پر غسانسہ[٦] (آل جفنہ) کی حکومت رومیوں کے زیر اثر قائم تھی، مگر ان ریاستوں کی اپنی حیثیتوں سے قطع نظر اندرون ملک میں ان کا کوئی سیاسی اثر نہ تھا اور یوں سرزمین عرب اسلام سے ایک صدی پہلے ایک ایسی سرزمین تھی جہاں کوئی منظم نظام سیاسی نہ تھا اور اسی طرح یہاں کوئی معاشی نظام بھی نہ تھا۔ اسی حقیقت کی جانب اللہ نے عرب کو''بھوک اور خوف کی سرزمین'' کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ [۷]

عرب کے وسط اور شمال میں شہروں کا وجود بھی تھا۔ چنانچہ حجاز میں مکہ، یثرب اور طائف کے شہر تھے، ان شہروں میں خصوصاً مکہ میں ایک منظم نظام کا پتا چلتا ہے مگر ان شہروں کے ان نظاموں کی بنیاد بھی وہی قبائلی نظام تھا۔اسی طرح یثرب میں یہود کی ایک جماعت آباد تھی جس کی ایک منظم معیشت تھی اور جس کا اپنا معاشرتی نظام بھی تھا۔مگر یہود کا یہ نظام بھی قبائل ہی کی اساس پر مبنی تھا چنانچہ مکہ کی شہری ریاست قبیلہ قریش کی ریاست تھی اور اس کے مختلف عہدے قبائل قریش کے درمیان منقسم تھے اور یہ مناصب ایک حیثیت سے ان بطون قریش میں موروثی تھے[۸] بعینہ یثرب کے عرب قبائل بھی خزرج اور اوس کے متعدد بطون پر مشتمل تھے اور ان کا نظام بھی قبائلی ہی تھا جو خزرج کے دس اور اوس کے دو بطون کے محور پر گردش کرتا تھا۔ یثرب کے یہود بنونضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کے قبائل میں منقسم اور خود ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہتے تھے[۹]۔یہی حال طائف میں آباد ثقیف کے قبیلے کا تھا[۱۰]۔حاصل کلام یہ ہے کہ نہ صرف بدوی نظام حیات قبائلی تھا بلکہ حضری اور منظم شہروں میں بسنے والے افراد بھی اسی نظام حیات کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔

عرب قبل از اسلام لامرکزیت کا شکار تھا۔ پورے ملک میں کوئی حکومت قائم نہ تھی جس کے سامنے قبائل جوابدہ ہوں۔ اس لئے انھیں من مانی کرنے کی یک گونہ کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں جبکہ ملک میں معاشی وسائل محدود اور بیشتر حصوں میں ان کا کم و بیش فقدان ہو، یہ سیاسی انتشار ایک کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ چنانچہ بدوی، جن کی معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا، چارہ اور پانی کی تلاش و دستیابی، کہ مویشیوں کی بقاء کا دارومدار انھیں پر ہوتا ہے، ان کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر قبضے کے لئے ان میں آئے دن جنگ کا بازار گرم رہتا تھا[۱۱] ان لڑائیوں میں غالب قبائل کو معاش کے نئے ذرائع ہی حاصل نہ ہوتے تھے، بلکہ مغلوب قبائل کے افراد قتل و قید کے باعث کم ہو کر ان کے معاشی دباؤ کو بھی کم کر دیتے تھے۔ یہ لوٹ مار صرف چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کی غرض سے نہ کی جاتی تھی، بلکہ تجارتی کاروانوں کو لوٹ کر ان کے سامان پر قبضہ کرنے کو بھی عرب کی معاشرت کا ایک کثیر الوقوع واقعہ خیال کیا جاتا تھا۔ قریش اور دیگر قبائل عرب نے کاروانہائے تجارت کی بسلامتی آمد و رفت کی غرض سے مختلف قبائل سے معاہدے بھی کئے تھے[۱۲] اور اس کے علاوہ بعض مہینوں میں قتل و غارت گری کو حرام قرار دے دیا گیا تھا مگر ان ''اشہر حرم'' کی بھی بعض اوقات بے حرمتی کرنے میں جذبہ جنگ مانع نہ آتا تھا[۱۳]۔ یہی وجہ تھی کہ عام تاجروں کے علاوہ بڑے بڑے سرداروں کے اسباب تجارت بھی بازاروں میں اسی وقت بحفاظت آ سکتے تھے جب ان کی بار برداری اور صیانت کی ضمانت قرب و جوار کے قبائل نے لی ہو[۱۴] تو ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد لاقانونیت جس کا مزاج لامرکزیت اور جس کی معیشت غنائم پر ہو اس میں ذاتی اور اجتماعی حفاظت کے لئے جو طرز رائج ہوگا وہ قبائلی ہوگا۔ یعنی عصبیت حکومت و مذہب کی عدم موجودگی میں شخصی اور عمومی صیانت کی بنیاد قبائل کی باہمی عصبیت ہی پر ہوگی۔ چنانچہ قبل از اسلام میں معاشرے کی ہیئت ترکیبی قبائلی نوعیت کی تھی۔ یہی عصبیت تھی جس کے باعث افراد اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ متصور کر سکتے تھے۔ عرب کی اس قبائلی

عصبیت کی اساس اتحاد نسب تھی۔ چنانچہ ایک باپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد ایک رشتۂ اتحاد میں پروئے ہوئے تھے۔ مرور زمانہ سے ان قبائل کی بھی شاخیں ہو چکی تھیں اور جیسا کہ قدیم مورخین ولغویین نے نشاندہی کی ہے، ان قبائل کے داخلی طبقات مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ شعب: بعید ترین نسبی تعلق مثلاً عدنانی قبائل کے لیے عدنان کا تعلق اور قحطانی قبائل کے لئے قحطان کا نام جس کے زمرے میں تمام عدنانی یا قحطانی قبائل باہم دگر ہم رشتہ ہو جاتے تھے۔

۲۔ قبیلہ: ایک شعب سے تعلق رکھنے والے مختلف نسلی گروہ الگ الگ ٹولیوں میں منقسم ہو جاتے تھے۔ ان میں ہر ٹولی کو ایک قبیلہ کہا جاتا تھا۔ مثلاً عدنان کی نسل سے تعلق رکھنے والے خاندان متعدد بڑے گروہوں میں منقسم ہوئے جن میں سے ایک کا نام مضر اور دوسرے کا ربیعہ ہے۔

۳۔ عمارۃ: ایک قبیلہ امتداد زمانہ سے مختلف نسلی سلسلوں میں بٹ جاتا تھا۔ ان میں سے ہر سلسلہ کو عمارہ کہا جاتا تھا۔ مثلاً مضر کا قبیلہ مختلف عمائر میں منقسم ہو گیا جن میں سے ایک قریش اور دوسرا بنو غفار تھا۔

۴۔ بطن: عمارہ کی نسلیں مختلف شاخوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ہر شاخ کو بطن کہتے تھے مثلاً قریش کی متعدد شاخوں میں سے ایک بنو عبد مناف اور دوسری بنو مخزوم تھی۔

۵۔ فخذ: بطن کے متعدد انساب الگ الگ فخذ کہلاتے تھے مثلاً بنو عبد مناف کے بطن کی نسلیں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے ناموں سے موسوم ہوئیں۔

۶۔ فصیلہ: فخذ کی نسلی تقسیم کو فصیلے کی اصطلاح سے ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً بنو ہاشم کی فخذ کی نسلوں میں آل ابی طالب اور آل عباس [۱۵]۔

قبائل کی داخلی تقسیم کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ فصیلہ بھی متعدد خاندانوں میں منقسم تھا اور ہر خاندان کو ایک الگ اُسرہ یا عائلہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مثال کے

طور پر آل ابی طالب کو لیجئے جو علمائے انساب کی اصطلاح میں ایک فصیلہ ہے، یہ خود متعدد اُسروں میں منقسم تھا، تاریخ میں ہمیں آل ابی طالب کے اُسروں یا عائلوں میں آل جعفر اور آل علی اور آل عقیل کے نام ملتے ہیں۔[۱۶]

ان طبقات قبائل کے مابین کامل اتحاد اور یک جہتی کا فقدان نظر آتا ہے، یہ تمام طبقات بھی باہم دگر دست بہ گریبان رہتے تھے۔ مگر دوسروں کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک عائلہ کے افراد دوسرے عائلے کے افراد کے مقابلے میں، ایک فصیلہ کے لوگ دوسرے فصیلے کے لوگوں کے مقابلے میں ایک فخذ سے تعلق رکھنے والے فصیلے دوسرے فخذ کے فصیلوں کے مقابلے میں ایک عمارہ کے بطون دوسرے عمارہ کے بطون کے مقابلے میں اور ایک قبیلے کے افراد دوسرے قبیلے کے مقابلے میں متحد ہو جاتے تھے۔ اسی طرح ایک شعب کے قبائل دوسری شعب کے قبائل کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے اور تمام عرب غیر عرب کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔ عربوں کا قول تھا کہ انا واخی علی ابن عمی و انا وابن عمی علی الغریب[۱۷]

جب عصبیت کا مدار قبائل پر ہو اور ملک میں ایک قسم کی لاقانونیت کا عمل دخل ہو تو ہر قبیلہ کی یہ کوشش ہوگی کہ اپنی قوت میں اضافہ کرے۔ یہ اضافۂ قوت کثرت تعداد ہی سے ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنی تعداد بڑھانے کی کوشش میں رہتا تھا اور کثرت تعداد انتہائی فخر کی بات خیال کی جاتی تھی۔ ایک جاہلی شاعر انیف بن حکیم نبہانی کہتا ہے ۔

ابی لھم ان یعرفوا الضیم انھم

بنو ناتق کانت کثیرا عیالھا [۱۸]

کثرت اولاد سرداری کے لوازمات میں محسوب ہوتی تھی اور اس مقصد کے حصول کی غرض سے تعدد ازدواج اور تسرّی کے ساتھ ساتھ نکاح کے مختلف طریقے رائج تھے[۱۹]۔ نکاح کا مقصد اغلباً تولید ہوتا تھا۔ اسی لئے عربوں میں ماں کا بڑا اونچا مقام تھا اور جب تک عورت اس مقام پر نہ پہنچتی تھی معاشرہ میں اسے امتیازی حیثیت نہ حاصل ہوتی

تھی مگر بیٹوں کی ماں بنتے ہی اس کے شرف و اعزاز میں اضافہ ہو جاتا تھا جس عورت کے متعدد بیٹے ہوتے تھے اسے بڑی عزت حاصل ہو جاتی تھی[۲۰]۔تولید کے علاوہ بھی کثرت تعداد کے حصول کے متعدد طریقے رائج تھے۔ہم ذیل میں ان کی کسی قدر تفصیل درج کرتے ہیں۔

۱۔ حلف بین القبائل والا جانب: مختلف قبائل آپس میں پیمان وفا باندھتے تھے اور یوں ایک دوسرے کے مدد معاون بن جاتے تھے۔اس پیمان بندی میں اس امر کی تخصیص نہ تھی کہ حلیف قبائل کا تعلق کسی مخصوص نسلی گروہ سے ہو مثلاً دونوں قبیلے عدنانی ہوں یا قحطانی یا دونوں کا تعلق مضر سے ہو یا ربیعہ سے۔قبائل کے مابین اس قسم کے معاہدوں کے علاوہ غیر عرب اقوام جو سرزمین عرب میں آ کر بس جاتی تھیں ان سے بھی عرب قبائل معاہدے کر لیتے تھے اور یوں ان کے درمیان ایک رشتہ مودت و اتحاد پیدا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ یثرب کے یہود اوس اور خزرج کے معاہد اور حلیف تھے۔اس عقد محالفت کی حیثیت اجتماعی تھی یعنی ایک قبیلہ یا افراد کا گروہ دوسرے قبیلے یا افراد کے گروہ کا حلیف و معاہد ہوتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طریقہ تھا کہ ایک فرد کسی دوسرے فرد کا یا پورے قبیلے کا حلیف بن جاتا تھا۔ایسے حلیف جو اپنی حفاظت و صیانت کی غرض سے کسی طاقتور قبیلے سے معاہدہ کر لیتے تھے عموماً یا تو خود اسی قبیلے کے اسیر ہوتے تھے اور آزادی کے بعد اس کے معاہد بن جاتے تھے یا پھر کسی دوسرے قبیلے کی گرفت میں ہوتے تھے اور معاہد قبیلے کا کوئی فرد انھیں آزاد کرا دیتا تھا۔ان لوگوں میں ایسے آزاد فرد بھی شامل ہوتے تھے جو کسی وجہ سے اپنے قبیلے سے الگ ہو کر کسی دوسرے قبیلے کی پناہ میں آ کر ان کے جوار یا پڑوس میں بس جاتے تھے مثلاً حضرت یاسر بن عامر جو یمن کے قبیلہ کہلان سے تعلق رکھتے تھے مکہ آ کر بنو مخزوم کے حلیف ہو گئے تھے اور وہ اور ان کی اولاد بنو مخزوم ہی کے افراد میں محسوب ہوتے تھے[۲۱]۔

۲۔ استلحاق: اس کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی شخص کو اپنے نسب میں داخل کر لیتا

تھا۔اس طور سے یہ نیا شخص اس کے خاندان کا فرد بن جاتا تھا۔ایسے شخص کو مُسْتَلْحَق اور دَعِی کہتے تھے۔اور جو شخص اسے اپنے خاندان میں شامل کرتا تھا اسے مُسْتَلْحِقْ کہا جاتا تھا۔مُستَلحَق اور دعی کبھی غلام، قیدی یا مولیٰ بھی ہوتا تھا۔اس صورت میں اسے مستلحِقْ کا مولیٰ کہتے تھے اور اسے اسی کی جانب منسوب بھی کرتے تھے۔عرب جاہلیہ میں ایسے ادعیاء کی کمی نہ تھی۔یہ ادعیاء اس بات کے بھی مجاز ہوتے تھے کہ دوسروں کو اپنا مستلحَقْ اور دعی بنالیں۔چنانچہ زیر نظر دور میں بنوخلج کا پتا چلتا ہے۔جو قریش کے ادعیاء تھے اور خود ان بنوخلج کا دعی ابن حصرمہ تھا۔یہ استلحاق انفرادی کے علاوہ اجتماعی بھی ہوتا تھا اور پورا قبیلہ بطن یا فخذ رشتہء استلحاق میں منسلک ہو جاتا تھا۔استلحاق عموماً اس صورت میں وجود میں آتا تھا کہ ایسا گروہ کسی قبیلہ میں آکر مقیم ہو جاتا تھا یا پھر اپنے دشمنوں کے خلاف ان سے استمداد کرتا تھا۔ایسے ادعیاء عموماً اپنے مُسْتَلْحِقْ کے خاندان کے افراد سمجھے جاتے تھے اور صریح کی طرح اپنے مستلحِق کی وفات کے بعد میراث کے حقدار ہوتے تھے۔[۲۲]

۳۔ مواخاہ: یہ بھائی چارہ کبھی افراد کے مابین اور کبھی قبائل کے درمیان ہوتا تھا۔ رشتۂ مواخاۃ استوار کرنے کا بھی یہی مقصد ہوتا تھا کہ کمزور افراد اور قبائل کو حامی اور محافظ مل جائیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حامی اور محافظ قبائل و افراد کی عددی قوت میں اضافہ ہو۔ یوں مواخاۃ بیک وِقت دو فائدوں پر مشتمل ہوتی تھی۔[۲۳]

۴۔ استرقاق: غلامی کی تاریخ انسانی تہذیب کی تاریخ کی طرح نہایت قدیم ہے۔ قدیم ترین انسانی گروہ کی تاریخ جو ہمارے سامنے آئی ہے اس میں غلامی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے۔حمورابی کے سنگی لوحِ آئین میں بھی غلام کا ذکر اور اس کی معاشرتی حیثیت سے متعلق واضح اشارے ملتے ہیں۔یونان کی شہری ریاستوں میں غلام کا وجود معاشرے کے ایک قائم بالذات طبقے کی حیثیت سے ملتا ہے۔اسی طرح رومیوں کے معاشرہ میں بھی غلاموں کی کثرت اور ان کی رنج و مشقت کی زندگی کی طویل داستانیں ہماری نظروں سے گزرتی ہیں۔ایران و ہند کے قدیم تہذیبی عناصر کے اجزائے ترکیبی میں بھی غلام کا وجود

شامل ہے۔ یہ غلام اجنبی اقوام سے جنگ، اغوا یا بردہ فروشی کے ذریعہ حاصل کئے جاتے تھے۔ خود اپنی قوم کے افراد کو بھی قرض کی نادہندگی یا کسی جرم کی پاداش میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کا رواج موجود تھا۔ فتوحات کی کثرت سے غلاموں کی کثرت بھی ہوئی اور جب فتوحات کے دھارے خشک پڑنے لگے تو بردہ فروشی نے غلاموں کی نئی کھیپوں کی فراہمی اپنے ذمہ لی۔ یہ غلام زراعت، تجارت وصنعت کے علاوہ گھریلو کاموں کی انجام دہی پر مقرر کئے جاتے تھے۔ بوقت ضرورت اُن سے جنگوں میں بھی کام لیا جاتا تھا۔ [۲۴] عرب قبل از اسلام میں بھی غلامی کا رواج تھا۔ یہاں جو غلام موجود تھے وہ ان تمام معلوم ذرائع سے حاصل کئے جاتے تھے جو اس عہد کی متمدن اقوام میں رائج تھے۔ بردہ فروشی اور اسیران جنگ کے ذریعہ جو غلام ہاتھ آتے تھے وہ لازماً غیر عرب ہی نہ ہوتے تھے بلکہ ان میں عرب کے مختلف قبائل کے افراد کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ افراد مغلوب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح اغواء کر کے بھی بھولے بھٹکے اور تنہا سفر کرنے والوں کو غلام بنانے کا رواج تھا۔ یہ لوگ جو کسی جرم کی پاداش میں اپنے قبیلے سے ذات باہر کر دیئے جاتے تھے اور جنھیں خلیع [۲۵] کہا جاتا تھا، اگر چالاک لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو انھیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان غلاموں سے جنگ میں بھی کام لیا جاتا تھا اور ایسی صورت میں انھیں مال غنیمت سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ ان کا حصہ ان کے آقا کو ملتا تھا[۲۶] لیکن عرب کے قانون عرفی کی رو سے غلام عموماً جنگوں میں حصہ لینے سے احتراز کرتے تھے [۲۷]۔ ایسے اسیران جنگ جو فاتح قبائل کے ہاتھ آتے تھے ان کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ انھیں گرفتار کرنے والے ان کے بال کاٹ کر اپنے ترکش میں رکھ لیتے تھے اور جب تک ایسے لوگ اپنی آزادی خرید نہ لیں ان کے بال کو ان کے گرفتار کنندہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے [۲۸] اسی طرح دنیا کی دیگر اقوام کی طرح عرب کے لوگ باندیوں سے شادیاں بھی کرتے تھے اور ان سے جو اولاد ہوتی تھیں انھیں بھی غلام ہی سمجھا جاتا تھا[۲۹] اگر پرستارزادہ کوئی کارنمایاں انجام دیتا یا پھر اس کا آزاد باپ اپنی کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر اسے آزاد

کر کے اپنے بیٹے کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا تو ایسے بیٹوں کی حیثیت میں آزاد ماؤں کی اولاد سے کوئی فرق نہ ہوتا تھا[۳۰]۔

اس بیان سے جو نقش اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل عرب میں بقاء اور جہد للحیات کی غرض سے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ہر قبیلہ اپنی تعداد بڑھائے۔ تعداد میں اضافے کے کئی طریقے رائج تھے۔ ایک تو یہ کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے محالفہ اور معاہدہ کر لیتا تھا۔ اور بوقت ضرورت اس کی نصرت و اعانت پر اعتماد کرتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ استلحاق کے ذریعہ کسی گروہ، فرد، عربی، غیر عربی، آزاد یا غلام کو اپنے قبیلے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اور یوں نہ صرف یہ کہ ایسے افراد دست برد اغیار سے محفوظ ہو جاتے تھے بلکہ خود ان قبائل کو یک گونہ ان کی شمولیت سے تقویت پہنچتی تھی۔ یہی ضرورت گویا طریقہ ولاء کی اساس تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی اور وہ یہ کہ ایسے ملک میں جہاں کوئی منظم حکومت نہ ہو اور جو شدید قسم کی لامرکزیت کا شکار ہو ان لوگوں کی جان و مال کیسے محفوظ رہے، جو یہاں کسی ضرورت یا کسی مجبوری کے تحت آ رہیں۔ اس لئے بھی یہ امر ضروری تھا کہ ان اجانب کو عرب کے معاشرے میں مدغم کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ اس غرض سے یہ طریقہ رائج کیا گیا کہ ایسے لوگوں کو موالات کے طریقہ پر کسی قبیلے کا رکن بنا لیا جائے اور یہ طریقہ ادغام اغیار جیسا کہ آج کی دنیا میں رائج ہے اس عہد میں بھی جاری تھا۔[۳۱]

یہ نظام موالات جو عرب میں رائج کیا گیا تھا بلاشبہ کوئی نیا نظام نہ تھا، بلکہ اس عہد میں قریب قریب ہر قوم کو کم از کم غیر ملکی باشندوں اور ملک میں مفتوح، مغلوب اور آزاد شدہ غلاموں کے مسائل درپیش تھے۔ مگر دنیا کی مہذب اقوام نے ان مسائل کو کس انداز میں حل کیا، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم اہل ہند نے مفتوح و مغلوب اقوام کو جو غیر آریائی تھیں، عام انسانی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا۔ انھیں شدر یا اچھوت کہا جاتا تھا اور معاشرے کے سب سے نچلے طبقے میں وہ محسوب کئے جاتے تھے۔ حکمراں نسل کی خدمت گاری اور غلامی ان کا نوشتۂ تقدیر تھی۔ اسی طرح اہل یونان اور ان کے

جانشین اہل روم نے اپنے زیر نگیں غیر اقوام کو کسمپرسی کی حالت میں رکھا۔ان کی حیثیت آزاد غلام (Libertine) سے زیادہ نہ تھی اور وہ زندگی کی ان تمام سہولتوں سے قریب قریب محروم تھے جو یونان و روم کے عام شہریوں کو حاصل تھیں۔یہی حال دنیائے قدیم کے تہذیبی گہوارے ایران کا بھی تھا، جہاں غیر اقوام غلاموں کے درجے میں رکھی جاتی تھیں اور نسل ایرانی سے ہمسری اور ہم چشمی کی جرأت بھی جرم سمجھی جاتی تھی[۳۲]۔یہ حکمت عملی جو ہند قدیم ،یونان و روم اور ایران قدیم میں غیر اقوام سے متعلق ہمیں یکساں طور پر بروئے کار نظر آتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے قدیم فلاسفہ نے انھیں یہ نظریہ عطا کیا تھا کہ دیگر اقوام کے مقابلے میں انھیں ایک الوہی تقدس حاصل ہے اور انھیں ان لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔[۳۳]

عرب جاہلیہ کی یہ محرومی کہ اس میں کوئی ایسا مفکر نہ پیدا ہوا جو نظم مملکت کے جابرانہ اصول کو عین فطرت اور فلسفہ سیاست کو مبنی بر انصاف قرار دینے میں اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ،دراصل اس کے حق میں رحمت ثابت ہوئی اور شاید ملک کی لامرکزیت کو بھی اس میں یک گونہ دخل تھا کہ سرزمین عرب کے تقدس کا ترانہ ان کے لبوں پر شعر بن کر نہ اُبھرا اور نسل سامی کی برتری ان کی سیاست کاری کا فلسفہ نہ بن سکی۔ایسے نظریہ ہائے حیات جو قوموں میں تنگ نظری اور لوگوں کے ذہنوں میں تنگی پیدا کرتے ہیں،ان سے عرب کے اذہان خالی اور ان کے افکار عاری تھے۔اسی لئے ان میں ذہنی اعتبار سے بڑی وسعت اور فکری حیثیت سے بڑی سادگی تھی۔غیر عرب یا آزاد کردہ غلام ،اسی لئے جب اس معاشرے میں در آئے تو انھیں عربوں نے اپنے معاشرے میں مدغم کر لیا اور یہ ادغام ایسا مکمل تھا کہ اس کے بعد عرب و غیر عرب کی تمیز نہ رہی اور اس سرزمین میں جو بھی آیا وہ عرب ہو گیا۔یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں یمن کے اسرۂ حاکمہ ابنائے احرار [۳۴] اور حجاز کے یہود [۳۵] قبائل کے سوا تمام غیر عرب آباد کار، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو،اس طور سے باہم مل جل گئے تھے کہ عرب کے سوا یہاں کوئی اور نہ بستا تھا۔

مختصر یہ کہ عربوں نے غیر عربوں اور ایک قبیلے نے دوسرے قبیلے کو اس کی مرضی سے اپنے میں مدغم کرنے نیز افراد کو اپنی حسب منشاء کسی قبیلے سے منسلک ہو جانے کی غرض سے نظام ولاء رائج کیا اور یوں اس محدود معاشرے میں جو قبائلی نوعیت کا تھا، یک گونہ وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس پیان ولاء سے وابستہ دونوں ہی فریقوں کو فائدے پہنچے۔ وہ افراد جو کسی قبیلے سے موالات کا رشتہ قائم کرتے تھے، ان کو جان و مال کی حفاظت کی ضمانت اور حامیوں کی ایک جماعت مل جاتی تھی۔ اسی طرح وہ لوگ جو ایسے افراد کو اپنا مولیٰ بنا لیتے تھے، انھیں اپنی تعداد بڑھانے اور اپنے حریفوں کے مقابلے میں طاقت بہم پہنچانے کا موقع مل جاتا تھا۔

عربی زبان میں ولاء کے جن لغوی مفاہیم سے بحث کی گئی ہے (دیکھئے اس مجموعہ میں شامل مقالہ ''لفظ مولیٰ کی لغوی و اصطلاحی تشریح'') وہ درحقیقت ایسے مجازی معنی ہیں جن میں یہ لفظ اور اس کے مختلف مشتقات استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس استعمال کی اساس، ظاہر ہے، عرب جاہلیہ کے معاشرے کے مختلف پہلو ہیں اور انھیں پہلوؤں کی عکاسی ان مجازی معانی سے ہوتی ہے اسی لئے آیات قرآنی، احادیث نبویؐ اور اشعار عرب میں ان تمام استعمالات سے متعلق شواہد موجود ہیں لیکن ان تمام معانی میں سے مولا کے لفظ کو عمومیت کے ساتھ جن معنوں میں استعمال کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مولیٰ القرابت والولادت: (رشتہ و نسب کا مولیٰ)

۲۔ مولیٰ الحِلف والیمین: (عہد و پیان کا مولیٰ)

۳۔ مولیٰ النعمت: (احسان کا مولیٰ)

ان تینوں اقسام کی کسی قدر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

۱۔ **مولیٰ القرابت والولادت:** نسب و نسل سے قائم ہونے والی قرابت کا دائرہ عرب کے معاشرے میں بڑا وسیع تھا۔ دنیا کی شاید ہی کسی قوم نے اپنے شجرۂ نسب کی حفاظت میں اتنا اہتمام کیا ہو جتنا عربوں نے کیا ہے۔ عہد جاہلیت میں عربوں کے علوم و

فنون کا دائرہ چنداں وسیع نہ تھا مگر ان کے جو ابتدائی نقوش بھی ان کی لوح ذہن پر مرتسم ہوئے ان میں علم انساب کے واضح خدوخال نظر آتے ہیں۔صدر اسلام میں بھی اس علم کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی گئی اور اس کی تعلیم وتعلم کو بڑی اہمیت دی گئی۔علم انساب کی یہ اہمیت دراصل اس لئے تھی کہ اسی کے ذریعہ نسلی نجابت اور نسبی رشتوں کی حفاظت وصیانت ممکن تھی[۳۶] اسی نسب کے محور پر عرب جاہلیت کی معاشرتی زندگی گردش کرتی تھی اور یہی رشتے اس کے سماج کے تانے بانے تھے۔ چنانچہ بوقت ضرورت اس رشتہ کے ناطے سے یہ لوگ ایک دوسرے سے استمداد کرتے اور بوقت مفاخرت ان تعلقات پر فخر کرتے تھے۔وہ محالفت وموالات جو اس طور سے وجود میں آتی تھی دوسری تمام اقسام حلف وولاء سے زیادہ قوی اور موثر ہوتی تھی ۔اسی لئے چچازاد بھائی کو مولیٰ کہا جاتا تھا جو افراد کے مابین قریب ترین رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ایسے موالی کو سہولت اداء کی غرض سے دو درجوں یا دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ایک ''مولیٰ قرابت'' اور دوسرا ''مولیٰ ولادت''۔تفصیل ان دونوں قسم کی ولاء کی ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

(ا) مولیٰ قرابت: یہ قرابت شادی اور نکاح کے ذریعہ قائم ہوتی تھی۔اسلام سے قبل عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ ایک فرد شادی بیاہ کے ناطے سے کسی غیر قبیلہ کا مولیٰ بن جاتا تھا۔یہ ولاء جو ازدواج کے تعلق سے وجود میں آتی تھی اس میں قبیلہ کے صریح اور غیر صریح دونوں ہی افراد شامل ہوتے تھے۔اس طور سے داماد، خسر، سالے ایک دوسرے کے موالی بن جاتے تھے۔[۳۷]

(ب) مولیٰ ولادت: ایک مورث اعلیٰ کی نسل میں شامل افراد جو ابنائے عم (چچا زاد بھائی) ہوتے تھے ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے تھے۔ یہ ولاء خون کے رشتہ سے وجود میں آتی تھی اور اس میں لوگوں کا اتحاد اور اس سے ان کی وابستگی اسی خونی رشتہ کے باعث ہوتی تھی۔ چنانچہ دو بھائیوں کی اولاد اور ان سے اوپر نسب ابعد کے تعلق سے دو خاندانوں کا نسلی اتحاد بھی ولاء کے انعقاد کا باعث ہوتا تھا اور یہ افراد ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے

تھے۔ مثلاً بنو ہاشم و بنو امیہ جو عبد مناف کی اولاد میں تھے باہم رشتہ موالات میں منسلک تھے اور ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے تھے [۳۸]۔ چنانچہ عتبی ہاشمی بنو امیہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

مھلا بنی عمنا مھلا موالینا

لاتنبشو ابیننا ما کان مدفونا [۳۹]

(اے ہمارے چچازاد بھائیو! اے ہمارے موالی! نرمی اختیار کرو اور ان پرانی عداوتوں کو از سرِ نو زندہ نہ کرو جو ہمارے سینوں میں دفن ہو چکی ہیں)

اس طرح قریش اور بنو غفار کہ ان کا مورث اعلیٰ کنانہ ہے بنو اعمام اور موالی ہوئے [۴۰]۔ ایسے موالی ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے تھے۔

۲۔ مولیٰ الحلف والیمین: بعض وجوہ کی بناء پر کوئی شخص کسی غیر قبیلہ کے فرد سے معاہدہ کر لیتا تھا اور اس پیمان بندی کے ذریعہ وہ اس قبیلہ کا مولیٰ بن جاتا تھا۔ ایسے شخص کو مولی الحِلف یا مولی الاصطناع کہا جاتا تھا۔ یہ موالات متعدد طریقوں سے وجود میں آتی تھی۔ کبھی محالفت یعنی باہمی عہد پیمان سے، کبھی مخالطت یعنی کسی فرد کے کسی قبیلہ میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے باعث اور کبھی ملازمت یعنی کئی پشتوں سے تعلقات کے نتیجہ میں ایک فرد کے کسی قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہو جانے کے سبب سے، ولاء کا انعقاد ہو جاتا تھا [۴۱] ابو لکبیر بن عبد یالیل حضرت عمر فاروقؓ کے دادا نفیل بن عبدالعزیٰ کے حلیف اور اس رشتہ سے ان کے مولی تھے [۴۲] اور یہود یثرب مخالطت و ملازمت کے باعث اوس و خزرج کے موالی بن گئے تھے [۴۳] ان موالی کے حقوق کا تعین بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد صلبی وارث نہ ہونے کی صورت میں ان سے موالات کرنے والا ان کا وارث بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ لوگ مارے جاتے تو ان کے دیت بھی ان سے موالات کرنے والا وصول کرتا تھا [۴۴]۔ حقوق و فرائض میں انہیں مساوی سمجھا جاتا تھا اور یہ اپنے موالات کنندہ خاندان میں شادی بیاہ بھی کرتے تھے [۴۵]۔ اور یوں مولیٰ الحِلف والیمین کے

ساتھ ساتھ یہ مولی القرابت بھی بن جاتے تھے۔ عبداللہ بن جحش اور عبیداللہ بن جحش بنوامیہ کے سردار ابوسفیان بن حرب کے مولیٰ الحلیف تھے۔ عبیداللہ کا نکاح ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ سے ہوا تھا [۴۶]۔ اس موالات میں جہاں قید نسل نہ تھی وہیں قید مذہب بھی نہ تھی۔ اسی لیے رشتہ ولاء میں بت پرست، یہود، نصاریٰ سبھی منسلک نظر آتے تھے [۴۷]۔

۳۔ مولیٰ النعمت: حسن کارکردگی کے باعث یا کسی اور سبب سے غلام کو آزاد کردیتے تھے۔ اگر غلام اسیر جنگ ہوتا تو اُسے آزاد کرتے وقت اس کی پیشانی کا بال کاٹ کر اپنے ترکش میں رکھ لیتے اور اُسے آزاد کردیتے تھے۔ ایسے شخص کو ذلیل سمجھتے اور فخریہ اس کا اظہار اشعار میں بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی آقا یہ وصیت کرتا کہ اُس کی وفات کے بعد اس کا غلام آزاد متصور ہوگا۔ اس طریقہ کو تدبیر اور ایسے غلام کو مُدبّر کہتے تھے۔ اپنے آقا کی موت کے بعد یہ غلام آزاد ہوجاتا تھا۔ اسی طرح آزاد مرد اور باندی کے تعلق زنا شوئی سے پیدا ہونے والی اولاد بھی غلام ہی ہوتی تھی۔ مگر اُسے بھی آزاد کئے جانے کا رواج عام تھا۔ عمار بن یاسر [۴۸] کے والد آزاد اور ماں سمیہ ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کی باندی تھی۔ چنانچہ عمار بھی اس وقت تک آزاد نہ ہوئے جب تک کہ ان کی ماں کے آقا نے انہیں آزاد نہ کردیا۔ آزادئ غلام کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ غلام اپنی آزادی خرید لیتا تھا اور ایک مقررہ رقم کی ادائیگی کے بعد وہ آزاد ہوجاتا تھا، اس غلام کو مکاتب اور اس آزادی کے طریقے کو مکاتبت کہتے تھے۔ ان تمام طریقوں سے آزادی حاصل کرنے والے افراد کو معاشرے میں شامل کرنے کے لیے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا کہ انہیں اپنے آزاد کنندہ یعنی سابق آقا کی ولاء حاصل ہوجاتی تھی اور یوں وہ بے یار و مددگار نہ رہتے تھے بلکہ ان کی پشت پر ایک ایسی طاقت ہوتی تھی جو بوقت ضرورت ان کی ناصر و حامی ہوتی اور انہیں ظلم و ستم سے محفوظ رکھتی تھی۔ عموماً یہ ولاء، جو سابق آقا کو اپنے سابق غلام کی ملتی تھی، ایک موروثی حق متصور ہوتی تھی اور نہ صرف یہ کہ آزاد کنندہ اور آزاد شدہ افراد ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے بلکہ اُن کے خاندان کو پشتہا پشت تک ایک دوسرے کا مولیٰ کہا جاتا تھا [۴۹]۔

چنانچہ صُبَیح جو ابو حیحہ سعید بن عاص بن امیہ کے مولیٰ تھے، سعید کے بعد اس کے بیٹوں کے اور اُن کی اولاد سعید کے پوتوں کی مولیٰ تھی۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ سابق آقا ایسے مولیٰ کی ولاء کسی دوسرے شخص کی جانب منتقل کر دیتے تھے اور یوں یہ موالات ایک نئے خاندان میں قائم ہو جاتی تھی۔ مکاتبت کی صورت میں، اگر رقم کتابت غلام کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اداء کرتا تھا تو آزادی کے بعد ولاء آزاد کنندہ سابق آقا کے بجائے زر کتابت ادا کرنے والے شخص کو حاصل ہو جاتی تھی۔ زر کتابت اگر آزادی حاصل کرنے والا شخص اپنی محنت سے کمائی ہوئی رقم سے اداء کرتا تو ایسی صورت میں کبھی کبھی وہ سابق آقا سے رشتہ موالات نہ قائم کرتا تھا۔ کبھی سابق آقا خود اس بات کا اعلان کر دیتا تھا کہ وہ حق ولاء سے دست بردار ہوتا ہے۔ ایسے آزاد شدہ شخص کو سائبہ کہتے تھے اور اُسے پیمان ولاء باندھنے کی آزادی ہوتی تھی اور اس کے ترکہ سے سابق آقا کو کچھ نہ ملتا تھا [۵۰]۔ ایسے ہی سائبہ سالم [۵۱] مولائے ابو حذیفہ [۵۲] تھے۔ وہ ابو حذیفہ کی بیوی بثینہ کے اصطخری غلام تھے جنہوں نے انہیں سائبۂ آزاد کر دیا تھا۔ موالی حصول آزادی کے بعد بھی معاشرے میں دیگر آزاد افراد سے ایک طبقہ کمتر محسوب ہوتے تھے اور آزاد و غلام کے درمیانی طبقے میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ اس حیثیت سے آزاد تھے کہ انہیں فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس اعتبار سے وہ آزاد اشخاص سے فروتر تھے کہ نکاح و میراث میں آزادوں کی طرح انہیں آزادئ عمل نہ حاصل تھی۔ موالی کسی آزاد عورت سے شادی نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح ان کی دیت آزادوں کی دیت کے نصف کے بقدر تھی۔ گویا آزادی کے بعد بھی انہیں غلام ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر اُن پر قصاص واجب ہوتا تو آزادوں کے مقابلہ میں نصف دیت کی ادائیگی پر پابند کیے جاتے تھے۔ ایسے موالی کی موت کے بعد ان کے سابق آقا اور حال موالی ان کے وارث بھی ہوتے تھے۔ انہیں موالی نعمت کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ سابق آقا ایسے موالی کے وارث ہوتے تھے مگر خود یہ اپنے آقاؤں کے وارث نہ ہو سکتے تھے۔ [۵۳]

حاصل بحث یہ ہے کہ عرب جاہلیت کا معاشرہ دو طبقوں میں منقسم تھا۔ ایک آزاد

اور دوسرا غلام۔ آزادوں کا طبقہ دو ذیلی طبقات پر مشتمل تھا: صریح اور غیر صریح۔ صریح تو وہ تھا جس کا قبیلۂ متعلقہ سے نسلی تعلق ہوتا تھا اور بزرگ قبیلہ سے خونی رشتہ رکھنے کی وجہ سے افراد قبیلہ سے اس کا تعلق خون کا ہوتا تھا۔ مثلاً حرب بن امیہ اور بوسفیان بن حرب بنو امیہ کے صریح افراد تھے اور اس خاندان کے مورث اعلیٰ امیہ بن عبد شمس کی اولاد میں تھے۔ اسی طرح بنو عبد مناف اور قریش سے انہیں خونی رشتے کی بناء پر انتساب تھا۔ عبداللہ بن جحش اور عبیداللہ بن جحش محالفت کے ناطے سے حرب اور ابوسفیان سے وابستہ تھے۔ اسی لیے بنو امیہ اور بنو عبد مناف وقریش سے ان کی وابستگی ان بنیادوں پر نہ تھی جن پر ان کے حلفاء۔ حرب وابوسفیان کی تھی۔ اور وہ بنو امیہ، بنو عبد مناف اور قریش کے غیر صریح افراد تھے۔ ان قبائل میں ان کی حیثیت صریح افراد سے کم تر تھی۔ گو جملہ حقوق وفرائض میں وہ ان کے مساوی محسوب ہوتے تھے۔ صریح وغیر صریح دونوں ہی کی حفاظت جان، صیانت مال اور حمایت کی خاطر قبائل کی رگ انتقام پھڑک اٹھتی تھی اور اُن کی تمام قوت عمل اس نقطہ پر مرکوز ہوجاتی تھی کہ اس کا انتقام لینا اور اس کی آبرو کی حفاظت کرنا ان کا انفرادی فریضہ بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ جس طرح افراد قبائل اپنے بھائی، بھتیجے اور خون کے رشتے سے وابستہ افراد کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے، اسی طرح وہ اپنے ان موالی کی خاطر بھی اپنی جان، اپنے مال اور اپنی عزت کو داؤ پر لگانے سے دریغ نہ کرتے تھے [۵۴]۔ مگر فی الجملہ صریح کے مقابلہ میں غیر صریح یا مولیٰ کو کسی قدر کمتر حقوق حاصل ہوتے تھے۔ مثلاً آزاد کے مقابلہ میں مولیٰ کی دیت نصف ہوتی تھی۔ ارتکاب جرائم کی صورت میں اس پر جو قصاص لازم آتا تھا وہ بھی آزاد کے قصاص سے نصف ہوتا تھا۔ اگر اس کی صلبی اولاد نہ ہوتی تو اس کے تمام ترکہ کا حق دار اس کا سابق آقا اور حال مولیٰ ہوتا تھا اور صلبی اولاد کی موجودگی میں اُسے ترکہ کا ایک ثلث ملتا تھا۔ اسی حقیقت کی عکاسی ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''عرب میں بو اجنبی آکر سکونت گزیں ہوجاتے ان کو ''مولا'' کا نام دیا جاتا تھا۔ عرب اور خاص کر مکے والوں کے موالی کے ساتھ یونان کے مقابلہ میں کم سختی کا سلوک

ہوتا تھا۔ چنانچہ ان پر کوئی خصوصی محصول عائد نہیں کیے جاتے تھے۔ ان کو اور ان کے سرپرستوں کو جملہ شہری حقوق حاصل رہتے تھے۔ مساوات کی حد یہ تھی کہ اجنبی اور اس کے سرپرست دونوں کے لیے ایک ہی لفظ مولیٰ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ یہ تحدید بداہتہ پائی جاتی تھی کہ کوئی اجنبی متوطن کسی اور نئے اجنبی کو اپنا مولا بنانے کا اور اپنی سرپرستی میں لینے کا مجاز نہ تھا۔ اس پابندی سے قطع نظر ہر اجنبی متوطن اپنے سرپرست کے خاندان کا ایک رکن بن جاتا اور اُسے وہ سب شہری حقوق حاصل رہتے جو کسی اصلی شہری کو حاصل تھے۔ البتہ نئے اجنبی کو اپنی پناہ میں لینے سے پہلے اُسے خود اپنے سرپرست کی اجازت ضروری ہوتی۔ اصل میں عرب یہ چاہتے تھے کہ اوروں کو اپنا لیں اور عرب بنا ڈالیں۔ اس کے برخلاف یونانیوں کو ان کے فلاسفہ نے کہہ رکھا تھا کہ قدرت ہی کا یہ منشاء ہے کہ اجنبی یونانیوں کے غلام بنیں''۔[۵۵]

حواشی

[۱] القرآن، سورۃ ابراہیم آیت ۳۷۔

[۲] جنوب مغربی ایشیا میں واقع ملک عرب جزیرہ نما ہے اور اس کے تین سمت سمندر اور چوتھی سمت خشکی ہے۔ مگر اہل عرب اسے عموماً جزیرۃ العرب کہتے ہیں۔ اس کے حدود اربعہ کی تحدیدیوں کی گئی ہے کہ مغرب میں بحر احمر (Red Sea) مشرق میں خلیج فارس و بحر عمان (Persian Gulf & Sea of Oman) جنوب میں بحر ہند (Indian Ocean) اور شمال میں بادیۂ شام (The Syrian Desert) ہے۔ تمام ملک میں پہاڑوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ سب سے طویل سلسلۂ کوہ جبل السراۃ ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے۔ جابجا بڑے بڑے صحرا ہیں۔ سب سے بڑا صحرا شام و عرب کا ریگستانی میدان ہے جو بادیۂ شام یا بادیۂ عرب کہلاتا ہے۔ دوسرا ریگستان یمن، عمان اور یمامہ کے درمیان واقع ہے، جسے دہنا

صحرائے اعظم یا الربع الخالی کہتے ہیں۔ پورے ملک میں کوئی دریا نہیں، البتہ پہاڑی چشمے ہیں اور کہیں کہیں کنویں بھی ہیں۔ کبھی کبھی یہ چشمے پھیل کر مصنوعی جھیلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے پورا ملک گرم ہے۔ میدانوں میں بادِ سموم چلتی ہے۔ سردیوں میں کسی قدر بارش ہوتی ہے، جس سے گھاس اگ آتی ہے ایسے مقامات کو بطور چراگاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس موسم میں راتوں کو پانی برف بن جاتا ہے۔ البتہ وہ مقامات جو ساحل سمندر کے قریب ہیں عموماً سرسبز ہیں۔

(The Encyclopaedia of Islam, Leyden 1960 Vol 1, PP 533-534 and 537-539. And the Encyclopaedia Britanica Chicago 1949 Vol 2, P.173.)

[۳] عرب قدیم میں یمن میں جبل سرات کے کوہستانی سلسلوں میں بارش کے پانی کو وادیوں میں ذخیرہ کرنے اور بند باندھنے کا رواج عام تھا۔ ان بندوں میں وہ بند سب سے مشہور تھا جو شہر مآرب کے جنوب میں واقع جبل ابلق نامی دو پہاڑوں کے درمیان باندھا گیا تھا۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں وادی اذینہ ہے۔ بارش کا پانی پہاڑوں اور برساتی نالوں سے بہتا ہوا اس وادی میں جمع ہو جاتا تھا۔ سبا نے قریباً ۸۰۰ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے وسط میں سد مآرب کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند ایک سو پچاس فٹ لانبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار سے عبارت تھا جسے پتھر اور تارکول سے بنایا گیا تھا۔ اس دیوار میں تلے اوپر تیس (۳۰) دریچے تھے جن سے پانی بند میں ذخیرہ کیا جاتا تھا حسب ضرورت ان دریچوں کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ بند کے دائیں اور بائیں جانب مشرق و مغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمین کو سیراب کرتا تھا۔ یہ بند یمن کی معیشت کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اس کی تعمیر، اہمیت اور شکست و ریخت سے عرب قدیم کی بہت سی داستانیں وابستہ ہیں۔ اشعار عرب، اخبار جاہلیہ و نیز قرآن کی سورہ سبا آیات ۱۵، ۱۶ و مابعد میں اس بند کی تعمیر و تخریب کے تذکرے موجود ہیں۔ یمن کے قبائل کے تفرق و تشتت کی داستانیں اسی بند کی تخریب کے گرد گردش کرتی ہیں۔ مورخین قدیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایام حمیر تک یہ بند صحیح سلامت رہا مگر جب ملک میں سیاسی انتشار پیدا ہوا اور بند کی

نگرانی کی جانب سے غفلت برتی گئی تو یہ بتدریج تباہ ہو گیا۔ اس بند کا ایک تہائی حصہ آج بھی موجود ہے بقول حمزہ اصفہانی ظہور اسلام سے چار سو سال قبل یہ بند تباہ ہوا، یاقوت حموی کا بیان ہے کہ یمن پر حبشیوں کے تسلط کے زمانہ یعنی چھٹی صدی عیسوی میں یہ بند تباہ ہوا، اور ابن خلدون کا خیال ہے کہ بند کی تباہی پانچویں صدی عیسوی میں مکمل ہوئی۔ سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ھمدانی نے سد مآرب کے کھنڈروں کو قریب سے دیکھ کر اس کے حالات اپنی کتاب الاکلیل میں قلمبند کیے۔ انیسویں صدی عیسوی میں فرانسیسی مستشرق ارنو نے مآرب تک پہنچ کر اس کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیا اور ہمدانی کے بیان کی تصدیق کی (جرجی زیدان، العرب قبل الاسلام۔ طبع دارالہلال مصر ۱۹۵۸ء (طبع جدید) ص ۱۷۰۔۱۷۸) وسید سلیمان ندوی ارض القرآن طبع دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء۔ ج ا ص ۲۵۴)

[۴] عرب قدیم کا متمدن ترین اور سب سے زیادہ سرسبز خطہ یمن تھا۔ اہل یمن کے تجارتی تعلقات اہل ہند، اہل ایران اور اہل حبشہ کے ساتھ قائم تھے۔ یہاں ظہور اسلام سے صدیوں پہلے آل سبا کی حکومت قائم ہوئی۔ انھوں نے عرب کے علاوہ بحر احمر کے دوسرے ساحل پر بھی اپنی نو آبادی قائم کی۔ افریقی باشندوں اور فاتحین کے امتزاج سے ایک نئی نسل وجود میں آئی اور سبا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اس نے افریقہ کے اس خطہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ آل سبا کے بعد یمن میں اس خاندان کی ایک اور حکومت آل حمیر کے نام سے وجود میں آئی۔ ان حکمرانوں کو تبع کہتے ہیں۔ یمن کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ۵۲۵ء میں اہل حبشہ کے تسلط سے ہوا۔ یمن پر حبشیوں کی حکومت قریباً ۷۴ سال تک رہی اور ان کے چار حکمرانوں نے یہاں بساط حکومت بچھائی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں حبشیوں کو شکست دے کر ایرانیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا اور ظہور اسلام تک یمن ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ یہاں ایرانی گورنر حکومت کرتے رہے۔ آخری ایرانی گورنر باذان نے آنحضرت ﷺ کی دعوت قبول کر لی اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی یمن اسلام کی عملداری میں آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں تبابعہ (آل حمیر) کی حکومت اعیانی تھی بڑے بڑے سرداروں کی جنھیں مَلِک کہتے تھے ایک مجلس حاکمہ ہوتی تھی ان

ملکوں کی تعداد آٹھ ہوتی تھی اور انھیں مثامنہ کہتے تھے۔ حکمراں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے یا بھیجے کی عدم موجودگی میں انھیں آٹھ مَلکوں میں سے ایک کو بادشاہ بنا دیا جاتا تھا۔ اور ملک کی خالی نشست مجلس زیرین کے ایک قیل کو مَلک بنا کر پُر کر دی جاتی تھی۔ مجلس زیرین میں اسی (۸۰) قیل ہوتے تھے۔ اسی طرح قیل کی خالی اسامی کو اہل البیت میں سے ایک آدمی کو قیل بنا کر پُر کر دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یمن میں نظام سیاسی کتنا باقاعدہ تھا اور ملک کی انتظامی ساخت کتنی مستحکم تھی (عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ۔ السیرۃ النبویۃ۔ طبع مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۵۵ھ، ج ۱، ص ۱۹۔ ۳۷، ۷۱۔ محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ء تاریخ الرسل و الملوک طبع دارالمعارف، مصر ۱۹۶۱ء، ج ۲، ص ۱۰۵۔ ۱۲۳ و ۱۴۸۔ وعزالدین ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ۔ الکامل فی التاریخ، طبع ادارۃ الطباعۃ المنیریہ دمشق ۱۳۴۸ھ، ج ۱، ص ۲۵۲، ۲۵۳، و ۲۶۰۔ ۲۶۵۔ وعبدالرحمٰن بن خلدون متوفی ۸۰۸ھ۔ العبر ودیوان المبتداء والخبر۔ طبع بولاق، مصر ۱۲۸۴ھ ج ۲، ص ۶۳، ۶۴، و ابو علی مرزوقی اصفہانی متوفی ۴۲۱ھ۔ الازمنہ والامکنہ، طبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن ۱۳۳۲ھ، ج ۲، ص ۱۵۳۔

[۵] عراق عرب کے مقام حیرہ میں لخمیوں کی نیم خود مختار حکومت قائم تھی۔ ان حکمرانوں کا تعلق قضاعہ کی شاخ تنوخ سے تھا۔ قضاعہ کو قدیم مورخین نے قبائل یمن میں محسوب کیا ہے، اسی لیے حیرہ کے ان حکمرانوں کو بھی یمنی النسل قرار دیا ہے۔ مگر اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے اور قضاعہ کی شاخ کے تمام قبائل کو معد بن عدنان کی نسل میں شمار کیا گیا ہے۔ تنوخ کے اس خانوادہ کا پہلا حاکم جذیمۃ الابرش تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا خواہر زادہ عمرو بن عدی اس کا جانشین ہوا، اس کا تعلق قضاعہ کی دوسری شاخ لخم سے تھا اس لیے اس کی اور اس کے احفاد کی حکومت کو آل لخم کی حکومت، پایۂ تخت کی مناسبت سے ملوک حیرہ اور متعدد حکمرانوں کے نام منذر ہونے کی وجہ سے مناذرہ کی حکومت بھی کہتے ہیں۔ ان سلاطین کے حالات حیرہ کے گرجاؤں کی کتابوں کے علاوہ عرب قبل از اسلام کے اشعار اور ایام عرب کی داستانوں میں محفوظ ہیں۔ حمزہ اصفہانی نے سنی الملوک میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حیرہ پر مناذرہ کے بائیس بادشاہوں نے تین سو چونسٹھ

سال تک حکومت کی، جن میں مشہور عمرو بن عدی (۲۶۸۔ ۲۸۸) منذر بن نعمان اعور (۴۳۱۔ ۴۷۳) منذر بن امراء القیس ملقب بہ ماء السماء (۵۱۰۔ ۵۳۳) عمرو بن ہند (۵۳۳۔ ۵۷۸) اور نعمان بن منذر ابو قابوس (۵۸۵۔ ۶۱۳) ہیں۔ کوفہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع حیرہ کا شہر ان کا پایہ تخت تھا اور عالی شان محلات، شاداب باغات اور نظر فریب نہروں کی وجہ سے اس عہد کا نہایت بارونق شہر سمجھا جاتا تھا۔ بادیۂ عراق، نجد و حجاز و بحرین کے عرب قبائل پر مناذرہ کے سیاسی اثرات تھے۔ ان قبائل کو اپنا ہمنوا بنانے کی غرض سے یہ بادشاہ انہیں انعامات سے نوازتے، ان کے شعراء کو بیش قرار صلے دیتے اور اُن کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کراتے تھے۔ اسی طرح ان کے میلوں اور بازاروں میں اپنے تجارتی مال و اسباب بھی فروخت کی غرض سے بھیجتے تھے۔ (ابن اثیر۔ الکامل فی التاریخ، ج ۱، ص ۲۹۲۔ ۲۹۳ و ابن خلدون، العبر و دیوان المبتدا، والخبر، ج ۲، ص ۲۶۲۔ ۲۷۱)۔

[۶] علمائے انساب کا بیان ہے کہ قحطان کی ایک شاخ کہلان کو کاہنوں نے یہ بتا دیا تھا کہ سد مآرب ٹوٹنے والا ہے۔ اس لیے یہ لوگ یمن سے نقل مکانی کر کے شمالی عرب چلے آئے ہیں۔ انہیں کہلانیوں میں جفنہ بن عمرو بن عامر (مزیقیاء) بھی تھا، جو شام کی جانب ہجرت کر گیا۔ اس ہجرت سے قبل یہ لوگ تہامہ میں نہر غسان کے کنارے آباد ہو گئے تھے، اسی لیے وہ غسان کے نام سے موسوم ہوئے۔ مشارف شام میں قیام کے دوران انہیں یہاں کے قدیم آباد کار قبائل قضاعہ سے لڑائیاں لڑنی پڑیں، ان پر غلبہ کے بعد رومۃ الکبریٰ کی سرپرستی میں اپنی نیم خود مختار حکومت قائم کی جس کا پایۂ تخت بصریٰ کا شہر تھا۔ غسانیوں کو تحقیق حال کی بناء پر یمن کے قبائل کے بجائے شمال کے قبائل میں محسوب کیا گیا ہے اور ان کا نسلی سلسلہ قحطان کے بجائے نبایوط سے ملتا ہے جو آل اسماعیل سے تھے۔ آل غسان کے حالات حکومت عموماً منتشر ہیں۔ اُن کی مدت حکومت، تعداد سلاطین اور دائرۂ اختیار میں شدید اختلافات ہیں۔ ابو الفداء کی رائے ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں یہ سلطنت وجود میں آئی اور اس کا خاتمہ ۶۳۳ھ میں عہد فاروقی میں ہوا۔ یوں انہوں نے کم و بیش چار سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے رومیوں کے زیر اثر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ ان

میں جبلہ جو ۵۰۰ھ میں بادشاہ ہوا اور اس کا بیٹا حارث بن جبلہ جو ۵۶۹ھ تک حکمران رہا، مشہور ہیں۔ ایرانیوں اور رومیوں کے تعلقات کی نوعیت کے لحاظ سے غسانیوں اور لخمیوں کے تعلقات بھی حلیفانہ یا حریفانہ رہتے تھے۔ شمال کے عرب قبائل پر اپنے سیاسی اثرات کے قیام کی کوشش بھی انہیں لخمیوں سے برسر پرخاش رہنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ یہ بھی اپنے حریفوں کی طرح شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔ ابن خلدون، العبر و دیوان المبتداء والخبر، ج ۲، ص ۲۷۹۔۲۸۲۔ سید سلیمان ندوی (ارض القرآن، ج ۲، ص ۸۸۔۹۰)۔

[۷] القرآن، سورۂ قریش، آیات ۳،۴۔

[۸] فہر بن مالک کا نسلی تعلق مشہور مضری قبیلہ بنو کنانہ سے تھا۔ قوی تر روایات کی رو سے اس فہر کا لقب قریش تھا۔ مکہ میں آباد ہونے والے قبائل قریش کا جد اعلیٰ یہی فہر ہے۔ مگر قریش کی حقیقی عظمت کا آغاز اس خاندان کے ایک باہمت فرد قصی بن کلاب کی سیادت سے ہوتا ہے۔ اس نے قبائل قریش کو منظم کیا۔ مکہ اور اس کے مضافات سے بنو خزاعہ کو نکال کر وہاں قریش کی بستیاں بسائیں۔ اس نے مکہ میں ایک اعیانی حکومت کی بنیاد رکھی جس کے چودہ عہدوں کی سربراہی دس بطون قریش میں منقسم تھی۔ قصی کی اپنی حیثیت رئیس اعلیٰ کی تھی۔ یہ ریاست یونانی ریاستوں کی طرز کی تھی اور اس کے اطراف میں بھی ایک ماتحت سرزمین تھی جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس ریاست کا ایوانِ حکومت کعبہ کے متصل دار الندوہ کی عمارت میں تھا۔ یہیں باہمی صلاح و مشورے سے اجتماعی، حربی، مذہبی، معاشی و عدالتی فیصلے ہوتے تھے۔ حجاج کی دیکھ بھال اور خورد و نوش کے اخراجات کی ادائیگی کی غرض سے شہریوں پر ایک قسم کا ٹیکس بھی عائد کیا گیا تھا۔ یہ شہری ریاست اپنے عہد کی بڑی متمدن ریاست تھی اور قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی خبر دیتی ہے (ابن ہشام السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۲۲۔۱۲۴، ۱۳۰۔۱۳۷، و ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، مطبوعہ دار صادر، بیروت ۱۹۵۷ء ج ۱، ص ۶۶۔۷۳ و ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی، طبع مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن (بار اول۔ سال طباعت ندارد، ص ۲۶، ۳۳، ۳۷، ۳۹، ۲۲۸) و سید سلیمان ندوی، ارض القرآن، ج ۲، ص ۱۱۷، ۱۱۸)۔

[۹] حجاز کے شہروں میں یثرب کو نہایت اہمیت حاصل تھی۔ یہ یمن وحجاز سے شام کی جانب جانے والی شاہ راہ پر واقع تھا۔ اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے یہود کے قبائل آباد ہوئے، ان کے بعد سد مآرب کی شکست وریخت سے منتشر ہونے والے قبائل کہلان کی ایک شاخ نے یہاں ڈیرا ڈالا۔ یہ لوگ اوس وخزرج کے نام سے اور اسلام کے بعد انصار کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ابتدا میں ان کے تعلقات یہود سے اچھے رہے مگر بعد میں باہمی مناقشات اتنے بڑھے کہ اوس وخزرج کو اپنے ہم نسب غسانیوں سے مدد مانگنی پڑی اور غسانیوں نے یثرب آکر یہود کا زور توڑا۔ اس کے بعد اوس وخزرج کے ساتھ یہود کے تینوں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ قبائل کے معاہدے ہوگئے اور یہ معاہدے صدر اسلام تک باقی رہے۔ ہجرت نبویؐ کے بعد اس شہر کا نام مدینۃ النبیؐ (نبی کا شہر) ہوگیا اور پھر علی الاطلاق مدینہ ہوگیا (العرب قبل الاسلام، ص ۲۸۰۔ ۲۸۱)۔ یثرب کے شہر اور اس کے مضافات میں آباد قبائل عرب و یہود کا نظام حیات قبائلی تھا اور یہاں مکہ جیسی کوئی شہری ریاست نہ تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قبیلہ کی اپنی مجلس شوریٰ ہوتی تھی جسے سقیفہ کہتے تھے۔ اسی طرح روایات سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ قبائلی انتشار کے خاتمہ پر متحارب گروہ متفق ہوگئے تھے اور انہوں نے عبداللہ بن ابی سلول خزرجی کو اپنا رئیس اعلیٰ بنانا منظور کرلیا تھا (ڈاکٹر حمید اللہ۔ عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی، ص ۳۹۔ ۴۴)۔

[۱۰] حجاز کا تیسرا مشہور شہر طائف تھا۔ یہ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے حجاز کی جنت کہتے ہیں۔ موسم گرما میں اہل مکہ زمانۂ قدیم سے یہیں قیام کرتے ہیں۔ اس لیے زمانۂ زیر نظر میں قریش کے بہت سے لوگوں کی زمینیں یہاں تھیں اور اسے مکہ کے مخالیف میں سے ایک مخلاف سمجھا جاتا تھا۔ طائف کی پیداوار میں شہد، تربوزے، کیلے، انجیر، اخروٹ، ناشپاتی، اور انار مشہور ہیں۔ گلاب کے لیے طائف مشہور تھا اس سے عطر تیار کیا جاتا تھا، جو شرفائے قریش کے صرف میں آتا تھا۔ یہاں ابتداء میں بنو عدوان آباد تھے جن کی آبادی ستر ہزار کے قریب تھی، مگر جب ان میں ضعف آگیا تو قیس عیلان کی شاخ ہوازن سے تعلق رکھنے والے قبیلہ ثقیف نے شہر پر قبضہ کرلیا اور یہی لوگ یہاں ظہور اسلام کے بعد تک آباد رہے۔ ثقیف کا قبیلہ اپنی ذہانت اور

چالاکی کے لیے عرب میں مشہور تھا۔ ان سے قریش کے شادی بیاہ کے بھی تعلقات تھے۔ ثقیف کا نظام معاشرہ قبائلی تھا اور چند بڑے بڑے سردار یہاں کے کرتا دھرتا تھے (ابوالحسن بلاذری متوفی ۲۷۹ھ، فتوح البلدان، طبع مطبعہ استقامت، مصر ۱۹۵۹ء ص ۶۸، و جرجی زیدان العرب قبل الاسلام ص ۲۸۲ و فلپ کے ہٹی۔ ہسٹری آف دی عربس۔ طبع نیویارک ۱۹۵۹ء، ص ۱۰۲ و ۱۰۳ و ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ص ۲۳۵)

[۱۱] اگرچہ سرزمین عرب ریگستانی و سنگستانی خطوں پر مشتمل تھی مگر ملک میں جابجا قابل کاشت زمینیں بھی تھیں۔ خصوصاً یمن میں اور اس سے کم حجاز کے شہروں طائف، یثرب و خیبر اور نجد کے بعض مقامات میں کاشتکاری ہوتی تھی۔ یہاں کی زرعی پیداوار میں جو، جئی، سبزیاں، کھجور، انگور، اور مختلف قسم کے میوے شامل تھے۔ اسی طرح ساحلی مقامات میں ملکی اور بین الممالک تجارت کا بھی پتا چلتا ہے، خود اندرونِ ملک میں قریش تاجر تھے، جن کی تجارت عرب، حبش، شام و مصر تک پھیلی ہوئی تھی عرب میں صنعت و حرفت کا بھی سراغ ملتا ہے۔ مثلاً یمن میں پارچہ بافی عام تھی اور یمنی چادریں اپنی نفاست کے لیے مشہور تھیں، طائف میں چمڑے کی دباغت کا نہایت عمدہ کام ہوتا تھا اور اسے بلدالدباغ کہتے تھے۔ یثرب کے بنو قینقاع سونار تھے لیکن معیشت کے یہ تمام ذرائع ملک کی عمومی ضروریات کے پیش نظر نہایت قلیل اور ناکافی تھے اور اصل ذریعہ معاش گلہ بانی تھا۔ یہ قبایل چارہ اور پانی کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب ہجرت کرتے رہتے تھے۔ چراگاہوں اور پانی پر قبضے کی کوشش میں قبائلی جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ عرب قبل اسلام کی ان قبائلی جنگوں کو ایام العرب (عرب کے دن) کہتے ہیں۔ اگرچہ عرب جاہلیۃ کی یہ تمام جنگیں معاشی اسباب کی بناء پر نہ لڑی گئیں۔ مگر ان میں سے بیشتر لڑائیوں کا محور ہی چراگاہوں، مویشی اور مال تجارت کی لوٹ تھی۔ یہ ایام کسی ایک نسلی گروہ کے مابین یا دو مختلف نسلی گروہوں کے درمیان ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آپس میں دست و گریباں ہوجاتے تھے، اسی طرح عرب و عجم کی متحارب جماعتیں بھی مصروف جنگ رہتی تھیں۔ ان ایام میں سب سے مشہور لڑائیاں یہ ہیں۔ حرب بسوس جو ربیعہ کے دو قبائل بنو بکر اور بنو تغلب کے

درمیان ہوئی اور جس کی اصل وجہ چراگاہ میں اونٹ کو چرانے کا حق تھا۔ دوسری مشہور جنگ حرب داحس وغبراء تھی جو دو گھوڑوں کی مسابقت اور شرط کی رقوم کی ہار جیت پر اختلاف ہو جانے کے باعث مضر کے دو قبیلوں عبس و ذبیان کے مابین ہوئی۔ تیسری مشہور جنگ حرب فجار تھی جس میں مضر کے دو قبیلے ایک دوسرے سے متحارب تھے۔ ایک فریق قریش وکنانہ اور دوسرا فریق قیس عیلان کی شاخ ہوازن کے قبائل تھے۔ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ ایک فریق نے عکاظ کے بازار میں آنے والے شاہان حیرہ کے اسباب تجارت کو لوٹ لیا تھا۔ چوتھی قابل ذکر جنگ حرب ذی قار کے نام سے مشہور ہے جس میں ربیعہ کے قبائل اور ایران کی شاہی فوج کے مابین شاہانِ حیرہ کے امانت رکھے ہوئے سامانوں کی واپسی کے تنازعہ پر جنگ ہوئی۔ مختصر یہ کہ عرب کی معیشت کا ایک بڑا ذریعہ مال غنیمت بھی تھا جو انہیں قبائلی جھڑپوں اور جنگوں کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا۔ (الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۶۔۱۲۸ و ابن ہشام السیرۃ النبویۃ ج ۱، ص ۱۹۵۔۱۹۸، ابن جریر طبری۔ تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۱۹۳۔۲۱۲ و ابن اثیر الکامل فی التاریخ، ج ۱، ص ۲۸۵۔۲۹۱، ۳۱۲۔ ۳۲۴، ۳۴۳، ۳۵۴ و ابو الفدا حموی۔ المختصر فی اخبار البشر، ج ۱، ص ۷۷۔۷۹، محمود شکری آلوسی بغدادی۔ بلوغ الارب فی معرفتہ احوال العرب، طبع دار الکتاب العربی، مصر ۱۳۴۳ھ۔ ج ۳، ص ۳۸۵۔۴۱۸، و ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۲۳۴۔۲۳۵ و ابو تمام طائی، دیوان الحماسہ، ج ۱، ص ۱۹۹)

[۱۲] کاروانہائے تجارت کی بسلامتی آمد و رفت کی غرض سے قریش نے بیرون عرب اور اندرونِ عرب متعدد معاہدے کیے تھے۔ عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم نے ملوک شام (غسانیوں اور رومیوں) سے، عبد شمس نے نجاشی اکبر (بادشاہ حبشہ و یمن) سے، مطلب نے حمیریوں (مخالیف یمن کے حکمراں) سے اور نوفل نے کسریٰ سے عراق و فارس میں تجارتی قافلوں کے آنے جانے کی اجازت حاصل کی۔ اسی طرح رابیہ (حضرموت) میں قریش ملوک کندہ کی حفاظت میں اپنا مال لے جاتے تھے۔ تمام قبائل عرب میں قریش سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے اور ان قبائل کے سرداروں سے محالفت کے باعث انہیں کوئی گزند نہ پہنچائی جاتی تھی۔ اسی طرح دیگر قبائل کے تجارتی مال و

اسباب کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنا مختلف قبائل سے معاہدوں کے باعث ہی ممکن تھا۔ مثلاً رابیہ میں آل مسروق بن وائل حضری سے ان کے معاہدے تھے اور انہیں کی حفاظت میں یہ کاروانہائے تجارت یہاں آتے تھے (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۳، ۷۵، وابن جریر طبری تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۲۵۲، مرزوقی، الازمنہ والامکنہ، ج ۲، ص ۱۶۵)۔

[۱۳] عربوں میں جن چار مہینوں میں جنگ حرام خیال کی جاتی تھی، انہیں اشہر حرم کہتے ہیں۔ صدر اسلام میں بھی اس حرمت کو برقرار رکھا گیا۔ ان چار حرام مہینوں کی تعین میں اختلافات بھی ہیں مگر سب سے مرجح روایت حضرت عبداللہ بن عباس کی ہے۔ اس روایت کی رو سے محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ وہ چار مہینے تھے جن میں قتال حرام قرار دیا گیا تھا۔ ان مہینوں میں نہ جنگ کرتے تھے اور نہ لوٹ مار کرتے تھے۔ مگر طے، خثعم اور بنی حارث بن کعب کے بعض بطون ان مہینوں کا احترام نہ کرتے تھے اور لوٹ مار سے باز نہ آتے تھے۔ یہ لوگ نہ حج کرتے تھے نہ عمرہ ادا کرتے تھے اور نہ بلد حرام کی حرمت ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر دوسرے قبائل بھی اس تحدید کو توڑنے میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فجار کی لڑائی جو قریش و کنانہ سے قبائل ہوازن نے لڑی انہیں اشہر حرم میں ہوئی۔ اسی لیے اسے حرب فجار کہا گیا ہے۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ عربوں میں اشہر حرم کا طریقہ سب سے پہلے قلمس حذیفہ بن عبد کنانی مضری نے رائج کیا۔ ان حرام مہینوں کو حلال کر کے، ان میں جنگ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ہر تیسرے سال نسیٔ کر کے تیرہویں مہینے کا اضافہ کر دیتے تھے جو ذوالحجہ اور محرم کے درمیان ہوتا تھا۔ اس کا اعلان حج کے موقع پر کیا جاتا تھا۔ یہ اضافہ شدہ مہینہ حرام نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کی وجہ سے حرام مہینوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا۔ حرام مہینوں کی تعداد پوری کرنے کی غرض سے آئندہ مہینے یعنی صفر کو حرام قرار دیتے تھے جو عام حالات میں حرام مہینہ نہ تھا۔ اس نسیٔ کے متعلق ارشاد الٰہی ہے، ترجمہ: (بے شک نسیٔ کفر میں اور ترقی ہے جس سے کفار گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ اس حرام مہینے کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں۔ تاکہ اللہ نے جو مہینے حرام کیے ہیں اُن کی گنتی پوری کر لیں۔ پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینے کو حلال کر لیتے ہیں)۔ بقول علامہ مرزوقی ایام حج میں، جو اشہر حرم میں واقع ہیں، قبائل عرب

میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو لوٹ مار، چوری اور قتل کی غرض سے گھروں سے نکلتے تھے۔
(القرآن سورہ توبہ، آیت ۳۷ و ابن ہشام السیرۃ النبویۃ، ج ا، ص ۴۵۔۴۶ و مرزوقی الازمنہ و الامکنہ، ج ا، ص ۸۸۔۹۰، ۲۲۱۔۲۲۲ و ج ۲، ص ۱۶۶ و عبدالکریم شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ الملل والنحل، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۹۶۱ء ج ۲، ص ۲۴۷ و ۲۴۸۔

[۱۴] عرب کے مختلف بازاروں میں اسباب تجارت کو بحفاظت پہنچانے کی غرض سے تاجروں کو ایک رقم دینا پڑتی تھی جسے خفارہ کہتے تھے جس کے لفظی معنی ہیں کسی کو اپنی پناہ میں لینا خواہ بعوض نقد یا بلا معاوضہ۔ دومۃ الجندل کے بازار میں جو ربیع الاول کے پہلے پندرہواڑے میں لگتا تھا۔ تجار بنو کلب و جدیلہ کی حفاظت میں خرید و فروخت کرتے تھے، مشقر کے بازار میں جو جمادی الاخرہ میں لگتا تھا، عبدالقیس اور بنو تمیم کا عمل دخل تھا اور ان کی رضا مندی کے بغیر یہاں مال لانا ممکن نہ تھا، رابیہ حضر موت میں بنو آکل المرار (ملوک کندہ) اور آل مسروق بن وائل حضرمی کے زیر خفارہ مال تجارت لایا جاتا تھا، عکاظ کا مشہور بازار جو اشہر حُرم (ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں لگتا تھا، خفارہ سے پاک تھا۔ یہ رقم عشور کے علاوہ ہوتی تھی جو تجار کو بازار کی زمین استعمال کرنے اور راہداری کے عوض دینا پڑتی تھی (مرزوقی الازمنہ والامکنہ ج ۲ ص ۱۶۱، ۱۶۷)

[۱۵] ابوالحسن علی ماوردی متوفی ۴۵۰ھ۔ الاحکام السلطانیہ۔ طبع مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۳۸۰ھ ص ۲۰۵

[۱۶] ابن منظور۔ لسان العرب مطبوعہ بولاق، مصر ۱۳۰۰ھ، ج ۵ ص ۷۷ (قبائل کی اس تقسیم میں ابن عبدربہ نے جزوی ترمیم کی ہے ان کا خیال ہے کہ فخذ کے بعد فصیلہ نہیں بلکہ عشیرہ ہوتا تھا یعنی کسی شخص کے اہل خاندان مثلاً آل عباس وابی طالب، اس کے بعد فصیلہ تھا جو کسی شخص کے اہل خانہ (اہل بیت) سے عبارت تھا) ابن عبدربہ قرطبی متوفی ۳۲۸ھ العقد الفرید طبع عامرہ مصر، ۱۲۹۳ھ ج ۲ ص ۵۵۔

[۱۷] جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، مطبوعہ دارالہلال، مصر ۱۹۵۸ء، ج ۴، ص ۱۹۔

[۱۸] ابو تمام الطائی، دیوان الحماسہ مطبوعہ جمالیہ، مصر ۱۹۱۶ء، ج ا، ص ۲۲۱۔

[۱۹] اسلام سے پہلے عربوں میں نکاح کے متعدد طریقے رائج تھے۔ ان میں سے اہم طریقے یہ

تھے: (۱) وہ نکاح جسے اسلام نے باقی رکھا کہ آدمی کسی شخص کو اس کی ولیہ سے نکاح کا پیغام دیتا ہے، مہر اداء کرتا ہے اور نکاح کرلیتا ہے۔ (۲) شوہر اپنی بیوی سے کہتا تھا کہ جب تم حیض سے پاک ہو جاؤ تو فلاں کے پاس چلی جانا اور اس سے ہم بستری کرنا۔ ایسی عورت سے اس کا شوہر اس وقت تک جنسی تعلق نہ قائم کرتا تھا جب تک کہ اس نئے شخص سے وہ عورت حاملہ نہ ہو جاتی۔ ایسا عموماً اس لیے کیا جاتا تھا کہ بچہ جو پیدا ہو نجیب ہو۔ ایسے نکاح کو نکاح استبضاع کہتے تھے۔ (۳) دس سے کم افراد کسی عورت سے جنسی تعلقات قائم کرتے اور جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی تو وضع حمل کے چند روز بعد وہ ان تمام مردوں کو جمع کر کے نومولود کو کسی ایک شخص کی جانب منسوب کر دیتی اور وہ شخص اس انتساب کو قبول کرلیتا۔ (۴) بہت سے لوگ کسی پیشہ ور عورت سے جنسی تعلقات رکھتے۔ جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی تو وضع حمل کے بعد وہ عورت ان سب لوگوں کو جمع کر کے قیافہ شناس کو بلاتی۔ قائف چہرے مہرے کی مناسبت سے بچہ کو کسی ایک شخص کی جانب منسوب کر دیتا اور یوں یہ نومولود اس کی ولدیت میں داخل ہو جاتا۔ (۵) نکاح متعہ جو ایک مقررہ وقت کے لیے کیا جاتا اور مدت گزرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔ (۶) نکاح بدل یعنی دو آدمی آپس میں بیویاں بدل لیتے تھے (امام بخاری صحیح البخاری مطبوعہ اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ، ج ۲، ص ۷۶۹، ۷۷۰ وشہر ستانی، الملل والنحل، ج ۲، ص ۲۴۶ ومحمود شکری آلوسی، بلوغ الارب، ج ۲، ص ۳-۵)۔

[۲۰] ابو تمام الطائی۔ دیوان الحماسہ، ج ۱، ص ۲۲۱۔ (کثیر الاولاد عورت کو ناتق کہتے تھے اور یہ عورتوں میں پسندیدہ صفت سمجھی جاتی تھی)۔

[۲۱] ابو الفرج الاصفہانی، متوفی ۳۵۶ھ الاغانی۔ طبع ساسی مغربی، مصر ۱۳۲۳ھ ج ۷، ص ۱۰۴، ۱۰۵ (ابو الفرج نے اس ضمن میں بنو منتفق بن عامر بن عقیل کے ایک شخص ابو جراد کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اس نے طمر نامی ایک شخص کو گرفتار کیا۔ کچھ دنوں بعد اسے اس شرط پر رہا کر دیا کہ طمر یا زر فدیہ ادا کردے گا یا خود ابو جراد کے پاس مع اہل وعیال چلا آئے گا۔ زر فدیہ کا بندوبست نہ ہو سکا اس لیے طمر اپنے اہل وعیال کے ساتھ ابو جراد کے پاس چلا آیا اور یہ لوگ جن کی تعداد پانچ سو افراد کے قریب تھی بنو منتفق کے موالی وحلفاء محسوب ہوئے) وابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ ج ۴، ص ۱۳۶۔

[۲۲] ابوالفرج اصفہانی۔ الاغانی۔ ج ۱۷، ص ۹۴ (حریم نامی ایک شخص نے ایک خوش آواز مغنیہ کو استلحاق کر کے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ حریم کی وفات کے بعد اس مغنیہ نے اس کے ورثہ سے حق میراث میں نزع کیا اور حاکم وقت کے فیصلے کے مطابق اسے حریم کے ترکے میں سے سہام شرعی ملا)۔

[۲۳] تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۴، ص ۲۵۔

[۲۴] غلامی پر مزید تفصیل کی غرض سے "غلامی قدیم" اور "غلامی" پر مضامین بالترتیب ملاحظہ فرمائیں:

The Encyclopaedia of Social Sciences, New York, 1950, Vol XIV, PP 74-77.The Encyclopaedia Britanica, Vol XX, PP 773,775.

[۲۵] خلیع (اسے لعین بھی کہتے تھے) یا ذات باہر وہ شخص ہوتا تھا جس کے شر اور کمینہ پن کی وجہ سے اس کے اہل خاندان اسے خاندان بدر کر دیتے تھے۔ اس خلع کا اعلان خلیع کا باپ ایام حج کے موقع پر کرتا تھا کہ وہ اور اس کا قبیلہ اس شخص سے دست بردار ہوتا ہے اور اس کے کرتوت کی ذمہ داری اس پر یا اس کے قبیلے پر عائد نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو قتل کر دینے پر قاتل کے اوپر کسی قسم کی دیت لازم نہ آتی تھی۔ یہ خلیع آبادی سے دور یکہ و تنہا رہتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں گرفتار کر کے غلام بھی بنالیا جاتا تھا اور کبھی یہ لوگ بھی دوسروں کو قتل کر دیتے یا سامان تجارت لوٹ لیتے تھے۔ مشہور جاہلی شاعر امراؤالقیس کہتا ہے "وَوادٍ کجوفِ العیرِ قفرٍ قطعتُه. بہ الذئبُ یعوی کالخلیع المعیل (محمود شکری آلوسی، بلوغ الارب، ج ۳، ص ۲۷ و ابوعبداللہ حسین بن احمد زوزنی متوفی ۴۸۶ھ۔ شرح المعلقات السبع۔ طبع مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۷۹ھ، ص ۲۸)۔

[۲۶] ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ۔ المعارف۔ طبع حسینیہ، مصر ۱۳۵۳ھ ص ۱۴۱۔

[۲۷] ابوالفرج اصفہانی (الاغانی، ج ۷، ص ۱۴۱۔ عربوں ہی میں نہیں بلکہ یونانیوں میں بھی یہی طریقہ رائج تھا کہ غلاموں سے جنگ میں کام نہ لیتے تھے)۔ بحث غلامی قدیم در۔

The Encyclopaedia of Social Sciences, Vol XIV, PP 74-77.

[۲۸] محمود شکری آلوسی، بلوغ الارب، ج ۳، ص ۱۵۳۔

[۲۹] ابوالفرج اصفہانی۔ الاغانی۔ ج ۷، ص ۱۴۱ (عربوں کا قاعدہ تھا کہ باندی زادوں کو غلام ہی

رکھتے تھے اگر وہ کوئی بڑا کام انجام دیتے تو انہیں آزاد کر کے آقا اپنا بیٹا بنا لیتے۔ بصورت دیگر وہ ساری زندگی غلام ہی رہتے تھے)

[۳۰] عربی زبان کا مشہور شاعر اور داستانوں کا امیر حمزہ عنترہ بن شداد عبسی ایک حبشی باندی زبیبہ کے بطن سے تھا۔ ایک مرتبہ حرب داحس وغبراء کے دوران بنو ذبیان نے بنو عبس پر چھاپہ مارا۔ بڑا زبردست رن پڑا۔ مگر عنترہ نے لڑائی میں حصہ نہ لیا۔ اس کے باپ شداد نے کہا کہ تو کیوں دشمنوں سے جنگ نہیں کرتا؟ عنترہ نے جواب دیا میں غلام ہوں اور غلاموں کا کام مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا اور دودھ دوھنا ہے، انہیں لڑائی سے کیا سروکار؟ باپ یہ سن کر غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور بولا ''حملہ کر تو آزاد ہے''۔ (ابوالفرج الاصفہانی۔ الاغانی ج ۷، ص ۱۴۱ وزوزنی، شرح المعلقات السبع، ص ۱۴۶)۔

[۳۱] ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ص ۱۶۲ و حاشیہ تحت صفحہ ۱۶۳ و ص ۷۰۔ ۷۱۔

[۳۲] بحوالۂ زیر نشان ۲۴۔

[۳۳] سید امیر علی متوفی ۱۹۲۷ء، Spirit of Islam۔ طبع لندن ۱۹۵۳ء صفحہ xxx (مقدمہ) و ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی، طبع دارالاشاعت، کراچی ۱۳۸۰ھ، ص ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ و سعید احمد اکبر آبادی۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ طبع ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۷۹ھ۔ ص ۲۷۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۳۔

[۳۴] یمن سے اہل حبشہ کے تسلط کو ختم کر کے ایرانیوں نے تبابعۂ یمن (یمن کے سابق شاہی خاندان) کے آخری چشم و چراغ سیف بن ذی یزن کو یمن کا حکمران بنایا۔ اس کی موت کے بعد یمن پر ایرانی قابض ہو گئے۔ یہ قابضین یہیں رہ پڑے اور مقامی آبادی سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لئے۔ اپنی انفرادیت باقی رکھنے کے لئے انھوں نے اپنے لئے ابناء الاحرار (آزاد باپوں کی اولاد) کا نام تجویز کیا جو مخفف ہو کر ابناء رہ گیا۔ ابناء نے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور صدق دل سے اسلام قبول کیا۔ فتنۂ ارتداد میں بھی، ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ صدر اسلام میں وہب بن منبہ، ہمام بن منبہ اور طاؤس بن کیسان جیسے جلیل القدر تابعی انھیں ابناء سے

تعلق رکھتے تھے (ابن ہشام السیرۃ النبویۃ ۔ج اص ۱۷، ابن جریر طبری ۔تاریخ الرسل والملوک، ج اص ۱۴۸ اور جرجی زیدان ۔تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۴، ص ۳۲۔۳۳)

[۳۵] اوس وخزرج سے مخالفت ومموالات کے باوجود یہود یثرب نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ ان کے محلے اور گڑھیاں الگ، ان کے رسم ورواج الگ اور ان کے نسلی غرور وامتیاز باقی رہے اور وہ انصار میں یا دوسرے قبائل عرب میں مدغم نہ ہوئے ۔اسی لئے ہجرت کے بعد انحضرت ﷺ نے میثاق مدینہ کے موقع پر ان سے الگ معاہدہ کیا۔ تفصیل کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ کی ''رسول اکرم کی سیاسی زندگی'' ص ۲۰۹۔۲۴۲ و فجر الاسلام ۔احمد امین ۔طبع النہضۃ المصریۃ ۔دسواں ایڈیشن ۱۹۶۵ء ص ۲۳۔۲۵ ملاحظہ فرمائیں)

[۳۶] محمود شکری آلوسی ۔بلوغ الارب ج ۳ ص ۱۸۲۔۲۱۰، جرجی زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۴ ص ۴۰)

[۳۷] ابوالفرج اصفہانی ۔الاغانی ج ۱۴ ص ۱۵۶ (سدیف بن میمون بنوخزاعہ کا مولیٰ تھا ۔اس نے یا اس کے باپ نے آل ابی لہب میں ان کی ایک مولاۃ سے شادی کر لی تھی جس کی بنا پر اس نے آل ابی لہب کی ولاء کا دعویٰ کیا اور ان کے موالی کے زمرے میں شامل ہوگیا)

[۳۸] القرآن ۔سورۃ مریم، آیت ۵، سورۃ دخان آیت ۴۱، زمخشری ۔تفسیر کشاف مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۳۶۶ھ، ج ۳، ص ۴ و ۵ و ج ۴، ص ۲۸۰، ابوتمام طائی ۔دیوان الحماسہ ج اص ۶۔

[۳۹] ابوتمام طائی، دیوان الحماسہ ج اص ۶۶

[۴۰] ابن سعد ۔الطبقات الکبریٰ، ج ۴ ص ۲۱۹، ابوالفداء، المختصر فی اخبار البشر ج اص ۱۰۷ (قبیلہ قریش کا جد اعلیٰ فہر بن مالک کا دادا نضر بن کنانہ اور بنوغفار کا مورث اعلیٰ عبد مناۃ بن کنانہ بھائی تھے ۔دونوں ہی خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کی نسل سے تعلق رکھتے تھے)

[۴۱] ابوالفرج اصفہانی ۔الاغانی ج ۱۹ ص ۹۷

[۴۲] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۳۸۸

[۴۳ و ۴۴] بنو قینقاع، خزرج کے موالی تھے۔(ابن جریر طبری ،تاریخ الرسل والملوک ج ۲ ص ۴۸۰)، بنو نضیر خزرج کے حلفاء تھے (ایضاً ص ۵۵۱) اور بنو قریظہ اوس کے موالی تھے (ایضاً ص ۵۸۴)

[۴۵۔۴۶] ابن سعد۔الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۸۹ و ابن ہشام السیر ۃ النبو یہ ج ۱ ص ۳۴۶

[۴۷] ابن جریر طبری تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۴۸۰

[۴۸] عمار بن یاسر قحطان کے قبیلہ کہلان سے تھے۔ان کے والد یاسر مکہ اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی سے محالفت وموالات کر لی اور اس کی باندی سمیہ بنت خیاط سے شادی کر لی۔انھیں کے بطن سے عمار پیدا ہوئے جنھیں ابو حذیفہ نے آزاد کر دیا۔آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام دی تو عمار اپنے والدین اور بھائی عبداللہ کے ساتھ اسلام لائے۔اس وقت تک تیس (۳۰) کے لگ بھگ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ہجرت کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔عہد فاروقیؓ میں ۲۱ھ تا ۲۲ھ ایک سال کوفہ کے والی رہے۔عہد عثمانؓ میں جو تحقیقاتی جماعت مصر گئی اس میں یہ بھی شامل تھے۔دور علوی میں جنگ جمل وصفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے اور صفین کے معرکے میں صفر ۳۷ھ میں جام شہادت نوش کیا۔۹۳ یا ۹۴ سال کی عمر پائی۔کنیت ابو یقظان تھی (ابن سعد۔الطبقات الکبریٰ۔ج ۳ ص ۲۴۶۔۲۶۴۔ابن جریر طبری تاریخ الامم والملوک ج ۴، ص ۱۴۴۔۱۶۳۔۳۴۱)

[۴۹] ابن اثیر جزری۔النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، ج ۴ ص ۳۴۵

[۵۰] مجدالدین فیروز آبادی۔القاموس المحیط مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۷۱ھ، ج ۱ ص ۸۷، ابن ہشام، السیر ۃ النبو یہ ج ۱ ص ۹۱۔۹۲ و ابن قتیبہ دینوری۔المعارف ص ۱۱۹ و تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۴، ص ۲۹ و ۳۰۔

[۵۱] سالم اصطخر کے باشندے اور حضرت ابو حذیفہ کی بیوی بُثَینہ انصاریہ کے غلام تھے۔انھوں نے سالم کو سائبۃً آزاد کر دیا، ابو حذیفہ نے انھیں اپنا متبنیٰ اور مولیٰ بنا لیا تھا اور ان کی شادی اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس سے کر دی تھی۔انھوں نے ابو حذیفہ کے ساتھ

ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہجرت کے بعد قبا میں قیام کیا اور چونکہ وہاں موجود صحابہ میں قرآن کا علم سب سے زیادہ انھیں کو تھا اس لئے مسجد قبا میں امامت نماز کے فرائض وہی انجام دیتے رہے۔ جب پیمان مواخاۃ باندھا گیا تو آنحضرت ﷺ نے انھیں حضرت ابوعبیدہ بن جراح کا بھائی بنا دیا ۱۲ھ میں جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں مہاجرین کے علم دار وہی تھے۔ نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے اپنے مولی ابو حذیفہ کے ساتھ شہید ہوئے۔ جنگ کے خاتمہ پر جب ان کی لاش کی تلاش کی گئی تو ان کا سر ابو حذیفہ کے قدموں میں تھا۔ ان کی میراث ان کی سابق آقا کے پاس بھیجی گئی مگر انھوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں نے سالم کو سائبۃً آزاد کیا تھا۔ حضرت سالم کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بوقت استخلاف فرمایا تھا کہ اگر آج سالم زندہ ہوتے تو میں انھیں مسلمانوں کا امیر نامزد کر دیتا۔ (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ۔ ج ۳ ص ۸۵۔۸۸ و ۳۴۳)

[۵۲] ابو حذیفہ کا نام ہشیم تھا۔ وہ سردار قریش عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس کے بیٹے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دار ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا وہ نہایت قدیم الاسلام صحابہ میں محسوب ہوتے ہیں۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں وہ شامل رہے۔ ہجرت مدینہ کے موقع پر سالم کے ساتھ مکہ سے نکلے اور قبا میں قیام کیا۔ عبادہ بن بشر انصاری سے ان کی مواخات ہوئی۔ جنگ بدر میں اپنے باپ عتبہ بن ربیعہ کو جو سردار قریش تھا، دعوت مبارزت دی۔ مگر آنحضرت ﷺ نے انھیں روک دیا۔ تمام غزوات میں رسالت مآب ﷺ کے ساتھ حق جاں نثاری ادا کیا۔ ۱۲ھ میں جنگ یمامہ میں جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ یا ۵۴ سال تھی (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ۔ ج ۳ ص ۸۴۔۸۵)

[۵۳] ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ ج ۳ ص ۸۶ و ابوالفرج اصفہانی، الاغانی ج ۲ ص ۱۷۰۔۱۷۱

[۵۴] ابو تمام طائی۔ دیوان الحماسہ، ج ۱ ص ۹۸۔۹۹، ۱۲۲ و ج ۲ ص ۱۶۱ و تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۴، ص ۲۳ و بعد۔

[۵۵] ڈاکٹر حمید اللہ۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ج ۱ ص ۷۰۔۷۱۔ (ماہنامہ 'آگہی' کراچی، ۱۹۹۰ء)

اسلام سے پہلے عرب کی مذہبی حالت

دنیا کے ارتقائے مذہبی کے مطالعہ کی غرض سے اگر کسی خاص قوم کے ذہنی ارتقاء کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ اس کی حیثیت تمام انسانوں کی نمائندہ ہے اور اس کے مذہبی تخیلات نوع انسانی کے بہت بڑے طبقے کے تخیلات کا آئینہ ہیں تو یقیناً اس مقصد کے لئے سامی اقوام ہی کو منتخب کرنا پڑے گا اور اس لحاظ سے کہ سامی اقوام کا مسکن اول جزیرہ نماء عرب ہے [۱] ملک عرب کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ گویا دنیا کے ذہنی واعتقادی ارتقاء کے مطالعہ کے مترادف ہوگا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ادیان عالم کی عہد بعہد کی تاریخ کو سمجھنا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب عرب قبل اسلام کی مذہبی حالت کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ اور یوں اس عہد کا مطالعۂ ادیان مقامی نوعیت اور محدود افادیت کے بجائے بین الاقوامی نوعیت اور وسیع افادیت کا حامل ہے۔

عرب قبل اسلام کو ''دور جاہلیۃ'' کہا جاتا ہے۔ اس دور کے بھی دو حصے ہیں۔ ''جاہلیۃ اولیٰ'' جو عرب بائدہ اور عرب عاربہ و مستعربہ کے حالات پر مشتمل ہے اور ظہور اسلام سے چند صدیاں قبل اس کا اختتام ہوا، دوسرا حصہ ''جاہلیۃ ثانیہ'' کہلاتا ہے جو فتح مکہ پر ختم ہوا [۲]، جہل، جہالت اور جاہلیت کے لغوی معنی بیوقوفی، سفاہت، حماقت، نادانی اور ظلم کے ہیں۔ مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم تغلبی کہتا ہے:۔

الالا یجهلن احد علینا

فنجهل فوق جهل الجاهلینا [۳]

اسی لئے جو لوگ اس لفظ ''جاہلیہ'' کے اصطلاحی معنی سے ناواقف ہیں قبل از اسلام کے عرب کو ایسی زمین سمجھتے ہیں جہاں تعقل، تفکر اور تدبر کا شائبہ بھی نہ تھا اور بقول حالی، عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا'' [۴] یہ ملک دنیا کا غیر مہذب ترین ملک اور یہ قوم دنیا کی بدترین اور پست ترین قوم تھی، حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے کیونکہ ایک ایسی قوم کو احمق، نادان اور غیر مہذب سمجھنا یقیناً درست نہیں جس کے تاجروں نے اس عہد کی دنیا کو تمدن و حضارت کے سبق سکھائے جس کے حکمرانوں نے یمن، تدمر، رقیم اور بصریٰ میں متمدن حکومتیں قائم کیں اور جس کے شعراء نے دنیا کے شعری ادب کو ایک ایسا گنجینہ بے بہاء عطا کیا جس کے سامنے قدیم یونان کے ادبی خزانے بھی بے قیمت اور بے قدر ہیں [۵] دراصل اصطلاح میں ''جاہلیہ'' سے مراد ایک ایسا دور ہے جس میں کسی ملک میں کوئی شریعت کوئی صاحب وحی نبی اور کوئی الہامی کتاب نہ ہو۔ عرب کا دور ''جاہلیہ'' دو نبیوں کا درمیانی زمانہ یا دور فترت ہے۔ یہ زمانہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا درمیانی زمانہ ہے۔ جس میں کوئی شریعت عرب میں باقی نہ رہی۔ حضرات موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی دعوات مقامی نوعیت کی تھیں یہ نبی صرف بنی اسرائیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور ان کی تعلیمات سرزمین عرب کے لئے نہ تھیں [۶] عرب ثقافت و تہذیب کے میدان میں دیگر اقوام سے پیچھے نہ تھے۔ وہ زیر نظر عہد جاہلیہ میں اپنے تہذیبی تنوع کے ساتھ ساتھ مذہبی تنوع کے لئے بھی ممتاز تھے۔ تمام جزیرہ نما مذاہب عالم کے حق میں ایک عالم اصغر تھا جس میں دنیا کے تمام طریقہ ہائے عبادت کی مختلف شکلیں موجود تھیں، ہم ذیل میں عربوں کے مختلف مذاہب اور عقائد کا ذکر کریں گے تاکہ ان کا تنوع پوری وضاحت کے ساتھ منظر عام پر آ جائے۔

۱۔ منکرین خلق، بعث اور معاد: عربوں میں ''دہریہ'' بھی تھے جو نہ خالق کائنات کو تسلیم کرتے تھے نہ بعث بعد الموت کے قائل تھے اور نہ ہی معاد پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں فطرت نے پیدا کیا اور زمانہ (دہر) ہمیں فنا

کردے گا۔ان کے خیال میں زندگی عبارت تھی طبائع محسوسہ کے عالم سفلی میں ترکیب پانے سے اور موت عبارت تھی ان طبائع محسوسہ کے انتشار سے۔ یہ ترکیب قانون فطرت کے تحت پیدا ہوتی ہے اور زمانہ اسے درہم برہم کر دیتا ہے۔اردو کے مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے انھیں خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب   موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

انہی دہریوں کا ذکر قرآن حکیم میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔

وقالوا ماھی الاحیاتنا الدنیا نموت و نحیا و مایھلکنا الاالدھر (جاثیہ ۲۴)

(ترجمہ: یہ لوگ کہتے ہیں ہماری اس دنیوی زندگی کے علاوہ اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانے سے موت آتی ہے۔)

۲۔منکرین بعث و معاد: کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خالق اور ابتدائے خلق کے تو قائل تھے مگر بعث بعد الموت کے منکر تھے ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:۔

وضرب لنا مثلا ونسی خلقه قال من یحی العظام وھی رمیم (یٰس ۷۸)

(ترجمہ:اس نے ہماری شان میں ایک عجب مثل بیان کی ،اور اپنی اصل کو بھول گیا۔کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کرے گا؟)

۳۔منکرین بعث جسمانی: عرب میں بعثِ جسمانی کے انکاری بھی موجود تھے،قرآن میں ہے۔ **ءَ اذا متنا و کنا تراباً وعظاماً أ انا لمبعوثون اَوَ اباۤؤ نا الاولون** (صافات ۱۶۔۱۷)

(ترجمہ: کفار کہتے تھے جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو کیا ہم زندہ کئے جائیں گے یا ہمارے پہلے باپ دادا؟۔)

عہد جاہلیت کا ایک شاعر کہتا ہے۔

حیاۃٌ ثم موتٌ ثم نشرٌ   حدیثُ خرافةٍ یا اُم عمرو [۷]

زندگی پھر موت، اس کے بعد نشر جان من! اس گپ کو سچ مانے گا کون؟

۴۔منکرین انبیائے کرام: عربوں میں ایسے افراد کی بھی کمی نہ تھی جو خالق، ابتدائے خلق اور معاد کے مُقر تو تھے مگر انبیائے کرام کے منکر تھے۔قرآن ان لوگوں کے بارے میں خبر دیتا ہے:۔

وقالوا ما لهذاالرسول یا کل الطعام ویمشی فی الاسواق ط لولا انزل الیه ملک فیکون معه نذیرا (الفرقان، آیت ۷)

(ترجمہ: کفار کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے۔اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا، جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈراتا۔)

۵۔منکرین بعث انبیائے بشری: کچھ عرب بعثت انبیاء کے تو قائل تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ کوئی فرشتہ نبی بنا کر بھیجا جائے۔عام انسان کو نبی کی حیثیت سے قبول کرنے پر ان کا ذہن آمادہ نہ تھا۔اللہ فرماتا ہے:۔

وما منع الناس ان یومنوا اذ جاء هم الهدیٰ الاان قالوا ابعث الله بشرا رسولا۔ (اسرا۔۹۴)

(ترجمہ: اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکی تو انھیں ایمان لانے سے صرف یہ بات مانع ہوئی کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟)

۶۔قائلین تناسخ: بعض عرب تناسخ کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ جب آدمی مر جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کا دماغ اور دیگر اعضائے جسم کا خون جمع ہو کر ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا نام ''ھامہ'' ہے اور یہ پرندہ ہر سو سال بعد قبر میں مدفون شخص کے سر کی جانب لوٹ جاتا ہے [۸] اگر صاحب قبر مقتول ہے تو یہ پرندہ اس کی قبر پر آواز لگاتا رہتا ہے۔

۷۔فرشتوں کے پرستار: عربوں میں یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور الوہیت میں اس کے شریک ہیں۔یہ لوگ فرشتوں کی عبادت

اسی خیال سے کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ان الذین لایومنون بالاخرۃ یسمون الملائکۃ تسمیۃ الانثیٰ (نجم:۲۷)

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے فرشتوں کو مونث کہتے ہیں۔

۸۔ جنات کے پجاری: بعض قبائل عرب جنات کی پرستش کرتے تھے۔ خزاعہ کی ایک شاخ جو بنو ملیح کہلاتی تھی اسی عقیدہ کی حامل تھی[۹] ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جنات کو وہ دیکھتے ہیں۔ ان سے باتیں کرتے ہیں ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں اور ان سے بچے پیدا ہوتے ہیں[۱۰] جنات کی عورتوں اور چڑیلوں کے ساتھ شادی کے بہت سے واقعات اخبار جاہلیت میں مذکور ہیں[۱۱] جن پرستی کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:۔

وجعلوا للہ شرکاء الجن و خلقھم و خرقوالہ بنین وبنات بغیر علم (انعام:۱۰۰)

(ترجمہ: اور لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور انھوں نے اللہ کے حق میں بیٹے اور بیٹیاں محض بے سند تراش رکھی ہیں۔)

۹۔ بت پرست: قدیم دنیا اور آج کی دنیا کی آبادی کے ایک معتدبہ گروہ کا محبوب ترین مذہب پرستش اصنام رہا ہے۔ انسان کی نظر پیکر محسوس کی خوگر تھی، اور بتوں کی مورتوں میں اس کی تشنگئ نظر کی سیرابی کے سامان بہم پہنچتے تھے اس نے بت تراشے ان کے آگے سربسجود ہوا اور اپنی ہی مخلوق کو خالق سمجھنے لگا۔ بت پرستی کی ترویج کا ایک سبب اعاظم پرستی بھی رہا ہے۔ ماضی میں جن لوگوں نے اپنے ملک و قبیلے کے لئے بڑے بڑے کام انجام دئے ان کے اخلاف نے ان کے مجسمے تراش کر انھیں کی پوجا شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ لات، وُدّ اور یغوث گزشتہ اقوام کے بڑے لوگ تھے جن کی یادگار کے بطور ان کے بت بنائے گئے اور مرور زمانہ کے ساتھ ان کی پرستش کی جانے لگی[۱۲] جہاں تک عرب کا تعلق ہے اس کے متعلق ہمارے مورخین کا

یہ بیان ہے کہ اہل عرب دین اسمعیلی کے پیرو تھے اور بت پرستی سے ان کا دامن عقیدت سے پاک تھا کہ بنوخزاعہ کے ایک سردار عمرو بن لحی نے جو کعبہ کا مہا پروہت بھی تھا، شام سے بت لا کر بیت اللہ میں رکھے اور اس وقت سے تمام عرب میں بت پرستی کا چلن ہوا[۱۳] ہمیں اس روایت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے گو عمرو بن لحی کا زمانہ کتب تاریخ میں متعین نہیں کیا گیا ہے مگر قرین غالب یہ ہے کہ اس کا دور اقتدار ۲۵۰ء ہوگا کیونکہ قریش کا زمانہ ۳۲۵ء متعین کیا گیا ہے [۱۴] قریش کا پردادا کنانہ اس حساب سے کہ ایک شخص کے لئے مورخین اوسطاً پچیس سال کا زمانہ فرض کرتے ہیں[۱۵] ۲۵۰ء میں برسراقتدار رہوگا۔کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس اور عمرو بن لحی بن قمعہ بن الیاس دونوں الیاس بن مضر کے پڑپوتے تھے۔[۱۶] اور دونوں کا زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے چونکہ کنانہ کا زمانہ ۲۵۰ء ہے اس لئے یہی زمانہ عمرو کا بھی ہوگا۔جن علمائے انساب نے خزاعہ کو قحطانی الاصل قرار دیا ہے ان کے بیان کے مطابق عمرو بن لحی اور کہلان کے مابین چودہ پشتیں ہیں [۱۷] کہلان نے پہلی صدی قبل مسیح میں سدمآرب کے ٹوٹنے اور اہل یمن کی تجارت پر رومیوں کے قبضے کی وجہ سے جنوب سے ہجرت کی [۱۸] کہلان کا عہد پہلی صدی قبل مسیح ہے۔اس لئے عمرو بن لحی کا زمانہ اس صورت میں بھی ۲۵۰ء کے قریب ہوگا۔حاصل بحث یہ ہے کہ اگر عمرو بن لحی کو عرب میں بت پرستی کا بانی تسلیم کرلیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ عرب میں اصنام پرستی کا آغاز ۲۵۰ء کے قریب ہوا اور اس سے پہلے سرزمین عرب میں عموماً اور آل عدنان میں خصوصاً دین اسمعیلی کی اتباع کی جاتی تھی۔ایسا تسلیم کرنا درست نہ ہوگا۔عرب کی اقوام میں عرب بائدہ (عاد، ثمود، جرہم، لحیان، طسم اور جدیس) کا وجود دو ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور ان کی عظمت کا دور ۱۷۰۰ اسو سال قبل مسیح میں ختم ہو جاتا ہے [۱۹] ان اقوام کا مذہب بت پرستی تھا اور عرب، عراق، شام، مصر جہاں جہاں یہ لوگ گئے اپنے ساتھ اس مذہب کو لے گئے [۲۰] عرب عاربہ (بنوقحطان، یعرب، حضرموت، سبا اور حمیر) جن کا زمانۂ عروج پندرہ سو سال قبل مسیح سے ۵۲۵ء تک ہے۔ بت پرست اور ستارہ پرست تھے۔ یغوث،

یعوق، نسر، عمیانس، مدان، کعیت، جلسر اور ذریح ان کے بتوں کے نام تھے اور آخری تبابعہ یمن کے قبول یہودیت کے باوجود یمن میں ستاروں کے ہیکل اور بت پرستی عام تھی [۲۱] اسی طرح عرب مستعربہ (مدین، ودان، بنو ادوم اور آل اسمٰعیل) میں بھی مرور زمانہ کے ساتھ کواکب پرستی اور بت پرستی کا آغاز کعبہ کے پتھروں کو تبرکاً اٹھا کر لے جانے اور ان کی پرستش سے ہوا۔ بنو قیدار اور انباط ۶۲۵ء ق م میں اشتار (زہرہ) کو پوجتے تھے۔ ہیروڈوٹس تقریباً ۴۰۰ء ق م میں اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ عرب الیلات اور دتل کی عبادت کرتے تھے۔ اصحاب الحجر سبا کی تقلید میں آفتاب کی پرستش کرتے تھے [۲۲]

مختصر یہ کہ عرب میں بت پرستی کا آغاز عمرو بن لحی سے بہت پہلے ہو چکا تھا، جہاں تک اس کے شام سے بتوں کے لانے کا تعلق ہے زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس نے بیت اللہ میں بت لا کے رکھے ہوں گے۔

بہر کیف بت پرستی عرب کا مقبول ترین مذہب تھا۔ بتوں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے، ان کے شاندار منڈپ بنائے گئے تھے اور ان کی خوشنودی کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ ظہور اسلام سے قبل عرب کے مختلف قبائل کے بتوں کی تفصیل کچھ یوں تھی:

(۱) بنو ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کا بت (سواع) تھا جو ینبوع کے مقام پر رہاط میں نصب تھا۔

(۲) قبیلہ کلب بن دہرہ (شاخ قضاعہ) کے بت کا نام (وَدّ) تھا جو دومتہ الجندل کے مقام میں تھا

(۳) قبیلہ طی کی شاخ انعم اور بنو مذحج کے بت کا نام (یغوث) تھا جو جرش کے مقام میں تھا۔

(۴) قبیلہ ہمداں کے بطن خیوان کا بت (یعوق) تھا جو یمن کے مقام ہمدان میں نصب کیا گیا تھا۔

(۵) حمیر کی شاخ قبیلہ ذوالکلاع کے بت کا نام (نسر) تھا جو بلخع میں تھا۔

(۶) قضاعہ کی دوسری شاخ بنو خولان کے بت کا نام (عمیانس) تھا جو سرزمین خولان میں نصب تھا۔

(۷) بنو ملکان بن کنانہ کا بت (سعد) تھا جو ایک چٹیل میدان میں ایک بڑی چٹان کی صورت میں رکھا تھا۔

(۸) قریش کا معبود اعظم (ہُبل) جوفِ کعبہ میں تھا۔

(۹) (اساف، اور نائلہ) جو مرد اور عورت کی شکل کے تھے چاہِ زم زم کے پاس نصب تھے اور یہیں قریش قربانی کرتے تھے۔

(۱۰) مقام نخلہ میں (عُزّیٰ) دیوی نصب تھی جس کی پوجا قریش اور بنو کنانہ کرتے تھے۔

(۱۱) طائف میں بنو ثقیف کا بت (لات) تھا۔

(۱۲) اوس و خزرج کی دیوی کا نام (مناۃ) تھا جو ساحل سمندر کے قریب قدید کے مقام پر نصب تھی۔

(۱۳) جبال طی یعنی سلمیٰ و آجا میں آباد قبیلہ کا بت (فلس) تھا۔

(۱۴) بنو بکر اور تغلب اور ایاد کا بت (ذوالکعبات) مقام سنداد میں تھا جو بعد میں آباد ہونے والے شہر کوفہ کے سواد میں تھا۔[۲۳].

(۱۵) آل حمیر (سبائے ثانی) شمس دیوی کی پوجا کرتے تھے۔[۲۴]

(۱۶) عبدالمدان جو یمن کا ایک قبیلہ تھا (مدان) کی پرستش کرتا تھا اور اسی نسبت سے ''مدان کے بندے'' کہلاتا تھا۔[۲۵]

(۱۷) اہل صنعا عیسائیت قبول کرنے سے پہلے (کعیت) کی عبادت کرتے تھے جو لکڑی کا تھا اور ساٹھ ہاتھ لمبا تھا۔[۲۶]

(۱۸) قبائل حضرموت اور کندہ (جلسد) نامی بت کو پوجتے تھے۔[۲۷]

(۱۹) اہل نجیر (واقع حضرموت) (ذریح) کی پوجا کرتے تھے۔[۲۸]

(۲۰) اہل نجران ایک درخت کو پوجتے تھے جس پر وہ ہر سال چڑھاوے چڑھاتے تھے [۲۹]

عرب کے طول و عرض میں متعدد بتکدے تھے جن میں بڑے بڑے بت نصب تھے۔ ان کی رکھوالی، پروہتی، اور چڑھاوے کے خاصے انتظامات تھے ان کی آبادی اور مصارف کی غرض سے لوگ اپنی زرعی پیداوار اور مال تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیتے تھے [۳۰] ان بتکدوں میں مشہور یہ تھے۔

۱۔ **غمدان:** صنعائے یمن کی مشہور عمارت تھی۔ دراصل یہ ستارۂ زہرہ کا ہیکل تھا۔ اس میں تلے اوپر سات منزلیں تھیں جو سات منازل فلکی کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اس بتکدے میں شیر کا مجسمہ تھا۔ اسے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں منہدم کیا گیا [۳۱]

۲۔ **رمام یا ریام:** یہ ہیکل بھی یمن میں تھا۔ عرب کی یہ قدیم مذہبی عمارت صنعاء کے شہر میں تھی اور قبیلہ ہمدان اس کے پروہت اور پجاری کے فرائض انجام دیتا تھا [۳۲]

۳۔ **ذوالخلصہ:** یہ ہیکل مکہ سے سات منزل کے فاصلے پر یمن میں واقع تھا اور ''کعبہ یمن'' کہلاتا تھا اس میں ہیکل کے نام کا ایک بت ایستادہ تھا جو سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا اور اس کے سر پر پتھر تراش کر منقش تاج پہنایا گیا تھا۔ دوس، خثعم اور بجیلہ کے قبائل اس کی پرستش کرتے تھے [۳۳]

۴۔ **قلیس:** یہ لفظ کلیسا کا معرب ہے اسے اہل حبش نے اپنے تسلط یمن کے زمانے میں تعمیر کیا تھا اس میں دو بت تھے جو میاں بیوی تھے۔ مرد کا نام کعیت تھا جو لکڑی کا بنا ہوا تھا [۳۴] عام روایات کی رو سے ابرہہ اکسومی نے قلیس کی تعمیر عیسائیت کی اشاعت کی غرض سے کی تھی معلوم نہیں اس میں بت کب رکھے گئے ممکن ہے اہل حبشہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد عربوں نے اس کلیسا پر قبضہ کر کے اسے بتکدہ میں تبدیل کر دیا ہو۔

۵۔ **رضاء:** یہ بنوتمیم کا بتکدہ تھا۔ اس قبیلہ کی ایک شاخ بنو ربیعہ اس کی پجاری تھی [۳۵]

۶۔ **کعبہ:** اگرچہ کعبہ بیت اللہ تھا اسے حضرت آدمؑ نے اللہ کی عبادت کی غرض سے تعمیر کیا تھا اس کی تعمیر ثانی حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی تاکہ دنیا میں اللہ کا نام لیا جائے [۳۶] مگر مرور

زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خدا کا گھر اپنے عہد کا ایک بہت بڑا بتکدہ بن گیا تھا۔اس کے پروہت بنو جرہم تھے۔ بعدازاں خزاعہ اس کے کلید بردار ہوئے اسی زمانے میں بتوں کو جگہ دی گئی ۔ پھر قریش اس کے نگراں ہوئے اور ظہور اسلام تک یہی حالت رہی[۳۷] یہ دنیا کا پہلا گھر جو اللہ کی عبادت کے لئے روئے زمین پر تعمیر کیا گیا تھا تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں کا منڈپ بن گیا تھا۔ یہ بت صرف سنگی یا گلی ہی نہ تھے بلکہ کاغذی بھی اور دیوار پر نقش کی صورت میں بھی تھے۔قریش نے تمام عرب کے لئے پر کشش بنانے کی غرض سے اس میں مسیح ومریم کی تصاویر بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ دنیا کے سب سے بڑے موحد حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کی تصاویر بھی اس مقدس گھر کے دیوار و در کی زینت بنی ہوئی تھیں۔[۳۸] قریش نے کعبہ کی سدانت ،حفاظت اور صیانت کے لئے ایک ترقی یافتہ نظام رائج کیا تھا۔اور یہ نظام مذہبی ان کے نظام اجتماعی کا جزو تھا۔قُصَی کے قائم کئے ہوئے مناصب میں سے مندرجہ ذیل عہدے خالص مذہبی تھے۔[۳۹]

۱۔سدانت: کعبے کی رکھوالی اور پروہتی

۲۔حجابت: کعبہ کی دربانی اور کلید برداری

۳۔سقایۃ: حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام کرنا۔اس غرض سے زم زم کے دوبارہ کھودے جانے سے پہلے قریش مشکیزوں میں پانی لاکر مکہ میں جمع کرتے تھے۔

۴۔رفادۃ: حجاج کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔اس کے لئے قریش اپنے قبیلے سے ایک قسم کا ٹیکس لیتے تھے۔

۵۔عمارۃ: حرم کعبہ کا عام انتظام اور دیکھ بھال کہ کوئی شخص حدود حرم میں لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ یا شوروغل نہ کرے۔

۶۔اموال محجرۃ: کعبہ پر چڑھائے جانے والے اموال کی حفاظت کا بندوبست کرنا۔

۷۔نسئی: قمری مہینوں کو کبیسہ کر کے شمسی بنانا۔[۴۰]

اس کے علاوہ قریش نے یہ طریقہ مقرر کر رکھا تھا کہ فال یا دیگر امور میں ہُبَل کے

قریب جوان کا مہادیوتا تھا۔ بذریعہ قداح قرعہ اندازی کرتے تھے[۴۱]۔اس طرح انھوں نے یہ شرط بھی عائد کردی تھی کہ جو شخص کعبہ کا طواف کرے وہ اس مقصد کے لئے قریش سے کپڑے حاصل کرے اور اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو پھر برہنہ طواف کرے۔ یا اگر اپنے کپڑوں میں طواف کرے تو طواف سے فارغ ہوکر انھیں اتار کر الگ کردے اور پھر ان کو استعمال نہ کرے۔[۴۲]

عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب اپنے بتوں پر قربانی کا چڑھاوا چڑھاتے تو ذبیحہ کو خون میں لت پت کردیتے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے ان کے مال میں اضافہ ہوتا تھا [۴۳] وہ اپنے زعم میں اپنے چوپایوں اور کھیتوں کو بتوں اور اللہ کے مابین تقسیم کرلیتے تھے۔ جو بتوں کے حصے ہوتے تھے وہ ان کے لئے مخصوص ہوتے تھے مگر جو حصہ اللہ کے لئے الگ کرتے تھے اس میں ان کے بت بھی حصہ دار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وجعلوا لله مماذرا من الحرث والا نعام نصيباً فقالوا هذا لله بزعمهم وهذا لشر كائنا فما كان لشر كائهم فلا يصل الى الله وما كان لله فهو يصل الى شر كائهم ساء ما يحكمون (انعام۔۱۳۶)

(ترجمہ: ان کفار نے اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کھیتوں اور چوپائیوں میں سے اللہ کے لئے ایک حصہ الگ کردیا ہے اور اپنے زعم باطل میں کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ حصہ ہمارے شرکاء (بتوں) کا ہے۔ جو حصہ ان کے شرکاء کا ہے اس میں سے کچھ اللہ کو نہیں پہنچتا ہے مگر جو حصہ اللہ کا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچتا ہے۔ وہ بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔)

جہاں بتوں سے عربوں کی والہانہ شیفتگی کا پتا چلتا ہے وہیں ایسے واقعات بھی نادر الوقوع نہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ اگر متوسلین کی دستاری اور معتقدین کی مقصد برآری نہ ہو تو یہ لوگ اپنے ان محبوب معبودوں کو ذلیل کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ قدیم کتب سیرت و تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملیں گے۔ عبدالملک بن ہشام صاحب السیرۃ النبویہ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک عرب اونٹ پر سوار ہوکر اپنے معبود

(سعد) کی خدمت میں آیا۔ یہ بت ارض بنی ملکان کے ایک چٹیل میدان میں ایک لمبی چٹان کی صورت میں تھا جس پر خون بہایا جاتا تھا۔اس نے چاہا کہ برکت کی غرض سے اونٹ کو بت کے پاس ٹھہرائے جب اونٹ نے مہیب خون آلود پتھر کی چٹان کو دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا اونٹ کا مالک غضب ناک ہوگیا اور اس نے پتھر اٹھا کر بت کو مارا اور بولا کہ خدا تجھ میں برکت نہ دے تو نے میرا اونٹ بھگا دیا۔ پھر اونٹ کی تلاش میں چل پڑا بڑی مشکلوں سے اونٹ اسے ملا اس کے بعد اس نے اپنے بت کی شان میں یہ ہجویہ اشعار پڑھے۔

اتینا الیٰ سعد لیجمع شملنا　　قشتتنا سعد فلا نحن من سعد

ہم سعد کے پاس جمع حال کے لیے آئے　　مگر سعد نے ہمیں پراگندہ کردیا تو ہم سعد سے بے تعلق ہیں

وھل سعدالا صخرۃ بتنو خۃ　　من الارض لا تد عولغی ولا رشد[۴۴]

اور سعد چٹیل میدان کا ایک معمولی پتھر ہے　　جو نہ تو لوگوں کو گمراہ کرسکتا ہے اور نہ ہی ہدایت دے سکتا ہے

عربی زبان کے مشہور شاعر اور خاندان کندہ کے آخری حکمران امراء القیس بن حجر کندی کا بھی اسی قسم کا ایک واقعہ کتابوں میں مذکور ہے۔اس نے اپنے باپ حجر بن عمرو کندی کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے (ذوالخلصہ) نامی بت کے منڈپ پر فال نکالی۔ فال میں لا (نہیں) نکلا اس نے ناراض ہوکر بت کو گالی دی اسے پتھر سے مارا اور مندرجہ ذیل شعر کہا۔

لو کنت یا ذا الخلص الموتورا　　مثلی وکان شیخک المقبورا

(اے ذوالخلصہ اگر تو میری ہی طرح ہوتا کہ اپنے مقتول عزیز کا انتقام نہ لے پاتا اور تیرا سردار (باپ) قتل کردیا جاتا)

لم تنہ عن قتل العداۃ زورا[۴۵]

(تو تو مجھے دشمنوں کے قتل سے منع نہ کرتا)

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتوں سے بدعقیدگی عام نہ تھی۔لوگ عموماً ان کی بڑی عزت کرتے تھے چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لات کا بت توڑا گیا تو ثقیف کی عورتیں اس پر بین کرتی تھیں[۴۶] عربوں میں عام دستور تھا کہ جب کوئی شخص سفر پر جاتا تو سب سے آخری کام جو وہ کرتا وہ بتوں کے سامنے عقیدت سے جھک کر ان کو چومنا ہوتا اور سفر سے واپس آنے پر جو کام وہ سب سے پہلے کرتا وہ یہ ہوتا کہ گھر آنے سے پہلے بت کی خدمت میں حاضری دیتا اور فرط عقیدت سے اسے چوم لیتا۔[۴۷]

۱۰۔توہمات عرب: عربوں میں توہمات کی بھی کارفرمائی تھی اگرچہ توہم پرستی انسان کی تاریخ سے کم قدیم نہیں ہے مگر عربوں کو اس وصف خاص میں بھی دیگر اقوام عالم پر تفوق حاصل تھا۔ان کی توہم پرستی کے واقعات سے عرب قبل الاسلام کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ہم ان توہمات میں سے کچھ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) عرب یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اگر میت کی قبر پر اس کا اونٹ نہ باندھا گیا تو قیامت میں وہ پا پیادہ اٹھے گا۔اور سفر آخرت طے کرنے میں اسے سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اسی لیے وہ اپنے ورثاء کو یہ وصیت کرتے تھے کہ ان کی قبر کے ساتھ ان کی سواری کا جانور باندھ دیا جائے۔یہ اونٹ اپنے مالک کی قبر پر سرنگوں باندھ دیا جاتا تھا تاآنکہ وہ مرجاتا تھا۔[۴۸]

(۲) ان کا یہ بھی خیال تھا کہ شیطان بیلوں کے سینگوں پر سواری کرتا ہے۔[۴۹]

(۳) اگر کسی کو سانپ ڈس لے اور اسے سونے کے زیور پہنائے جائیں تو وہ اچھا ہو جائے گا اور اگر سیسے کے زیور پہنائے جائیں تو وہ مرجائے گا۔[۵۰]

(۴) اظہار کبر وعجب کی غرض سے قبر پر اونٹ ذبح کرتے تھے۔[۵۱]

(۵) عربوں کا یہ بھی وہم تھا کہ آدمی کے پیٹ میں سانپ ہوتا ہے جب وہ بھوکا ہوتا ہے تو وہ سانپ اس کی پسلی اور جگر کو ڈس لیتا ہے جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔[۵۲]

(۶) جب کوئی شخص کسی بستی میں داخل ہوتا تو وہاں کی وبا یا جن کے خوف سے اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر گدھے کی آواز نکال کر چلاتا تھا تا کہ وبا یا جن بھاگ جائے۔ [۵۳]

(۷) اگر کسی مریض کے متعلق یہ خیال ہو جاتا کہ اس پر بُری ارواح کا سایہ ہے یا اس پر جنون کا اثر ہو گیا ہے تو اسے گندا کر دیتے اور مردوں کی ہڈیاں اس کے گلے میں ڈال دیتے۔ [۵۴]

(۸) کوّے کو نہایت منحوس خیال کرتے تھے۔ [۵۵]

(۹) مرغ، کوّے، کبوتری، خرگوش، شتر مرغ، سانپ اور چوہے کو جنات یا ان کی سواری کہتے تھے۔ [۵۶]

(۱۰) اگر بادشاہ یا سردار بیمار پڑتا تو اسے کاندھوں پر بٹھا کر لیئے لیئے پھرتے اور یہ خیال کرتے کہ اس طرح وہ اچھا ہو جائے گا۔ [۵۷]

(۱۱) اگر کسی پر عشق کا دورہ پڑتا تو اسے پیٹھ پر سوار کر کے اس کے جسم کو لوہے سے داغ دیتے اور یوں عشق کا بھوت بھاگ جاتا تھا۔ [۵۸]

(۱۲) اگر کوئی اونٹنی پانچ بچے جنتی اور آخری بچہ نر ہوتا تو اس کے کان پھاڑ کر اسے چھوڑ دیتے پھر نہ تو وہ ذبح کی جاتی اور نہ اس پر سواری کی جاتی نہ کسی چشمے پر پانی پینے سے اور کسی چراگاہ میں چرنے سے روکی جاتی تھی۔ ایسی اونٹنی کو (بحیرہ) کہتے تھے۔ [۵۹]

(۱۳) اسی طرح اگر کسی اونٹنی کے دس مادہ بچے پیدا ہو جاتے تو اسے آزاد کر دیتے تھے اس پر سواری نہ کرتے تھے اس کے بال نہ کاٹتے تھے اور اس کا دودھ صرف مہمانوں کے پینے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اسے (سائبہ) کہتے تھے۔ [۶۰]

(۱۴) وہ بکری جو سات بار صرف مادہ جوڑے جنتی اور آٹھویں بار نر و مادہ جنتی تو اس کا دودھ پینا عورتوں پر حرام تھا۔ اس بکری کو (وصیلہ) کہا جاتا تھا۔ [۶۱]

(۱۵) جب کسی اونٹ کے بچے کا بچہ جوان ہو جاتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور وہ آزادی

کے ساتھ جہاں چاہتا چرتا پھرتا۔ایسے اونٹ کو (حامی) کہتے تھے۔[۶۲]

۱۱۔کاہن اور لال بجھکڑ: عربوں کے مذہبی معتقدات میں کاہن، قائف، عائف، زاجر، عارف اور ہاتف کو بھی بڑا دخل تھا۔اس لئے ان لوگوں کا مجملاً ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔کاہن: کہانت کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں۔کہا جاتا ہے عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بعض کاہنوں کو جن آسمان کی باتیں بتاتے تھے۔بعض کو جن دنیا کے وہ حالات آ کر بتا جاتے تھے جو عموماً لوگوں سے پوشیدہ ہوتے تھے۔بعض کاہن محض گمان اور قیاس سے باتیں بتاتے تھے۔کبھی کبھی یہ کاہن اپنی ہوشیاری اور تجربہ سے بات کی تہہ تک پہنچ کر سائل کو اس کے سوال کے تشفی بخش جواب دیتے تھے۔ یہ بھی عقیدہ تھا کہ کاہن کے پاس ایک جن بطور موکل ہوتا ہے اور وہ اسے غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ یہ کاہن علم نجوم کے بھی ماہر ہوتے تھے اوراس کی مدد سے بھی لوگوں کوغیب کی باتیں بتانے کا دعویٰ کرتے تھے۔کاہنوں میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ طریفہ اور زبراء عرب جاہلیت کی مشہور کاہنہ گزری ہیں۔کاہنوں نے سوالات کے جوابات دینے کے عجیب وغریب طریقے اپنا رکھے تھے۔مثلاً کنکریاں اٹھا لیتے انھیں گنتے پھر رگڑتے اور انھیں بجا کر بات کی تہہ تک پہنچتے۔اسی طرح ریت یا نرم زمین پر تیزی کے ساتھ لکیریں کھینچتے پھر انہیں ایک ایک کر کے مٹاتے اور یوں سوال کا جواب معلوم کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔دانوں سے بھی مدد لیتے تھے۔غرض عوام کو دھوکا دینے کے بہت سے ہتھ کنڈے ان کاہنوں نے گڑھ رکھے تھے۔[۶۳]

۲۔قائف: قیافہ شناسی عربوں میں نہایت قدیم زمانے سے رائج تھی۔قیافہ شناس کو (قائف) کہتے تھے۔یہ انسان کے چہرے بشرے سے حالات کا پتا چلاتے تھے۔عموماً قیافہ شناس اور کاہن ایک ہی شخص ہوتا تھا۔[۶۴]

۳۔عائف: عیافہ شناس یا عائف اسے کہتے تھے جو نشانات قدم اور ایسے ہی دیگر آثار سے باتوں کی تہہ تک پہنچ کر ان کے جوابات دیتا تھا۔[۶۵]

۴۔ زاجر: جانوروں کی آوازیں، ان کی حرکات، سکنات اور دیگر احوال سے حادثات کا پتا لگانے اور غیب کی خبر دینے والوں کو زاجر کہتے تھے۔ [۶۶]

۵۔ عراف: عرافہ بھی غیب دانی کے اداروں میں شمار ہوتی تھی۔ عراف امور منتفسرہ میں اسباب و مقدمات سے استدلال کرتا تھا۔ عرافت اور کہانت میں یہ فرق تھا کہ عرافہ کا تعلق ماضی کی باتوں سے ہوتا تھا اور کہانت کا مستقبل کی باتوں سے۔ عرافت کی یہ بھی تعریف کی گئی ہے کہ حوادثات گزشتہ اور واقعات آئندہ کے مابین اگر کوئی مناسبت، مشابہت، اختلاط یا ارتباط خفی ہو تو اس سے استدلال کی بنا پر فیصلہ صادر کیا جائے۔ [۶۷]

۶۔ ہاتف: کبھی کبھی اہم امور کا فیصلہ ایسی آواز بھی کر دیتی تھی جس کے بولنے والے کی صورت غیر مرئی ہوتی تھی۔ عموماً یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہاتف جن یا مُردوں کی ارواح ہیں۔ [۶۸]

۱۲۔ مشرک: عرب کا سب سے وسیع الاثر مذہب شرک تھا۔ شرک کے معنی ہیں ایک اللہ کو مان کر صفات میں اوروں کو اس کا شریک گردانتا۔ عرب میں زیادہ تر اسی عقیدہ کے لوگ تھے جو اللہ کے ساتھ ساتھ اصنام، جنات، فرشتوں یا کواکب کو الوہیت کی صفات سے متصف کرتے تھے۔ قرآن میں ہے:

اذادعی اللہ وحدہ کفرتم وان یشرک بہ تؤمنوا (مومن۔۱۲۰)

(ترجمہ: جب اللہ کا تنہا ذکر کیا جاتا ہے تو تم اس کا انکار کر دیتے ہو اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کر لیا جاتا ہے تو تم اس پر ایمان لے آتے ہو۔)

۱۳۔ مجوس: مجوسیت ایران کا سرکاری مذہب تھا۔ اہل ایران کے سیاسی اثرات سرزمین عرب پر کافی گہرے تھے۔ یمن، حضرموت، بحرین، اور حیرہ ان کی حکومت کے براہ راست یا بالواسطہ زیر اثر رہے مگر ایران کے مذہبی اثرات عربوں پر کم پڑے صرف قبیلہ بنی تمیم کے کچھ لوگ مجوسی ہو گئے تھے۔ [۶۹]

۱۴۔ صابئ: ستارہ پرستی قدیم اہل بابل کا مذہب تھا۔ بابل کے یہ قدیم باشندے بھی

سامی الاصل ہی تھے عربوں میں بالعموم اور یمن کے قحطانیوں میں بالخصوص ستارہ پرستی کا رواج تھا۔ بہت سے ہیکل مختلف ستاروں کے نام پر قائم تھے۔ عربوں نے تمام طبعی کاروبار ان ستاروں کے طلوع وغروب سے وابستہ کر رکھے تھے [۷۰]۔ ان کا خیال تھا کہ منازل قمر کے ۲۸ ستاروں میں سے جب ایک ڈوبتا ہے تو جب تک دوسرا ستارہ اس کے مقابل میں طلوع نہ ہو اس کا عمل قائم رہتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف یہ کہ تقسیم زمانہ پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ سرسبزی، قحط سالی، حادثات اور دیگر انسانی اعمال پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں [۷۱] قرآن کی یہ آیت (فلا اقسم بمواقع النجوم) اس عقیدے کی تردید کرتی ہے [۷۲] اگرچہ صابئ عرب میں موجود نہ تھے مگر ان کے معتقدات کا عربوں پر اثر تھا چنانچہ یمن کے حمیری آفتاب پرست تھے۔ شمال کے بنو کنانہ قمر پرست تھے [۷۳] قبائل لخم، خزاعہ، قریش اور قیس شعریٰ کی پرستش کرتے تھے [۷۴] بتکدہ غمدان ستارہ زہرہ کا ہیکل تھا۔ جسے منازل فلکی کے لحاظ سے سات طبقوں میں بنایا گیا تھا۔

۱۵۔ حنیف: عربوں کے نزدیک حنیف حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا اس لئے انھوں نے دین ابراہیمی کو حنیفیت کا نام دیا تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ عربوں نے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی تعلیمات کو طاق نسیاں کی نذر کر دیا اور بت پرستی و ستارہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے باوجود عرب میں بعض ایسے نیک دل افراد موجود تھے جو تلاشِ حق میں بیتاب اور ملت ابراہیمی کے عقائد حقہ کی جستجو میں سرگردان رہتے تھے [۷۵] آغازِ اسلام کے وقت عرب میں قس بن ساعدہ ایادی، ورقہ بن نوفل قریشی اور زید بن عمرو بن نفیل قریشی تلاش حق میں نکلے تو انہیں ملت حنفی ہی کے دامن میں پناہ ملی مگر ملت حنیفی کے عقائد سے کوئی واقف نہ تھا باوجود تلاش بسیار کے اس دین ابراہیمی کے عقائد و اصول عربوں کو صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے تھے۔ [۷۶]

۱۶۔ یہود: اگرچہ یہود کا مذہب نسل اسرائیل کا مذہب ہے۔ اور اس کا موطن اصلی ارضِ کنعان ہے مگر عرب میں بھی یہود کی آبادی تھی۔ یمن کے تبابعہ نے یہودیت اختیار کر لی

تھی۔ بنو کنانہ، بنی حارث بن کعب اور کندہ کے قبائل میں بھی یہودی موجود تھے۔ یثرب سے شام تک یہود کے قلعے اور منظم آبادیاں تھیں۔ حجاز و تہامہ میں ان کے مضبوط قلعے اور تجارتی گودام تھے۔ خیبر، فدک، وادی القریٰ وغیرہ ان کی مشہور بستیاں تھیں۔ عربوں کے مذہبی عقائد سے یہ یہود بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی عربوں کو اپنے عقائد سے متاثر کیا۔[۷۷] عرب میں یہود کا ایک فرقہ صدوقی تھا جو عزیر کو خدا کا بیٹا کہتا تھا[۷۸] قرآن نے اسی عقیدہ کا ذکر اس آیت میں کیا ہے۔(وقالت الیهود عزیر ابن الله)(التوبہ آیت ۳۰)

۱۷۔عیسائی: سلطنت روم وحبشہ کا سرکاری مذہب عیسائیت تھا۔شام کی سرحدت پر آباد عرب قبائل نے بالعموم عیسائیت قبول کر لی تھی۔غسان، لخم، جذام، مذحج عیسائی تھے۔ عراق میں تنوخ اور تغلب کے قبائل نے بھی عیسائیت قبول کر لی تھی۔ حیرہ کے آل منذر میں بھی بعض فرمانروا عیسائی تھے۔ یہاں عیسائیوں کے گرجے تھے اور ان کی خاصی آبادی تھی یہ عیسائی عبادی کہلاتے تھے۔ طے کا قبیلہ جو نجد میں آباد تھا، عیسائی تھا۔یمن میں نجران ان عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔خود قریش میں بنو اسد کے بعض افراد عیسائی تھے۔عیسائیوں کو کعبہ کی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے قریش نے خانہ کعبہ میں مریم و مسیح کی تصاویر بھی رکھدی تھیں۔ عرب میں نسطوری، یعقوبی، مارونی اور ملکانی (کیتھولک) فرقے کے عیسائی موجود تھے[۷۹] ان میں سے مارونی فرقے کا عقیدہ تھا کہ مریم بھی الوہیت میں شریک ہیں۔قرآن اسی عقیدے کی یوں تردید کرتا ہے۔

یا عیسیٰ بن مریم أ انت قلت الناس اتخذونی وامی الٰهین من دون الله

(المائدہ آیت ۱۱۶)

(ترجمہ: (اللہ پوچھے گا) اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ؟۔)

قرآن میں ہے کہ فرقہ یعقوبی کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح ہی خدا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ هو المسیح بن مریم (مائدہ ۷۲)

(ترجمہ: ان لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ صرف مسیح بن مریم ہے۔)

ملکانی اور نسطوری یہ کہتے تھے کہ خدا تین میں تیسرا ہے قرآن میں ان کے عقیدہ کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثة وما من الہ الا الہ واحد (مائدہ۔۷۳)

(ترجمہ: وہ لوگ کافر ہو گئے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے حالانکہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔)

حواشی:

[۱] سید سلیمان ندوی: ارض القرآن مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء ج ۱ ص ۱۰۷۔۱۱۶

[۲] جرجی زیدان: تاریخ التمدن الاسلامی، مطبوعہ دار الہلال مصر ۱۹۵۸ء ج ۱ ص ۳۲۔ محمود شکری آلوسی، بلوغ الارب مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۴۳ھ ج ۱ ص ۱۵

[۳] ابوعبداللہ زوزنی: شرح المعلقات السبع، مطبع مصطفیٰ بابی حلبی مصر ۱۳۷۵ھ ص ۱۳۶

[۴] الطاف حسین حالی: مسدس حالی، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۷ء ص ۷

[۵] ہٹی: تاریخ عرب، (انگریزی) مطبوعہ نیو یارک ۱۹۵۸ء ص ۸۷

[۶] ایضاً و بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۸۶

[۷] عبدالکریم شہرستانی: الملل والنحل، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۸۱ھ ج ۲ ص ۲۳۶

[۸] الملل والنحل، ج ۲ ص ۲۳۷ و بلوغ الارب ج ۲ ص ۳۱۱

[۹] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۰۷

[۱۰] ایضاً ج ۲ ص ۳۴۰

[۱۱] قبیلہ بنو عمرو بن یربوع کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی ماں ایک چڑیل تھی جس سے ان کے

باپ نے شادی کی تھی ۔قبیلہ جرہم کے بارے میں داستان تراشی گئی ہے کہ ان کا باپ ایک فرشتہ تھا جسے نافرمانی کی پاداش میں زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔مشہور جاہلی شاعر عبید بن ابرص کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ سفر شام کے دوران میں ایک مرد شجاع سے اس کی ملاقات ہوئی جو پیاس سے بے حال تھا اس نے اسے پانی پلایا اور اپنی راہ لی واپسی پر اس کا اونٹ گم ہو گیا وہ سنسان بیابان میں سرگرداں تھا کہ مرد شجاع کی قوت سے جو دراصل جن تھا اس کا اونٹ مل گیا اور وہ اس پر سوار ہو کر چشم زدن میں بیس مرحلے کی طویل مسافت طے کر کے اپنے گھر پہنچ گیا (بلوغ الارب ج ۲ ص ۳۴۰ـ۳۴۱، ۳۴۸، ۳۵۵۔

[۱۲] ارض الاقرآن ، ج ۲ ص ۱۰۲۔

[۱۳] عبدالملک بن ہشام: السیرۃ النبویہ، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی مصر، ۱۳۵۵ھ ج ۱، ص ۷۸، ۷۹

[۱۴ـ۱۵] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۱۳

[۱۶] السیرۃ النبویہ، ج ۱ ص ۷۷، ۷۸

[۱۷] ابوالفداء: المختصر فی اخبار البشر مطبوعہ حسینیہ مصر، ۱۳۲۵ھ ج ۱ ص ۱۰۱

[۱۸] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۱۳

[۱۹] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۳۰

[۲۰] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۶۳

[۲۱] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۲۷، ۱۷۹

[۲۲] ارض القرآن ، ج ۲ ص ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۸۹

[۲۳] ابن ہشام ج ۱ ص ۸۰، ۸۹؛ ۹۱

[۲۴] ابن جریر طبری: تاریخ الرسل والملوک، مطبوعہ دارالمعارف مصر، ۱۹۶۱ء ج ۲ ص ۱۱۱

[۲۵] یاقوت حموی: معجم البلدان، مطبوعہ سعادت مصر ۱۹۰۶ء ج ۷ ص ۴۲۲

[۲۶] معجم البلدان ، ج ۷ ص ۱۵۶

[۲۷] معجم البلدان ، ج ۳ ص ۱۲۲

[۲۸] معجم البلدان ، ج ۴ ص ۱۲۵

[۲۹] تاریخ الرسل والملوک ج ۲ ص ۱۲۱

[۳۰] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۸۱

[۳۱] معجم البلدان ج ۶ ص ۳۰۱

[۳۲] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۹

[۳۳] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۸

[۳۴] معجم البلدان ج ۷ ص ۱۵۶

[۳۵] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۸ـ۸۹

[۳۶] آل عمران آیت ۹۶ والبقرہ آیت ۱۲۷ والملل والنحل ج ۲ ص ۲۳۲۔۲۳۳

[۳۷] السیرۃ النبویہ ج ا ص ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۴

[۳۸] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۹۷

[۳۹] ڈاکٹر محمد حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی، مطبوعہ مکتبہ ابراہیمہ، حیدرآباد دکن (بار دوم) ج۔ا، ص ۴۵۔۵۸

[۴۰] عربوں کا قاعدہ یہ تھا کہ ہر تیسرے سال ایک تیرھویں مہینہ کا اضافہ کردیتے تھے جو ذوالحجہ اور محرم کے درمیان ہوتا تھا اس کا اعلان حج کے موقع پر کیا جاتا تھا۔ یہ اضافہ شدہ مہینہ حرام نہ ہوتا تھا اس لئے اس کی وجہ سے تین حرام مہینوں (ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) کا تسلسل ٹوٹ جاتا۔ حرام مہینوں کی تعداد پوری کرنے کے لئے آئندہ مہینے یعنی صفر کو حرام قرار دیتے تھے جو عام حالات میں حرام مہینہ نہ تھا۔ نسئی کے متعلق ارشاد باری ہے (انما النسئی زیادۃ لی فی الکفر یضلُ به الذین کفروا یحلونه عاماً ویحرمونه عاماً لیواطئوا عدۃ ماحرم اللہ فیحلوا ما حرام اللہ) بیشک نسی کفر میں اور ترقی ہے جس سے کفار گمراہ ہوتے ہیں وہ اس حرام مہینہ کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں تا کہ اللہ نے جو مہینے حرام کئے ہیں ان کی گنتی پوری کر لیں پھر اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں (الملل والنحل ج ۲ ص ۲۴۸۔ السیرۃ النبویہ ج ا ص ۴۵ مرزوقی: الازمنہ والامکنہ ج ا ص ۸۸۔۹۰، القرآن، سورۃ توبہ آیت ۳۷۔

[۴۱] قریش کا قاعدہ تھا کہ جنگ، سفر، شادی، بیاہ، ختنہ، تعمیر، دیت، کنویں کی کھدائی، دفن واثبات نسب کے امور درپیش ہوتے تو اپنے معبود اعظم ہبل کے پاس سو درم اور ایک قربانی کا جانور لے کر جاتے اور ان چیزوں کو فال نکالنے والے شخص کو دیتے اور اس سے فال نکالنے کی استدعا کرتے جس شخص سے متعلق فیصلہ چاہتے اسے بت کے سامنے کرتے اور کہتے اے ہمارے معبود یہ فلاں ابن فلاں ہے ہم نے اس کے بارے میں ایسا ارادہ کیا ہے اس لئے اس کے متعلق سچی بات ظاہر کردے، پھر فال والے سے کہتے کہ فال نکال دو وہ جو فال نکالتا اس پر عمل کرتے۔ فال کے مقصد سے ہبل کے پاس سات پیالے تھے جن میں سے ایک پر (دیت) دوسرے پر

(ہاں) اور تیسرے پر (نہیں) چوتھے پر (تم میں سے) پانچویں پر (مجہول النسب) چھٹے پر (تمہارے غیروں میں سے) اور ساتویں پر (پانی یا چشمہ) تحریر تھا اور اس مضمون کی پرچیاں ان پیالوں پر رکھی ہوتی تھیں حسب ضرورت متعلقہ پیالوں سے فال نکالی جاتی تھی۔ (السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۱۶۰، ۱۶۱ و بلوغ الارب ج ۳ ص ۶۶، ۶۷)

[۴۲] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۱۴ [۴۳] الملل والنحل ص ۲ ص ۲۸

[۴۴] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۳

[۴۵] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۸، ۸۹، بلوغ الارب ج ۲، ص ۲۰۷ و ج ۳، ص ۶۷

[۴۶] تاریخ الرسل والملوک ج ۲ ص ۱۱۰ [۴۷] السیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۵

[۴۸] الملل والنحل ص ۲ ص ۲۴۴، ایسے اونٹ یا اونٹنی کو "بلیہ" کہتے تھے مرنے کے بعد کبھی اسے جلا بھی دیتے تھے۔، بلوغ الارب ج ۲ ص ۳۰۷

[۴۹۔۵۲] بلوغ الارب ج ۲، ص ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۵، ۳۱۹، ۳۴۴، ۳۶۰ (بالترتیب)

[۵۳۔۵۶] بلوغ الارب ج ۲، ص ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۳ و ۳۱۵، ۳۱۹، ۳۴۴، ۳۶۰ (بالترتیب)

[۵۷] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۰ [۵۸] ایضاً ج ۲ ص ۳۲۱

[۵۹] بحیرہ وغیرہ کی تعریف میں شدید اختلافات ہیں مگر تمام تعریفوں کا ماحصل یہی ہے کہ کثرت اولاد کی بنا پر اونٹنی کو کچھ مراعات دیدی جاتی تھیں، اور اس کے علاوہ ان جانوروں کی حیثیت بتوں کے چڑھاوے کی ہوتی تھی اور ان کو احتراماً آزاد کر دیا جاتا تھا (بلوغ الارب ج ۳ ص ۳۶۰)

[۶۰] سائبہ کی تعریف میں بھی اختلافات ہیں یہ اونٹ یا اونٹنی بتوں کے پروہتوں کو بطور نذر دے جاتے تھے (بلوغ الارب ج ۳ ص ۳۷)

[۶۱] وصیلہ کی بھی مختلف تعریفیں ہیں (بلوغ الارب ج ۳ ص ۳۷)

[۶۲] ایضاً ج ۳ ص ۳۸

[۶۳] ایضاً ج ۳ ص ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۳، ۲۸۸

[۶۴] بلوغ الارب ج ۳ ص ۲۶۱ [۶۵] ایضاً ج ۳ ص ۲۶۱

[۶۶] ایضاً ج ۳ ص ۳۰۷

[۶۷] ایضاً ج ۲ ص ۲۷۴، ۲۷۵

[۶۸] مرتضیٰ زبیدی: تاج العروس من جواہر القاموس مطبوعہ مطبع خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ ج ۲ ص ۲۷۲

[۶۹] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۳۵

[۷۰] الازمنہ والامکنہ ج ۱ ص ۱۷۸

[۷۱] ایضاً ج ۱ ص ۴۸

[۷۲] الواقعہ آیت ۷۵

[۷۳] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۰۳

[۷۴] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۳۹

[۷۵] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۲۷

[۷۶] زید بن عمرو حضرت عمرؓ کے برادر عم زاد اور مشہور صحابی حضرت سعیدؓ بن زید کے والد تھے۔ انھوں نے بت پرستی سے توبہ کی، رسوم جاہلیت سے قطع تعلق کر لیا۔ دین ابراہیمی کی تلاش میں مکہ سے نکل کر عرب، جزیرہ، عراق و شام کے چکر کاٹے، راہبوں اور احبار سے اس کے اصول دریافت کئے مگر کچھ پتا نہ چلا آخر کار دمشق کے قریب مقام بلقاء کے راہب نے نبی آخر الزماں کی بعثت کی بشارت دی، زید بسرعت مکہ لوٹے مگر راستہ میں شام میں بنولخم نے انھیں قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا زید قیامت میں تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔ والسیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۲۳۹۔۲۴۷

[۷۷] بلوغ الارب ج ۲ ص ۲۴۱

[۷۸] ابن حزم ظاہری الفصل فی الملل والاہواء والنحل، مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ ج ۱ ص ۹۹

[۷۹] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۰۷، ۲۰۸۔

(ماہنامہ بینات، کراچی ۱۹۷۰ء)

OOO

نظامِ خلافت کا تاریخی ارتقاء

(از ۱۱ھ تا ۱۳۲ھ یعنی آغاز سے عہد اموی کے اختتام تک)

اسلام کے نظامِ سیاسی سے ہماری مراد نظامِ خلافت و امامت ہے۔ ہم اپنی بات چیت کو اس تک محدود رکھیں گے اور اس کے بعد عہد بعہد کے تطورات و تغیرات سے بحث کریں گے۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ہم سیاسی عمل سے اصول اخذ کریں گے اور اپنی جانب سے اصولِ موضوعہ قائم کر کے عمل سیاست کاری کو اس کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کریں گے، ہم امت مسلمہؒ کے تعامل اور ہر عہد کے سیاسی اعمال واوضاع سے اصول مستنبط کرنے کی امکانی سعی کریں گے۔

قرآن مجید میں خلافت سے متعلق کوئی مکمل ضابطہ اور جامع اصول موجود نہیں ہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید انسانوں کے اخلاق اور ان کے عقائد و عبادات کی تنزیہہ اور تزکیہ اور ایک صالح معاشرہ کے قیام کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا بنیادی مقصد ایک اعلیٰ وارفع معاشرہ کا انصرام وانتظام ہے۔ یہ معاشرہ ایسا ہو جہاں محاسنِ اخلاق کی آبیاری کی جاتی ہو اور جہاں لوگ صحیح عقائد اور منصفانہ طرز بود و ماند کے اصول پر کاربند ہوں۔ یہ معاشرہ دنیا میں بھلائی (معروف) کو پنپنے اور برائی (منکر) کو روکنے میں سرگرم ہو اہل ایمان اس کے لیے ذمہ دار ہوں اور اہل عالم کے اعمال وافعال پر شاہدِ عدل بھی ہوں [۱]۔ یہی سبب ہے کہ قرآن مجید میں خلیفہ کے انتخاب، اس کے اوصاف، اسے منتخب کرنے والوں کے اوصاف، حکومت، اس کے محکموں

وغیرہ کے متعلق کوئی بلاواسطہ ذکر نہیں ہے۔ اُن قرآنی آیات سے جو ایک صالح معاشرہ کے قیام کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ہم کچھ قواعد اور اصول ضرور مستنبط کر سکتے ہیں، اور چونکہ ایک صالح وکارگزار معاشرہ کے بارے میں اسلام جو کچھ چاہتا ہے، اس میں ''سیاسی قوت'' بھی شامل ہے، اور وہ اس لیے کہ اس کے بغیر کسی بھی معاشرہ کی بقاء ممکن نہیں ہے۔ یوں قرآن مجید میں ہمیں سیاست کاری کے اصول مل جاتے ہیں، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسرے حیوانات کے مانند پابند اور بے اختیار نہیں پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسے بہت زیادہ بااختیار بھی نہیں بنایا ہے۔ اسے عقائد صحیحہ اور محاسن اخلاق پر عمل پیرا ہونے کا پابند بھی کیا گیا ہے اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنے معاملات کو سرانجام دے اور اپنے لیے ایک عادلانہ نظام سیاست کاری وضع کرے۔ سیاست کاری کی تاریخ انسانی ارتقاء کی تاریخ کے تابع ہے۔ اس بناء پر ایسا ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو کسی مخصوص اصولِ سیاست کاری کا پابند کر دیتا اور وہی اصول ہر دور اور ہر حال میں نافذ العمل قرار پاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جو پہلے تھا وہ آج نہیں ہے اور وہ جیسا آج ہے، کل ویسا نہیں رہے گا۔ چونکہ انسانی معاشرہ ترقی پذیر ہے اور اس کی تاریخ تغیر پذیری اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی طویل اور غیر مختتم داستان ہے، اس لیے اگر اسلام ایک مخصوص نظام حکومت ومملکت پندرہ سو (۱۵۰۰) سال پہلے متعین کر دیتا، تو تمام انسانی ترقیاں رک جاتیں اور تہذیب وتمدن کا ارتقاء ممکن نہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کاری کے نظام کے وضع کرنے کا اختیار اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دیا ہے [۲]۔ اس طریقہ سے نوعِ انسانی کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے، مگر اس کی خام خیالیوں اور بشری کمزوریوں سے کچھ نقصان بھی پہنچے۔ ہماری تاریخ کے طالب علم کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلا اختلاف اسی مسئلۂ خلافت وجانشینیٔ رسول ﷺ سے متعلق پیدا ہوا۔ اور یہی وہ سب سے اہم مسئلہ تھا جو بعد میں اسلامی فرقوں کے وجود میں آنے کا سب سے بڑا سبب ٹھہرا [۳]۔ یہ ابتدائی سیاسی

اختلافات، سیاسی احزاب کی صورت میں ظاہر ہوئے اور مخصوص سیاسی اھواء واغراض رکھنے والے لوگ ایک ''حزب'' یا گروہ کہلائے۔ مگر جلد ہی یہ سیاسی دھڑے بندی مذہبی فرقہ میں بدل گئی۔ اور اپنے کو دوسروں سے ممتاز کرنے کی کوشش میں مفروضہ ومزعومہ اختلافات پیدا کیے گئے۔ فروعی تنازعات کھڑے کرکے اپنے علیحدہ تشخص کے لیے جواز پیدا کیا گیا۔ پھر بتدریج ان فروعات کو اصول میں تبدیل کردیا گیا، اور انہیں اسلام کے اساسی ارکان وعقائد سے مماثل قرار دیا گیا[۴]۔ حتیٰ کہ ''توحید باری'' پر بھی حرفی وفرضی اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا۔ معتزلہ اور ان کے مخالفوں نے ذات وصفات باری تعالیٰ کی نظری بحثوں کو جزوِ ایمان بنا کر تکفیر وتضلیل کے فتوے صادر کرنے شروع کیے اور نوبت قتل وغارت گری تک پہنچ گئی۔[۵]

قصہ مختصر جناب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً ہی بعد مسلمانوں میں تین (۳) گروہ بن گئے، جن میں ایک گروہ انصار مدینہ کا تھا، جس میں زیادہ تر قبیلہ خزرج کے سربرآوردہ لوگ تھے، دوسرا گروہ حضرت علیؓ کے حامیوں کا تھا، جس میں بنو ہاشم اور بنوعبد مناف کے کچھ افراد شامل تھے اور تیسرا اور سب سے بڑا گروہ مہاجرین کا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو السابقون الاولون مہاجرون صحابہ کی خلافت کے لیے بڑے پرزور دلائل دینے پڑے اور ایک مدلل بحث کے بعد ان کے استدلال کو سقیفہ بنی ساعدہ میں حاضر اصحاب نے تسلیم کیا اور اس کے بعد ان کی احقیت واولویت کے باعث لوگوں نے انہیں (حضرت ابو بکر صدیقؓ کو) خلیفہ منتخب کرکے ان کی بیعت کرلی[۶]۔ صحابہ کرام کے اس تعامل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں جانشینی کے بارے میں کوئی واضح اور طے شدہ حکم موجود نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں بعض لوگ اسے خاندانی میراث قرار دیتے تھے اور اسے بنو ہاشم اور ان کے نمائندہ حضرت علیؓ کا حق سمجھتے تھے۔ دوسرا گروہ خلافت کے لیے انصار مدینہ کو حق دار سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہی تھے جنہوں نے اسلام کو ایک مرکز وماویٰ فراہم کیا تھا۔ تیسرا گروہ مہاجرین صحابہؓ کا تھا، جو سبقت الی الاسلام، جاں نثاری اور جاں فشانی کے باعث اللہ

کے دین کی تائید ونصرت میں تمام اصحاب سے بڑھ کر تھا۔ یہ گروہ اسلام کی خاطر سب سے زیادہ قربانی دینے، جناب رسول اللہ ﷺ کی سب سے زیادہ نصرت و تائید کرنے اور اکابر قریش سے تعلق رکھنے کے سبب، امت کی امامت اور رسول اللہ ﷺ کی نیابت و جانشینی (خلافت) کا سب سے بڑھ کر مستحق خیال کیا جاتا تھا[۷]۔ یہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کے موقع پر کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہ تھا کہ امت میں سے کون سے افراد امامت کے بارے میں رائے دینے کے مجاز ہیں اور انہیں امام و خلیفہ کے تقرر کا سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ یہ بات قریب قریب حتمی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ اور مسجد نبویؐ میں انتخاب امام وخلیفہ سے متعلق پہلے سے کوئی طے شدہ اصول موجود نہ تھا، بلکہ یہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا اجتہاد تھا جسے صحابۂ کرام نے قبول کیا اور یوں اصول اجماع کے تحت ان کا تقرر جائز قرار پایا۔ یوں حالات پیش آمدہ کے تحت امام وخلیفہ کا تقرر اجتہاد سے طے پایا اور انصار کے ایک نمائندہ حضرت سعد بن عبادہؓ کے سوا کسی صاحب نے اس انتخاب سے اختلاف نہ کیا جہاں تک حضرت علیؓ کا تعلق ہے، تو ایک روایت کی رو سے انہوں نے بیعت عامہ کے موقع پر دوسرے اصحاب کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کرلی تھی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد خلیفۃ الرسول کی بیعت کی[۸]۔ لیکن کسی معتبر تاریخ سے ان کے ادعاء خلافت کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے دعویٰ خلافت کی داستان بعد کے وضاعین کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ بلکہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض حضرات کے مشورہ پر اپنی خلافت کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ اگر آنحضرت ﷺ منع فرمادیں گے تو خلافت انہیں کبھی نہ مل سکے گی[۹] اسی طرح بعد میں انہیں بیعت خلافت کی پیش کش کرنے والوں کو بھی سختی سے انہوں نے ڈانٹ دیا تھا۔[۱۰]

بہرکیف انعقادِ خلافت وامامت کے سلسلہ میں یہ پہلا اختلاف تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کسی پہلے سے طے شدہ اصول کے تحت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس میں بھی اجتہاد و

اجماع کا اصول ضرور کارفرما تھا جمہور اہل اسلام کے نزدیک اجماع مستند ہے اور اس کے حجت شرعیہ ہونے پر ان کا اتفاق ہے [۱۱]۔ ہر چند کہ بعض مسلمان فرقے اجماع کو حجت شرعیہ نہیں مانتے، مگر ان کا انکار محض ہوائے نفس اور تحکم ہے، جس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

۱۳ھ میں اسلام کے نظام سیاست کاری نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرض موت میں خلافت کا مسئلہ ایک بار پھر اٹھا۔ مورخ کبیر، محمد بن جریر طبری اور دوسرے مورخین کے بیان کے مطابق انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ آپ نے حضرت عمر فاروقؓ کی نام زدگی پر صحابۂ کرامؓ میں سے اربابِ حل وعقد سے مشورہ کیا، اور دلائل سے اپنی جانشینی کے لیے ان کو موزوں تر، اصلح واشمل ثابت کیا۔ بعد ازاں آپ نے صحابۂ کرام کے مجمع سے جو، اُن کے دولت کدہ کے باہر اکٹھا ہو گیا تھا، خطاب فرمایا اور منصب خلافت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا نام پیش کیا۔ تمام اصحاب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا اور یوں سیدنا عمر فاروقؓ کی خلافت کا انعقاد ہوا [۱۲]۔ قاضی ابوالحسن علی الماوردی کے خیال میں یہ انعقاد، ولی عہدی کی ایک صورت تھا اور اس سے انہوں نے اس کے جواز کی سند بہم پہنچائی ہے [۱۳]۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو ''استخلاف عمرؓ'' میں ولی عہدی یا نام زدگی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، بلکہ ایک طرح کا انتخابی طریقہ ہی اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت سب سے نمایاں اور ممتاز تھی اور ان کے ہوتے کسی اور کے انتخاب کا سوال ہی نہ تھا [۱۴]، چنانچہ جب ارباب حل وعقد کے سامنے خلیفۂ رسولؐ نے ان کا نام پیش کیا تو سبھی نے ان کے فضل واہلیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور صرف حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی اہلیت اور اولویت کے اعتراف کے ساتھ ان کے مزاج کی قدرے سختی کا ذکر کیا (اِنَّـهٗ فیـهِ غِلظَـۃٌ)۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ ''چونکہ مجھ میں نرمی ہے، اس لیے عمر میں قدرے سختی ہے، مگر جب میں نہ ہوں گا تو ان کے مزاج میں نرمی پیدا ہو جائے گی''۔ اس سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی مطمئن ہو گئے [۱۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ آئندہ ہونے والے

خلیفہ کا نام خلیفۂ حال نے عام و خاص اصحاب کے سامنے پیش کیا، جو صرف ایک طرح کی تجویز تھی، سبھی نے اس تجویز کی تائید وتوثیق کی اور جنہیں اس سے کچھ اختلاف تھا، وہ بھی دلائل کے بعد اس سے متفق ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت مسلمانوں پر مسلط نہیں کی گئی، بلکہ اس پر اکابر صحابہ سے مشورہ کیا گیا اور عامۃ المسلمین سے اس کی تائید وتوثیق کرائی گئی اس کے بعد اس کا اعلان کر دیا گیا، جبکہ ولی عہدی ایک جبر کے تحت لوگوں پر محض قرابت داری کے زیر اثر مسلط کر دی جاتی ہے اور اس میں امت کا اختیار غیر اہم و غیر موثر ہوتا ہے۔ ہم آگے چل کر ولی عہدی کی مختلف صورتوں کا ذکر کریں گے جس سے ہمارے معروضہ کی تصدیق مزید ہوگی۔ قصہ مختصر حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت عام منظوری کے بعد منعقد ہوئی لہٰذا الماوردی اور دوسرے سیاسی مفکرین کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ اسلام میں یہ ولی عہدی کا آغاز تھا، اور یہیں سے اس کے جواز کی سند ملتی ہے۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے بعد ایک بار پھر مسئلہ خلافت زیر بحث آیا کہ امت کا امام و خلیفہ کسے مقرر کیا جائے۔ جب زخمی ہونے کے بعد ان کے زندہ رہنے کی امید ختم ہوگئی تو ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے جانشین کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ اسی غرض سے حضرت عمر فاروقؓ نے ممتاز صحابہ (بقیہ عشرہ مبشرہ) میں سے چھ (۶) حضرات کی مجلس شوریٰ مقرر کی کہ یہ اصحاب اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ بقیہ، عشرہ مبشرہ میں حضرت سعید بن زید عدویؓ بھی شامل تھے، مگر چونکہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے برادرِ عم زاد اور برادر نسبتی بھی تھے، اس لیے اپنے قرابت دار ہونے کی وجہ سے خلیفۂ رسول نے انہیں مجلس شوریٰ میں شامل نہ کیا[۱۶]۔ ان کا یہ عمل نظام ''ولی عہدی'' کے خلاف ایک قوی دلیل ہے۔ نیز یہ بھی مروی ہے کہ ان سے یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ وہ اپنے لائق بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیں مگر انہوں نے اس تجویز کو یک سر مسترد کر دیا[۱۷]۔ یوں نظام ولی عہدی کے انکار پر یہ ایک اور دلیل ہے۔ بہرکیف یہ چھ (۶) افراد جنہیں حضرت عمر فاروقؓ نے مجلس شوریٰ کے ارکان کے بطور نامزد کیا، حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان،

علی بن ابی طالب، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔ یہ لوگ امت محمدیہؐ کے نہایت ممتاز افراد تھے اور ان میں سے ہر شخص خدمت اسلام اور مثالی کردار کے سبب منصب امامت وخلافت کا تمام افراد سے زیادہ اہل اور مستحق تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو حضرت عمر فاروقؓ کا جانشین (خلیفہ) اور مسلمانوں کا پیشوا (امام) مقرر کیا جانا تھا[۱۸]۔ گویا یہ ایک طرح ''حلقۂ انتخاب'' تھا۔

کافی بحث وتمحیص اور عامۃ المسلمین سے استصواب رائے کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرلیا گیا۔ اور تمام مسلمانوں نے بلاکسی اختلاف کے ان کی بیعت کرلی[۱۹]۔ حضرت عثمانؓ کے طریقۂ انتخاب سے جو اصول وضع ہوا وہ یہ تھا کہ ان کی بیعت دو طریقوں سے ہوئی۔ پہلے ''بیعت خاصہ'' یعنی ارکانِ شوریٰ کی بیعت، بعد ازاں ''بیعت عامہ'' یعنی عامۃ المسلمین کی بیعت۔ ہم بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طریقۂ انتخاب سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ وہاں بھی پہلے سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان کی ''بیعت خاصہ'' ہوئی اور اس کے بعد مسجد نبویؐ میں ان کی ''بیعت عامہ'' کا انعقاد ہوا۔

خلفاء راشدین کے انتخاب کے یہ دونوں طریقے (یعنی انتخاب حضرت ابوبکر صدیقؓ و انتخاب حضرت عثمانؓ کا طریقہ اور انتخاب حضرت عمر فاروقؓ کا دوسرا طریقہ) ''اختیار وانتخاب'' کی جانب رہنمائی کرتے ہیں اور ان میں نامزدگی اور ولی عہدی کا کوئی تصور کارفرما نہیں ہے، بلکہ ''انتخاب واختیار'' کی روح جلوہ گر ہے اور ''اجماع امت'' کے اصول پر اس کی اساس استوار ہے۔

لیکن مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے ان حضرات کی نامزدگی سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ان اصحاب کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کو امام وخلیفہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ سے گو واضح نہیں، لیکن بطریق استقراء یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امت مسلمہ مجلس شوریٰ کے ان ارکان کو منصب خلافت کا مستحق ترین شخص نہیں، تو کم از کم اس پر کسی کو منصوب وفائز کرنے کا مجاز ضرور سمجھتی تھی، اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھی۔[۲۰]

امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ سیاسی کشمش اور اقتدار کی رسہ کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس خلفشار کی صدائے انتشار اسلامی تاریخ کے بیشتر ادوار میں سنائی دیتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ امت محمدیہؐ کے اتحاد و اتفاق کا شیرازہ بکھر گیا اور اختلاف وتشتت کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا۔ اجناد (جند، فوجی چھاؤنیاں) میں مقیم مقاتلہ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو گئے، جس سے اسلام کا نظامِ سیاست سخت متاثر ہوا، لامرکزیت بڑھنے لگی اور عربوں کی ''مرکز گریز'' فطرت دوبارہ جاگ اٹھی۔ اس لامرکزیت کو اس سانحہ سے کافی تقویت بہم پہنچی، جب مدینہ سے دارالخلافہ کوفہ منتقل کر دیا گیا۔ [۲۱]

قصہ کوتاہ حضرت عثمانؓ کے خلاف مدینہ پر باغیوں کی یورش کے باعث، اس ''شہر نبیؐ'' میں انارکی اور نراج کی بدترین صورت پیدا ہوئی، اس سے فائدہ اٹھا کر شہر (المدينة النبوية) پر باغی قاتلینِ عثمانؓ قابض ہو گئے۔ شہر کے بیشتر باشندے حالات کے جبر کے سبب بے بس ہو گئے اور ممتاز صحابہ بھی اس شورش پر قابو پانے پر کسی طرح بھی قادر نہ ہو سکے۔ اس ہنگامہ خیز فضا میں امت کے امام اور نبیؐ کے خلیفہ کے تقرر و نصب کا مسئلہ بڑی شدت سے اٹھا۔ ''ارباب حل وعقد'' بے اختیار تھے، ''ارکانِ شوریٰ'' بے بس تھے اور باغیوں کے سرغنے شہر پر قابض اور چیرہ دست ہو گئے تھے۔ ان حالات میں حضرت علیؓ کی بیعت خلافت عمل میں آئی اور رسول اللہ ﷺ کے چوتھے ہدایت یافتہ جانشین (خلیفۂ راشد) مسند نشین خلافت ہوئے [۲۲]۔ اس بیعت خلافت سے متعلق تاریخ میں بالکل غیر منضبط اور ژولیدہ روایات نقل کی گئی ہیں۔ ہم اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں گے اور اس سے ایک ''قاعدۂ کلیہ'' اخذ کریں گے۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے پانچ (۵) دن بعد ذوالحجہ ۳۵ھ کے آخری ہفتہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کی گئی مگر دنیائے اسلام کے تمام مراکز نے متفقہ طور پر انہیں خلیفہ تسلیم نہیں کیا اور ان کی بیعت سے لوگوں کی

معتد بہ تعداد نے تخلف کیا۔ بیعت نہ کرنے والوں کا یہ استدلال تھا کہ خلافت کے انعقاد کے لیے ارباب وحل و عقد یعنی نخبۂ مہاجرین و انصار کی رضامندی ضروری ہے، جب کہ مجرموں کے ٹولے نے ایک سازشِ کے تحت مدینہ پر قبضہ کر کے خلیفۃ المسلمین (حضرت عثمانؓ) کو شہید کر دیا اور حضرت علیؓ کو منصب پر فائز کر کے ان اصحاب سے جو مدینہ میں مقیم تھے جبراً ان کی بیعت کرائی [۲۳]۔ خود حضرت علیؓ نے مدینہ پر باغیوں کی چیرہ دستی اور اپنی بے بسی کا اظہار کئی موقعوں پر کیا [۲۴]۔ یہ بات درست ہے کہ باغیوں کے ٹولے کو جو قتل عثمانؓ میں ملوث تھے، امام اور خلیفہ کے انتخاب کا کوئی حق نہ تھا، یہ بھی درست ہے اکابر صحابہ میں سے کچھ سے باغیوں نے زبردستی بیعت لی تھی، مثلاً حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے بزور شمشیر بیعت لی گئی [۲۵]، تاریخ کی یہ بھی شہادت ہے کہ مدینہ ہی میں موجود صحابۂ کرام کی اکثریت نے حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت برضاء و رغبت کی تھی، یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بقیہ ارکانِ شوریٰ میں حضرت علیؓ نمایاں اور ممتاز تھے، سبقت الی الاسلام، عہد رسالت میں اعلیٰ حربی خدمات اور اپنے سے پہلے تینوں خلفاء کے ادوار میں اپنے صائب مشوروں کے باعث وہ امامت مسلمین اور خلافت نبویہؐ کے سب سے زیادہ اہل اور مستحق تھے۔ حضرت علیؓ کے استحقاق خلافت کو ان کے مخالفوں نے بھی تسلیم کیا تھا اور انہیں انعقاد خلافت کے طریقہ و نیز قصاصِ خلیفۂ مظلوم (حضرت عثمانؓ) میں تاخیر پر اعتراضات تھے [۲۶]۔ حضرت علیؓ بوجوہ قصاصِ عثمانؓ نہ لے سکے اور سیاسی منظر کے بتدریج تبدیل ہونے کی وجہ سے وہ انہیں لوگوں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہو گئے، جو قتلِ عثمانؓ میں گلے گلے ڈوبے ہوئے تھے، مثلاً مالک اشتر نخعی، محمد بن ابی بکر، عمرو بن الحمق، کنانہ بن بشر تجیبی وغیرہ [۲۷]۔ ان سب باتوں کے باوجود امت محمدیہؐ نے انہیں خلیفۂ راشد، امام و مجتہد تسلیم کیا اور انہیں کے اندازِ جہاں بانی کو خلافت راشدہ کا تسلسل قرار دیا، سو جمہور کے نزدیک وہی امام برحق ہیں [۲۸]۔ بہرکیف ساری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت میں بھی انتخاب کا عنصر غالب ہے، کیونکہ مسلمانوں

کی بڑی تعداد نے ان کی بیعت کی تھی اور اس بیعت سے تخلف کرنے والوں (متخلفین) کی تعداد کم تھی [۲۹]۔ یوں ایک تیسرا طریقۂ انتخاب وجود میں آیا، جو کسی صورت میں ناجائز نہیں تھا، بلکہ اکثریت کی حمایت و بیعت کے باعث حضرت علیؓ کی خلافت جائز اور خلافت راشدہ کا تسلسل ہی تھی۔

خلفاء راشدین کے انتخاب کے ان تینوں طریقوں میں شوریٰ کا اصول کارفرما ہے اور یہی تین طریقے اسلامی سیاسی نظام کی اساس ہیں۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے انتخاب کا طریقہ، حضرت عمر فاروقؓ کے انتخاب کا طریقہ اور حضرت علیؓ کے انتخاب کا طریقہ۔

۴۰ھ میں امیر المومنین علیؓ کی شہادت کے بعد اس نظام میں بتدریج تبدیلی واقع ہونے لگی۔ جن لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت سے تخلف کیا تھا، ان میں امیر شام حضرت معاویہؓ سب سے نمایاں اور اہم فوجی قوت کے مالک تھے۔ شام کے لوگوں نے حضرت علیؓ کی کبھی بیعت نہ کی اور وہ قصاص عثمانؓ کے مطالبہ پر ڈٹے رہے۔ جنگ صفین کے بعد حضرت معاویہؓ کی سیاسی و عسکری قوت میں اضافہ ہوتا گیا اور جلد ہی مصر پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا [۳۰]۔ بعد ازاں انہوں نے حضرت علیؓ کے مقبوضات پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ آخر کار ۴۰ھ میں ایک معاہدہ کے تحت ان سرحدی جھڑپوں کے سلسلے بند ہوگئے [۳۱]، یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ حضرت معاویہؓ عہد فاروقی سے شام میں مختلف فوجی عہدوں پر فائز تھے اور عہد عثمانؓ کے اختتام تک وہ پندرہ (۱۵) سال سے وہاں کے والی اور حاکم تھے۔ وہ ایک منظم و مستعد فوج، ایک اعلیٰ نظم حکومت اور ایک عظیم سیاسی قوت کے مالک تھے۔ والیٔ شام کی حیثیت میں وہ رومیوں سے برّی و بحری جنگوں میں مسلسل سرگرم رہتے تھے اور ان کی زیر کمان افواج، عراقی افواج سے زیادہ مستعد، جنگ آزما اور منظم تھیں۔ اس بہترین فوج کے کمان دار ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی حیات میں خلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا اور امیر شام ہی کہلائے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی

شہادت کے بعد ۴۰ھ میں بیت المقدس میں اپنی خلافت کا اعلان کیا[۳۲]۔ یوں ۳۵ھ کے اواخر سے ۴۰ھ کے رمضان تک دنیائے اسلام میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایک ہی خلیفہ حضرت علیؓ رہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اہلِ کوفہ نے ان کے صاحب زادہ جناب حسنؓ کی خلافت کی بیعت کرلی[۳۳]، یوں پہلی بار دنیائے اسلام میں بیک وقت دو خلفاء برسر اقتدار آئے اور دونوں ہی آمر و ناہی تھے۔ حضرت حسنؓ کی خلافت، اگرچہ صرف چند ماہ رہی، مگر وہ اسلام کے نظام سیاسی پر غور کرنے والوں کے لیے بڑی اہم ہے۔ اول تو اس لیے وہ اہم ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی وخلافت کا وہ پہلا واقعہ ہے، دوم یہ کہ ایک ہی وقت میں حضرت معاویہؓ شام ومصر کے امیر وخلیفہ تھے اور حضرت حسنؓ عراق وخراسان کے، یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام کے دو مراکز اقتدار ایک ہی وقت میں قائم ہوگئے۔ حضرت حسنؓ کے مختصر عہدِ خلافت کی تیسری اہمیت اس امر کی وجہ سے ہے کہ خلافت کے دو دعویداروں میں صلح ہوگئی اور ایک سخت شورش وانتشار کے بعد ربیع الثانی ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کی بیعت کرلی گئی جس سے اتحاد وآشتی کا دور شروع ہوا، جو حضرت معاویہؓ کی ۶۰ھ میں وفات تک باقی رہا، اس لیے اس سال (۴۱ھ) کو ہماری تاریخ میں ''عام الجماعۃ'' یعنی اتحاد واتفاق، امن وسلامتی اور توسیع وقوت کا سال کہا گیا ہے [۳۴]۔ بہرحال ۳۵ھ کے اواخر سے ۴۱ھ کے اوائل تک اسلام کے نظام سیاسی میں جو خلل در آیا تھا، وہ دور ہوگیا، ہر چند کہ اسے عسکری طاقت سے دور کیا گیا جو مستحسن نہ تھا۔

جب حضرت معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کیا گیا، تو شام ومصر کے تمام مسلمانوں نے ان کی بیعت برضا ورغبت کرلی، اسی طرح حجاز (مکہ ومدینہ) میں بھی ایک معتدبہ جماعت نے ان کی خلافت کو تسلیم کرلیا۔ ارباب حل وعقد کی اکثریت ان کی بیعت پر متفق تھی اور ان میں منصب خلافت پر فائز ہونے کے اوصاف وشروط بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ۴۱ھ میں حضرت حسنؓ کی خلافت سے دست برداری اور اہل عراق کی بیعت کے بعد وہ

دنیائے اسلام کے امام وخلیفہ ہوگئے۔ ان کے خلیفہ مقرر کیے جانے میں انتخاب واختیار کا غالب عنصر موجود ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں ''اقتدار'' ''بیعت'' سے مقدم ہے، جبکہ اسے مؤخر ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح حضرت معاویہؓ کا طریقۂ انتخاب، پہلے تینوں طریقوں سے مختلف ہے، لیکن ان کی خلافت پر امت مسلمہ کے اتفاق سے، بقول ابن خلدون، وہ جائز ٹھہرتی ہے [۳۵] یوں ان کا انتخاب بحیثیت امام وخلیفہ، جائز اور شوروی ہے۔ اور یہ انتخابِ خلیفہ کی چوتھی صورت ہے۔

اس کے بعد اسلام کا نظام سیاست کاری ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہوا۔ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ نے اس خیال سے کہ ان کی وفات کے بعد امت محمدیہؐ پھر کسی انتشار کا شکار نہ ہوجائے، اپنی زندگی میں ہی اپنے بڑے بیٹے کو، جس کی سب سے بڑی فضیلت یہ تھی کہ وہ خلیفہ کا فرزند تھا اور شامی عربوں کی عصبیت وحمایت اُسے حاصل تھی، اپنا ولی عہد بنا دیا۔ اس ولی عہدی کی دنیائے اسلام میں کوئی قابل ذکر مخالفت نہ ہوئی اور ارباب حل وعقد نے، اسے تسلیم کرلیا۔ صرف مدینہ کے چار ممتاز بزرگوں نے اس کی مخالفت کی اور اسے سنتِ شیخین کے خلاف ٹھہرایا۔ یہ حضرات تھے عبدالرحمان بن ابی بکر صدیق، عبداللہ بن عمر فاروق، عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم۔ حضرت معاویہؓ ان حضرات کو ولی عہدیٔ یزید پر متفق کرنے کی غرض سے بنفس نفیس مدینہ آئے اور ان حضرات سے اس مسئلہ پر بات چیت کی، مگر اپنی تمام تر ذہانت، حلم وتدبر کے باوجود وہ ان لوگوں کو یزید کی ولی عہدی پر اپنا ہم خیال نہ بنا سکے [۳۶]۔ اپنی اس ناکامی کا حضرت معاویہؓ کو شدید احساس تھا، چنانچہ اپنے مرض الموت میں بھی انہوں نے یزید کو جو نصیحتیں کیں ان میں ان حضرات کی مخالفت کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ [۳۷]

ان چار (۴) حضرت کی مخالفت نہایت اہم تھی کیونکہ حجاز میں بالخصوص اور دنیائے اسلام میں بالعموم ان کو ان کے قابل احترام آبائے کرام کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کبار صحابہؓ میں سے اکثر کی وفات اور بعض کے پس منظر میں چلے

جانے کے باعث یہ لوگ، کہ عہدِ عثمانی تک صغار صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے اب اشرافیہ کے ارکان، صاحبانِ دانش وبینش اور ارباب بست وکشاد سمجھے جاتے تھے۔ یہ حضرات نہ صرف یہ کہ خانوادۂ صدیقی، فاروقی وعلوی کے نمائندہ تھے، بلکہ مدینہ ومکہ کے انصار، مہاجرین اور قریش کے مقتدا اور پیشوا بھی تھے۔ اس کے علاوہ عالمِ اسلام میں انہیں "مذہبی عصبیت" بھی بڑی حد تک حاصل تھی۔ اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل حجاز، جو دنیائے اسلام میں اب بھی قابل احترام سمجھے جاتے تھے، یزید کی ولی عہدی پر راضی نہ تھے۔ انہیں راضی نہ کرنے کی وجہ سے، بیعت یزید کا مقصد، کہ مسلمان انتشار کا شکار نہ ہوں، پورا نہیں ہوا۔ ہمارے اس خیال کی تائید خلافت یزید میں رونما ہونے والے سانحات سے بھی ہوتی ہے اور اس کی موت کے بعد کے شورش انگیز حادثات سے بھی۔

بہر کیف انعقاد خلافت کی روایت میں اکثریت کو جو کلیدی حیثیت حاصل تھی، اس نامزدگی اور ولی عہدی میں بھی اسے برقرار رکھا گیا۔ اور امت محمدیہ کی بھاری اکثریت کو اس ولی عہدی اور اس کے نتیجہ میں خلافت کے انعقاد پر حضرت معاویہؓ کے تدبر کے سبب کوئی اعتراض نہ ہوا۔

خلیفہ کی زندگی میں اس کے ولی عہد کی بیعت سے موروثی نظامِ حکومت کا آغاز ہوا اور منصب خلافت میں کسرویت وقیصریت کی پیوند کاری کردی گئی۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی جو اسلام کے نظام سیاست کارنی کے بالکل الٹ تھی اور سنتِ خلفائے سلف سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہ تھی۔ اس امر کی نشاندہی اس زمانہ میں بھی کردی گئی تھی۔ چنانچہ جب حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے سلسلہ میں مدینہ آئے، تو اہل مدینہ کے نمائندہ کی حیثیت سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان سے دوٹوک لفظوں میں کہا کہ ہمارے نزدیک انعقاد خلافت کے وہی طریقے معتبر ہیں جنہیں حضرات شیخین نے اختیار کیا تھا اور ان کے علاوہ کسی اور طریقہ کو مسلمان کسی صورت میں قبول نہ کریں گے [۳۸]۔ یوں اسلامی نظام خلافت کے تاریخی ارتقاء میں ایک نیا عنصر داخل ہوگیا یعنی خلیفہ کی زندگی میں ہی اس کا

جانشین (ولی عہد) نام زد کردیا جائے اور امت سے اس کی بیعت بھی لے لی جائے، تاکہ خلیفہ کے انتقال کے وقت کوئی انتشار نہ پیدا ہو اور ولی عہد کو ایک نئی بیعت سے مسند نشین خلافت کردیا جائے۔

اس طریقہ کی حمایت میں سب سے قوی دلیل یہ دی جاسکتی ہے کہ ایسا کرنا امت میں انتشار کو روکنے کے لیے ضروری تھا۔ مگر یہ کہ ''ولی عہد'' خلیفۂ وقت کا بیٹا ہی کیوں ہو ''تقویٰ'' کی بنیاد پر ''اربابِ حل وعقد'' کے مشورہ اور اجماعِ امت کے ذریعہ، کیوں نہ اس کی نامزدگی عمل میں لائی جائے۔ جو مفکرین نظامِ ولی عہدی پر حضرت عمر فاروقؓ کے استخلاف سے استدلال کرتے ہیں، اگر ان سے اتفاق کرلیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اختلافِ امت کے خوف سے حضرت معاویہؓ کو سنتِ صدیقی پر عمل پیرا ہوکر کسی ''اصلح'' و ''امثل'' فرد کو اپنا ولی عہد بنانا چاہئے تھا۔ ابن خلدون کے خیال میں یہ ممکن نہ تھا، کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق کو اس بنیاد پر اپنا جانشین نامزد کرنا چاہا تھا مگر وہ ایسا نہ کرسکے، کیونکہ امت کی ''عصبیت'' بنوامیہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہ تھی اور اس کے علاوہ کسی کی نامزدگی سخت انتشار کا سبب تھی [۳۹]۔

قصہ کوتاہ رجب ۶۰ھ میں جناب معاویہؓ نے نسبتاً طویل عمر پا کر انتقال کیا اور ان کے حسبِ انتظام ان کا فرزند اول یزید بن معاویہ دمشق میں مسند آرائے خلافت ہوا۔ تمام دنیائے اسلام میں اس کی بیعت کی گئی اور کہیں جبر سے، کہیں رضا سے یہ مرحلۂ بیعت انجام پایا۔ جیسا کہ صفحات گزشتہ میں عرض کرچکا ہوں مدینہ کے چار اصحاب سے یزید کی مخالفت کا خطرہ تھا۔ ان میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحب زادہ حضرت عبدالرحمانؓ وفات پاچکے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے فخر امت صاحب زادہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کو اس مناقشہ سے الگ کرلیا اور کہہ دیا ''امت جس شخص کی بیعت پر راضی ہوگی وہ بھی اس کی بیعت کرلیں گے'' [۴۰]۔ یوں یزید کی بیعت خلافت کے موقع پر حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے ہی اختلاف کا خطرہ تھا۔ چنانچہ یزید کے حکم سے امیر

مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو اس بات کی خاص طور سے ہدایت کی گئی کہ ان صاحبوں سے وہ ضرور بیعت لے، مگر بوجوہ ان دونوں حضرات نے یزید کی بیعت نہ کی اور مدینہ سے مکہ چلے گئے[۴۱]۔ اس طرح جس متوقع خطرہ کے پیش نظر یزید کی اپنے والد کی حینِ حیات ولی عہدی کا اعلان کیا گیا تھا، وہ ٹلا نہیں، بلکہ بڑے شدومد سے سر پر آ گیا۔

محرم ۶۱ھ میں عراق کے مقام کربلا میں حضرت حسینؓ یزید کے حق خلافت کے خلاف اور اپنی خلافت کی جدوجہد میں اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ کوفیوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے[۴۲]۔ ان کی شہادت اسلام کی تاریخ کے نہایت اہم واقعات میں سے ہے۔ وہ جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے فرزند دل بند، امیر المومنین علی مرتضیٰؓ کے سبطِ اصغر، رسول اکرمؐ کے عزیز نواسے تھے۔ ان کی شہادت نے اسلام کے نظام سیاسی پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے، اور بعد کے حوادث پر اس حادثۂ فاجعہ کی گہری چھاپ ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں یہ المیہ ظہور پذیر ہوا انہیں شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ''خونِ حسینؓ'' اسلام کی مذہبی و سیاسی تاریخ کے لیے ایک عظیم المیہ ثابت ہوگا اور اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے''۔[۴۳]

یزید کی خلافت کے دوسرے بڑے مخالف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حمایت میں اہل مدینہ نے ۶۲ھ میں یزید کی بیعت فسخ کر دی، اسے منصب خلافت سے خلع کر دیا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یزید نے ان لوگوں کو افہام و تفہیم کے ذریعہ مخالفت سے باز رکھنے کی کوشش کی ناکامی کے بعد شامی افواج نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ ذوالحجہ ۶۳ھ میں مدینہ کے باہر ''واقعۂ حرّہ'' پیش آیا، اہل مدینہ کو شکست ہوئی اور کشت وخون کے بعد مدینہ پر یزید کی حکومت بحال ہوگئی[۴۴]۔ شہر نبیؐ پر مدینۃ الرسولؐ پر یہ حملہ اسلام کے لیے بڑا افسوس ناک ثابت ہوا۔

اس کے بعد شامی افواج نے مکہ کا رخ کیا۔ وہاں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید کے خلاف خروج کیا تھا۔ محرم ۶۴ھ میں افواج شام نے مکہ کا محاصرہ کرلیا اور ابن

زبیرؓ سے جنگ شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں خانہ کعبہ آتش زنی کا شکار ہوگیا۔ اس محاصرہ کے دوران میں ہی یزید نے ربیع الاول ۶۴ھ میں انتقال کیا اور شامی افواج مکہ سے واپس چلی گئیں۔[۴۵]

یزید کے دور حکومت کے یہ تین واقعات یعنی شہادت حسینؓ، جنگ حرہ اور حصار مکہ، اسلام کی سیاسی و مذہبی تاریخ میں بڑے دور رس نتائج کے حامل ثابت ہوئے۔ ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک کے نو (۹) سال کہ اسلام کے نہایت پر آشوب ماہ و سال ہیں انہیں کی صدائے بازگشت ہیں۔ یہ زمانہ دنیائے اسلام کے تفرق و تشتت کا عبرت انگیز مرقع ہے اور اس مرقع خوں ریز و نفاق بیز میں ہماری سیاست کاری کی جو تصویر نمایاں ہوتی ہے وہ حد درجہ تاریک ہے، فَهَل مِن مُدَّكِر۔

ربیع الاول ۶۴ھ میں یزید کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا، کہ ولی عہد سلطنت تھا سریر آرائے خلافت ہوا۔ معاویہ بن یزید بن معاویہ کی بیعت صرف چالیس دنوں تک قائم رہی۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے یہ تقریر کی:

''لوگو! میں نے تمہاری امارت و قیادت سے متعلق بہت غور کیا، اس کے نتیجے میں میں نے خود کو اس بار کے اٹھانے اور اس ذمہ داری کو سرانجام دینے سے عاجز و ناتواں پایا۔ میں نے تمہاری امارت کے لیے ابوبکر صدیقؓ کی سنت پر عمل کر کے عمر فاروقؓ جیسا شخص تلاش کیا، مگر مجھے ایسا کوئی شخص نہ مل سکا۔ پھر میں نے چاہا کہ عمر فاروقؓ کی اتباع میں چھ اصحاب کی شوریٰ مقرر کردوں، جو اپنے میں سے کسی کو امام و خلیفہ چن لے، لیکن مجھے ایسے چھ افراد بھی نہ مل سکے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خود کو اس بار عظیم سے سبکدوش کرلوں اور تمہیں یہ اختیار دے دوں کہ جسے چاہو اپنی امامت و قیادت کے لیے چن لو''۔

یہ کہہ کر نوجوان ابولیلیٰ معاویہ بن یزید قصر امارت میں چلا گیا اور پھر وہاں سے مر کر ہی نکلا۔ یہ تقریر سنت شیخین کی تائید مزید و توثیق کرتی ہے[۴۶]۔

اس طور سے ۶۴ھ میں دنیائے اسلام پھر ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوئی۔

لیکن اب وقت بہت آگے جاچکا تھا، یہ دَور اُس دَور سے بہت مختلف تھا جو آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت تھا۔ اس وقت رسول ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد اوصاف امامت وخلافت سے متصف تھی، نیز اس زمانہ میں اسلامی ریاست سادہ اور سیاسی عمل غیر پیچیدہ تھا۔ اُس زمانہ میں ایسی مشکلات نہ تھیں جیسی کہ ۶۴ھ میں پیدا ہوچکی تھیں۔ اب پہلے کی طرح صرف مدینہ ہی ارباب حل وعقد کا مرکز نہ تھا، بلکہ ان کی بڑی تعداد نو مفتوحہ ممالک کے پرانے اور نو آباد شہروں میں منتقل ہوچکی تھی۔ ان شہروں میں عراق میں کوفہ و بصرہ، مصر میں فسطاط اور شام میں دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور قنسرین کے ''اجناد'' (فوجی چھاؤنیاں) تھے۔ ہر چند کہ مدینہ بھی ایک ''جند'' تھا، مگر اس کی اہمیت دوسرے ''اجناد'' کے مقابلہ میں بہت گھٹ گئی تھی۔ ایک تو حضرت علیؓ کے زمانہ میں دارالخلافت کی منتقلی کے باعث، دوسرے واقعۂ حرہ کی تباہ کاری کے سبب اور تیسرے معاشی وسائل کی کم یابی اور اقتصادی وسیاسی ابتلاء کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر آبادی کے انخلاء اور ''اجناد'' میں منتقلی کی وجہ سے۔ اس لیے اب بنو ساعدہ کے سقیفے میں جمع ہوکر نہایت سادگی سے خلیفہ منتخب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات کا یہ اقتضاء تھا کہ تمام مراکز سے لوگ ایک جگہ جمع ہوکر، اور وہ مقام مدینہ ہی ہوسکتا تھا، اصول شوریٰ کے مطابق خلیفہ کا انتخاب کر لیتے۔ مگر ایسا کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ یہ اسلامی سیاست کاری کا ایک چھپا ہوا نقص تھا، جو اس موقع پر ابھر کر سامنے آیا، اور یہاں کوئی ایسا گروہ یا ایسے اصول موجود نہ تھے، جو اس مسئلہ کو حل کرنے میں مد و معاون ہوتے اور ان کے مطابق مناسب قدم اٹھائے جاتے۔ کبار صحابہؓ کے بعد ایسی شخصیات بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جارہی تھیں جن پر سب لوگ بلا اختلاف متفق ہوسکتے تھے۔ یوں اسلام کا نظام سیاست کاری ایک ایسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوا، جو اس سے پہلے اسے کبھی پیش نہ آئی تھی۔ اس کے نتیجے میں دنیائے اسلام ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک نو (۹) سال بدترین انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار رہی۔

یہ وہ دَور تھا جب ایک عجیب معاشرتی تبدیلی وجود میں آچکی تھی۔ خلفاء راشدین

کے آخری دَور اور بنو امیہ کے اوائل عہد میں جو غیر عرب اقوام (عجمی) ''اجناد'' خصوصاً کوفہ و بصرہ میں آباد ہوگئی تھیں، ان کا اپنا ایک شاندار ماضی تھا، وہ پڑھے لکھے اور ایک فکری ورثے کے امین بھی تھے [۴۷]، جبکہ وہ عرب قبائل جو ان کے ساتھ انہیں ''اجناد'' میں آباد تھے، ان کی اکثریت بے پڑھی لکھی، اجڈ اور شوریدہ سر تھی۔ عراق میں یہ نو آباد عرب بیشتر یمنی تھے اور فتنۂ ارتداد میں ملوث بھی رہ چکے تھے [۴۸]، ان سب کو قابو میں رکھنے کے لیے سیدنا عمر فاروقؓ، حضرت معاویہؓ یا زیاد بن ابی سفیان جیسے نابغۂ روزگار منتظمین کی ضرورت تھی۔ ایسے حضرات کی عدم موجودگی میں یہ لوگ بے سری فوج اور شتر بے مہار کی طرح تھے۔ انہیں عربوں کو فوجی اقتدار حاصل تھا۔ لیکن دینی علوم پر غیر عرب مسلمانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ مگر حکومت کے معاملات میں انہیں کوئی خاص عمل دخل حاصل نہ تھا۔ اس لیے ان شہروں میں جو ''مرکز اطاعت'' قائم ہوا، وہ ''دوعملی'' کا شکار ہوگیا، کیونکہ جو فوجی اقتدار کے مالک تھے، وہ عموماً دینی علوم سے دور تھے اور جو دینی علم کے ماہر تھے، وہ دنیوی اقتدار سے بہت حد تک محروم تھے۔ اس صورت میں ارباب حل وعقد کی تعیین جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی، کہ قوت بے علم اور علم بے قوت دونوں ہی انہدام معاشرہ کا باعث ہیں اور انضباط کے لیے قوت و علم دونوں کی یکجائی ضروری ہوتی ہے۔ [۴۹]

عہد زیر نظر میں دنیائے اسلام میں جو ''اجناد'' تھے، اُن کو ''فوجی قوت'' کا مرکز، اور نظامِ سیاسی کی تکوین و تعیین میں اساسی حیثیت کا مالک سمجھنا اور ہر سیاسی تبدیلی میں انہیں کو کلیدی اہمیت کا حامل خیال کرنا چاہئے۔

مدینہ اگر چہ ایک جند کی حیثیت سے پہلی جیسی مرکزیت کا مالک نہ تھا اور اس عہد میں اس کی اہمیت بہت کم ہوگئی تھی، پھر بھی اسے اس بناء پر اہم خیال کیا جاتا تھا کہ وہ تین بڑے سیاسی گروہوں یعنی مہاجرین، قریش اور انصار کا مستقر، مہبط و مرکز تھا۔ اس کے علاوہ دین کا علم اسی شہر میں تھا، رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی احادیث اسی شہر میں تھیں اور مہاجرین وانصار کہ اسلامی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی تھے، ان کی نسلیں بھی اسی شہر سے تعلق

رکھتی تھیں، اسی لیے مرکز سیاسی وفوجی نہ ہوتے ہوئے بھی اور عظیم ابتلا کے باوجود، یہ شہر بڑی اہمیت کا مالک تھا۔ اسلامی دنیا کی اشرافیہ اور اولادِ صحابہؓ کا ایک معتدبہ گروہ یہیں رہتا تھا اور دین کے علم کے حصول کی غرض سے لوگ یہیں آتے تھے۔[۵۰]

عراق (کوفہ و بصرہ) میں نسلی گروہوں کے ساتھ نظریاتی گروہ بھی وجود میں آچکے تھے۔ ان میں کوفہ کے ''شیعانِ علیؓ'' اور بصرہ کے ''خوارج'' نمایاں ہیں۔ عراق خصوصاً بصرہ میں ایک تیسرا ''کلامی'' وعقلی گروہ، کہ سیاست میں ایک مخصوص نظریہ رکھتا تھا، اور مذہب کے معاملات میں عقل کی کارفرمائی کا قائل تھا، ''معتزلہ'' کہلاتا تھا۔ معتزلہ حریتِ فکر کے داعی تھے اور اپنے سیاسی و مذہبی افکار کو بڑی جرأت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، لیکن ''اعتزال'' کا یہ پودا ابھی کم زور اور نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں تھا[۵۱]۔ اس طور سے عراق میں عربی، عجمی کشمکش، قبائلی عصبیت اور فکری ونظری اختلافات موجود تھے۔

عہد زیرِ نظر میں شام ہی عربوں کی اصل قوت کا مرکز تھا۔ لیکن یہاں بھی شمالی عرب کے بنومضر اور جنوبی عرب کے بنوقحطان، بلکہ زیادہ درست تعبیر کی رو سے شمالی عربوں کے قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنوکلب اور شمالی عربوں کے بنومضر کی شاخ بنوقیس کے قبائل، سیاسی و قبائلی مفادات کی خاطر مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کے اس افتراق سے سیاسی مہم جو اور اقتدار کے متلاشی حسب دل خواہ فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ یہ قبائلی منافرت بعد میں شامی عربوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوئی۔[۵۲]

جب معاویہ بن یزید بن معاویہ خلافت سے دستبردار ہوگیا[۵۳]، تو ان تمام مراکز میں نہ تو کسی قسم کا رابطہ تھا اور نہ ان کے اہواء واغراض یکساں تھے، اس لیے سب نے اپنے اپنے طور پر الگ الگ قدم اٹھایا۔ بصرہ میں خوارج نے، کوفہ میں شیعانِ علیؓ نے، حجاز میں خلافت راشدہ کے احیاء کے حامیوں نے اس سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھانے یا اگر حسن ظن ہو تو اس انتشار کو ختم کرنے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ اسی طرح شام میں کلبی وقیسی

قبائل نے اپنے قبائلی مفاد کی حفاظت کی خاطر اقتدار کی سرکشی میں حصہ لیا، شام کے قیسی اہل حجاز کے ہم نوا ہو گئے اور وہاں کے کلبی اموی خاندان کے حامی و ناصر[۵۴]۔ دوسری جانب کوفیوں نے مختار ثقفی کا ساتھ دیا[۵۵] اور بصرہ کے خوارج نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی[۵۶]۔ یوں دنیائے اسلام میں انتشار، افتراق اور لامرکزیت کا فتنہ در آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو (۹) سال تک بیک وقت چار دعویدارانِ خلافت منصب خلافت پر قبضہ کے لیے ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے، حتیٰ کہ حج کے موقع پر بھی، کہ اسلام کی اجتماعیت اور مسلمانوں کی یک جہتی و اتحاد کا مظہر ہے، مسلمانوں نے چار (۴) مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو کر چار (۴) مختلف پرچموں تلے اور چار (۴) سیاسی قائدین کی امارت میں فریضۂ حج ادا کیا۔ یہ نتیجہ [۵۷] تھا انتخاب خلیفہ و امام سے متعلق اصول وضوابط کی عدم موجودگی کا۔

شام میں قیسی قبائل، ضحاک بن قیس فہری (قرشی) کی قیادت میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے حامی اور حجازی گروہ کے ہم نوا تھے۔ بنوکلب جن کا قائد حسان بن مالک بن بحدل کلبی تھا وہ ابن زبیرؓ کا سخت مخالف اور نتیجۃً اموی حکومت کی بازیابی و استقرار کے لیے کوشاں تھا۔ اس کی وجہ سے مروان بن حکم نے اس گروہ کی قیادت قبول کی، ورنہ وہ ابن الزبیرؓ کی بیعت کرنے پر آمادہ تھا۔ اموی گروہ میں مزید استحکام کی غرض سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکمراں مروان ہو، اس کا ولی عہد و جانشین یزید اول کا بیٹا خالد ہو جو بنوکلب کا نواسہ تھا، خالد کے بعد عمرو بن سعید اموی کو ولی عہد دوم نامزد کیا گیا، جو مروان کا عم زاد اور داماد تھا اور ایک باصلاحیت فوجی قائد اور بہادر سپاہی بھی تھا[۵۸]۔ یوں ''اموی پارٹی'' یا حزب اموی میں پہلی بار ایک ساتھ ایک سے زائد ''ولی عہد'' کی نامزدگی کا طریقہ رائج ہوا، جس سے بعد میں انتشار اور بدمزگی میں اضافہ ہوا۔ قصہ کوتاہ شام پر اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے قیسی وکلبی عربوں یا زبیری و اموی احزاب میں دمشق میں مروان بن حکم کی قیادت میں ۶۴ھ میں اموی خلافت کا استقرار ہو گیا، مگر اس خاندان کے سفیانی گھرانے کے بجائے

مروانی گھرانے میں اور بعد کے تمام اموی خلفاء اسی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگ مرج راہط نے اپنے عہد کی تاریخ اور اس دور کے عربی ادب پر بڑے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں[۵۹]، جن کا بیان ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

دوسری جانب عرب (حجاز و یمن) اور بصرہ کے لوگوں نے امام و خلیفہ کی حیثیت سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کرلی۔ ابن زبیرؓ نے مصر و شام سے بھی اپنی بیعت لینی چاہی مگر عمرو بن سعید کے ہاتھوں ان کی افواج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن خراسان میں ان کی بیعت کرلی گئی اور کوفہ میں بھی لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یوں مصر و شام کے علاوہ ایک مختصر عرصہ کے لیے تمام اسلامی دنیا نے ان کی خلافت کو تسلیم کر کے ''نظام شوروی'' کی تائید و توثیق کردی[۶۰]۔ مگر یہ سوال جواب طلب ہے کہ کیا ابن زبیرؓ نے خلافت راشدہ کو بحال کیا؟ کیا ان کا انتخاب اجماع و اختیار امت کے ذریعہ ہوا؟ اور کیا انہوں نے انہیں اصول جہاں بانی کو اختیار کیا جو مثلاً سیدنا عمر فاروقؓ کے اسوہ سے ثابت ہیں؟ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کیا اُس عہد کے دگرگوں اوضاع و اطوار میں ایسا کرنا ممکن بھی تھا؟ کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابن زبیرؓ کے قول و عمل میں تضاد تھا اور مشہور اموی قائد روح بن زنباع جذامی نے یہ کہا بھی تھا۔[۶۱]

تیسرا گروہ شیعان علیؓ کا تھا، جسے کوفہ اور اس کے توابع میں کافی قوت حاصل تھی۔ اس عہد کے انتشار سے اہل کوفہ نے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ان کے متفق الخیال ہونے سے پہلے عبداللہ بن زبیرؓ نے کوفہ پر قبضہ کر کے اپنا گورنر (والی) مقرر کردیا تھا[۶۲]، اسی زمانہ میں جناب سلیمان بن صُرد خزاعیؓ کی قیادت میں کوفہ کے معززین نے حمایت حسینؓ نہ کرنے پر سخت ندامت کا اظہار کیا اپنی اس غلطی پر توبہ کی اور تاریخ میں ''التوابون'' کے نام سے شہرت پائی۔ کوفہ کے چھ ہزار اشراف شیعہ نے شام پر حملہ کرنے اور قاتلین حسینؓ کو کیفر کردار تک پہنچانے کی غرض سے ۶۵ھ میں شامی افواج سے ''عین الوردہ'' کے مقام پر جنگ کی اور شکست کھائی[۶۳]۔ التوابون کے کوفہ کے افق سے ہٹتے ہی مختار بن ابی عبید

ثقفی کو موقع مل گیا، اس نے شہر سے زبیری گورنر کو لڑ کر نکال دیا اور شیعانِ علیؓ کے ترجمان و خون حسینؓ کے انتقام کے داعی کی حیثیت سے ۶۶ھ میں کوفہ اور اس کے متعلقہ علاقوں میں زبردست جنگی قوت بہم پہنچائی۔ اس نے امامتِ آل علیؓ کا نعرہ بلند کیا اور حضرت علیؓ کے غیر فاطمی بیٹے محمد بن حنفیہ کی لوگوں سے بیعت لینی شروع کر دی۔[۶۴]

چوتھا گروہ ''خوارج'' کا تھا۔ یہ خوارج بصرہ اور اس کے اعمال یعنی انتظامی علاقوں میں کافی قوت کے مالک تھے۔ مگر ان کا مرکز وسطی عرب میں یمامہ و بحرین تھا۔ عہد زیرِ نظر میں ان کے سردار نافع بن ازرق حنظلی، عبداللہ بن اباض صریمی، ابو فدیک یشکری اور نجدہ بن عامر حنفی تھے۔ ان خوارج نے اسلامی ممالک میں کشت و خون کا بازار گرم کر دیا یہ لوگ اپنی خیرہ سری کی وجہ سے مخالفوں کے قتل کے ساتھ ہی اپنے حامیوں کو معمولی اختلاف پر تلوار کی دھار پر رکھ لیتے تھے۔ یوں یہ گروہ نہایت خطرناک تھا۔ بات بات پر تکفیر، تفسیق اور قتل ان لوگوں کا معمول تھا۔ امامت و خلافت کے مسئلہ پر ان کے خیالات سب سے الگ اور ان کا رویہ بے لچک تھا۔[۶۵]

سطور بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عہد انتشار میں کہ ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک ...... ہے، دنیائے اسلام میں بیک وقت چار مدعیانِ امامت و خلافت تھے اور ان میں سے ہر ایک کے دعویٰ کی اساس دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ اہل شام بنو امیہ کی حمایت عربوں کی نسلی برتری و قبائلی عصبیت کی بنیاد پر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیائے اسلام کی قیادت کا حق صرف عربوں کو تھا اور ان عربوں کی غالب اکثریت بنو امیہ کی حامی تھی، وہی دوسروں کے مقابلہ میں امت کی امامت اور قیادت کے حقدار تھے[۶۶]۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے حامی خلافت کو ''شوروی'' سمجھتے تھے، ان کے خیال میں خلافت و امامت کے لیے انہیں اوصاف کی ضرورت تھی جو خلفائے راشدین میں تھیں۔ تقویٰ اور اصلحیت کی وجہ سے ان کا حقِ امامت و خلافت دوسروں سے مرجح و مقدم تھا۔ ان میں اس منصب کی مطلوبہ صفات و شروط بدرجۂ اتم موجود تھیں یعنی وہ صفات و شروط جو حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ

رضی اللہ عنہما کے انتخاب و اختیار کی بنیاد تھیں اور جو زمانہ ما بعد میں خلافت و امامت کے امیدوار کے انتخاب میں معیار کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان کے نزدیک اس معیار پر صرف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پورے اترتے تھے اور وہی اس منصب کے اصلح، امثل واتقیٰ ہونے کے باعث حقدار تھے [۶۷]۔ خلافت کے بقیہ دو دعویداروں کے نظریات بہت مختلف تھے۔ جب مختار بن ابن عبید ثقفی کو آلِ علیؓ کے نام پر اقتدار حاصل ہوگیا اور اس نے اپنی سہولت کی خاطر محمد بن حنفیہ کو امام و خلیفہ کی حیثیت سے متعارف کرایا، تو واقعی اقتدار اسی کے ہاتھ میں رہا اور محمد بن حنفیہ کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا۔ وہ اقتدار پر مستبدانہ قابض تھا اور ابن حنفیہ کا نام اپنے ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر استعمال کرتا رہا [۶۸]۔ اس نے حضرت علی مرتضیٰؓ کی فاطمی اولاد (خانوادۂ حسنؓ و حسینؓ) کے بجائے غیر فاطمی اولاد کا سہارا اس لیے بھی لیا کہ ان لوگوں کو کوئی خاص حمایت و اہمیت حاصل نہ تھی اور آل فاطمہؓ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس تیسرے فریق نے جو امامت آل علیؓ کا نعرہ بلند کیا وہ اولاً تو امامت آلِ محمدؐ کے نعرہ سے مختلف تھا، کیونکہ آلِ محمدؐ میں حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی اولاد داخل تھیں حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد نہیں۔ بہرکیف مختار نے اپنے دعویٰ کی وجہ سے اسلام کے نظام سیاست کاری میں جو جوہری تغیرات پیدا کیے وہ یہ تھے کہ امامت موروثی اور ایک خاندان کا حق ہے اور وہ خاندان خلیفہ چہارم کا ہے، جگر گوشۂ رسولؐ کا نہیں، دوسری تبدیلی یہ آئی کہ امام محض برائے نام ہو اور واقعی اختیار کسی اور کو حاصل ہو، یہی عمل عہد انحطاط کے عباسی و فاطمی خلفاء کے زمانوں میں بروئے کار آیا، تیسری تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ امامت و خلافت شوروی نہیں، بلکہ موروثی ہے، امت کو اختیار امام کا حق نہیں ہے بلکہ ''یہ ضرورت دین'' ہے اور امام کا عزل و نصب امت کے دائرہ کار سے باہر ہے، اسے صرف اطاعت کرنا چاہئے، کہ یہی اطاعت دین ہے اور اس سے انحراف دین سے انحراف ہے۔ امام، امت کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور امت کا مرجع اطاعت وہی، منصوص من اللہ وہی اور آمر وناہی وہی ہے [۶۹]۔ مختار ثقفی کے مذہبی افکار اور اس کی بدعات کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے کہ

اس سے یہ بحث غیر ضروری طور پر دراز ہو جائے گی، ہم ان عقائد و تصورات کو اسی موضوع سے متعلق ایک طویل تر بحث میں سپرد قلم کریں گے۔ مختار ثقفی کے بعد خلافت و امامت کے چوتھے دعویدار کے افکار پر غور کرنا چاہیے، یہ چوتھا گروہ خوارج کا ہے۔ ان کے نظریات پہلے تینوں احزاب، اموی، شوروی و علوی، سے یکسر الگ تھے۔ پہلے تینوں گروہ کم از کم اس بات پر متفق تھے کہ امام و خلیفہ کو خاندانِ قریش سے ہونا چاہیے، ہر چند کہ وہ جزئیات یا کلیات میں باہم مختلف الخیال تھے۔ لیکن خوارج کا یہ گروہ امام کے لیے قریشیت کی شرط کے بھی خلاف تھا، اس کے عقیدہ کی رو سے کوئی بھی مسلمان اس منصب پر فائز ہونے کا حق رکھتا تھا، خواہ وہ عرب ہو یا عجم، اسی طرح اس کا آزاد (حُر) ہونا بھی ضروری نہ تھا وہ غلام (عَبد) بھی ہوسکتا تھا۔ خوارج کے گروہ مختلف الخیال اور باہم دگر مجادل بھی تھے، ان کے نزدیک منصبِ امامت و خلافت دوسرے احزاب کے برخلاف، واجب اور ضروری بھی نہ تھا، اس کا انعقاد امت پر لازم نہ تھا، اس سے اس منصب کی اہمیت ان کی نگاہوں میں حد درجہ کم ہو کر رہ گئی، اس کے علاوہ امام کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے مخالفوں سے جنگ کرے اور تلوار کے ذریعہ اپنے استحقاق کو امت سے تسلیم کرائے۔ ایک ہی وقت میں ان خوارج کے مختلف دھڑوں کے متعدد امام و امیر تھے، یہ تعدد، تشتت و تفرق کا سبب بنتے تھے، چنانچہ دنیائے اسلام میں یہ لوگ ''لاقانونیت'' کی علامت بن گئے۔ [۷۰]

محولہ بالا بات چیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پچیس (۲۵) سال پہلے ہی خلافت و امامت، طاقت، شوریٰ، تقدیسِ نسل علیؑ اور انتشار و تشتت کے متضاد و باہم متصادم نظریات کی پیچیدگیوں میں الجھ گئی، اور اختلافات کی ایسی مضبوط و مستحکم بنیادیں وجود میں آ گئیں جن سے دین کی وحدت متاثر ہوئی، احزاب سیاسیہ فرق دینیہ کی شکل اختیار کر گئے اور امت کی سربراہی و امامت و خلافت کے انعقاد کا اصل مقصد فوت ہو گیا کہ اتحاد ملت اور شیرازہ بندیٔ امت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اختلاف اصول دین قرار پایا اور عقائد و افکار کی بلند و بالا عمارت اس کی بنیاد پر تعمیر

کی گئی، اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ہر گروہ، ایک فرقہ نہیں، ایک جداگانہ مذہب قرار پایا اور انسانی اقتدار کے اشتراک کے علاوہ ان میں باہم دگر کوئی بات مشترک اور کوئی اصل مابہ الاتحاد نہیں رہی۔ اس اختلاف کی تفصیل ہم نے اپنے طویل تر مقالہ میں کسی قدر وضاحت سے تحریر کی ہے، یہاں اسے قلم زد کرتے ہیں۔

قصہ کوتاہ پایان کار ''نظریۂ طاقت و تفوق عرب'' کو کامیابی حاصل ہوئی اور مروانِ اول کا فرزند و جانشین عبدالملک ۷۳ھ میں اپنے تمام مخالفوں کو زیر کرکے دنیائے اسلام کا واحد و مقتدر حکمراں ہوگیا[۷۱]۔ عبدالملک کے جانشینوں کے عہد میں اسلامی دنیا ۱۲۵ھ تک متحد رہی اور عظیم فتوحات و شاندار کامیابیوں کا یہ زمانہ پچاس (۵۰) سال سے زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔

بنو امیہ نے دوبارہ برسر اقتدار آکر نظام ولی عہدی میں مزید تبدیلیاں کیں۔ ایک تبدیلی یہ کی گئی کہ خلیفہ ولی عہد کی بیعت کو منسوخ کرنے لگا۔ چنانچہ جب اہل شام نے مروان بن حکم کو خلیفہ منتخب کیا تو اس کے بعد خالد بن یزید اور عمرو بن سعید کو یکے بعد دیگرے اس کا ولی عہد نامزد کیا[۷۲]۔ لیکن مروان بن حکم نے اپنی مختصر ترین مدت خلافت میں ان دونوں ولی عہدوں کی ولایت عہد منسوخ کرکے اپنے بعد اپنے بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کردیا[۷۳]۔ جب عبدالملک کی باری آئی تو اس نے اپنے بھائی عبدالعزیز کی ولی عہدی پر خط تنسیخ کھینچنے کی کوشش کی مگر موت نے عبدالعزیز کو میدانِ سیاست سے دور کردیا اور عبدالملک نے اپنے بیٹوں ولید اول اور سلیمان کو ولی عہد نامزد کردیا[۷۴]۔ ولید اول نے سلیمان کو ولی عہدی سے ہٹانے کی سرتوڑ کوشش کی، لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی[۷۵]۔ ولید کی اس ناکام کوشش کا نہایت افسوس ناک نتیجہ نکلا اور سلیمان کی آتش انتقام میں دنیائے اسلام کے عظیم فاتحین موسیٰ بن نُصیر لخمی، قتیبہ بن مسلم باہلی اور محمد بن قاسم ثقفی جل کر راکھ ہوگئے اور اسلامی فتوحات کے بڑھتے ہوئے قدم یکبارگی رک گئے۔ موسیٰ جس کی عقابانہ نگاہیں جبل برتات کے پار جنوبی فرانس کی تسخیر پر

مرتکز تھیں، ولی عہدی کی تنسیخ و کشمکش کی بھینٹ چڑھ گیا۔ قتیبہ جو بقول خواجہ عطا ر امت محمدیہؐ کا شیرِ نر تھا، اور چین کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں جان سے گیا اور محمد، کہ دنیا کا نہایت کم سن مگر قابل ترین فاتح و سپہ سالار تھا، برعظیم میں ملتان کے صحراؤں کے پرے لشکر کشی کے منصوبے بنا رہا تھا اسے پابجولاں عراق واپس لے جایا گیا اور ایسی موت مرا جو ایک عظیم جنرل کے شایانِ شان نہ تھی۔[۷۶]

بیک وقت ایک سے زائد ولی عہدوں کی نامزدگی سے خود اموی خاندان بھی اختلاف کا شکار ہوا۔ مروان کے بعد عمرو بن سعید کا عبدالملک کے ہاتھوں قتل اس خاندان میں پھوٹ کا پہلا بیج تھا جو بویا گیا[۷۷]، اسی طرح خالد بن یزید کی ولی عہدی کی تنسیخ سے خاندان میں ایک اور تفرقہ پڑا اور مروانی و سفیانی خانوادے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے [۷۸]۔ اس کے علاوہ خلیفہ سابق کے عہد میں دو ولی عہدوں کی بیعت اور خلیفہ حال کے دور میں ان میں سے ایک کی تنسیخ، ادارۂ بیعت کی بے قدری اور بے وقعتی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں ایسی بیعت کی کیا قدر ہو سکتی تھی جو ایک خلیفہ منعقد کرے اور اس کا جانشین خود کو برقرار مگر دوسرے ولی عہد کی بیعت کو توڑ کر اسے بازیچۂ اطفال بنا دے۔

جب ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک سریر آرائے، خلافت ہوا، تو اس نے اپنے پیش رو خلفاء کی روش سے انحراف کیا اور اپنے بھائی یا بیٹے کو اپنا جانشین (خلیفہ) نامزد کرنے کے بجائے خاندانِ اموی کے ایک ایسے فرد کا انتخاب کیا جو بلا شبہ اصول شوریٰ اور خلفاء راشدین کے اسوہ کے مطابق بھی خلافت و امامت کی اہلیت رکھتا تھا[۷۹]۔ اس طور سے سلیمان کے نامزد خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم کی ذات میں طریقِ شوریٰ و روایتِ تفوق نسل عربی دونوں مجتمع ہو گئیں، یہ یقیناً ایک خوشگوار تبدیلی تھی اور امت نے بجا طور پر اطمینان کا سانس لیا، حتیٰ کہ خوارج نے اپنی تمام شورہ پشتی و خیرہ سری کے باوجود، اس تقرر کو پسند کیا ان کے دور خلافت میں انہوں نے عموماً مسلح جدوجہد سے احتراز کیا، اسی طرح شیعانِ علیؓ نے بھی ان کی خلافت کو قبول کیا[۸۰]۔ یوں ۹۹ھ میں ایک

اصلاح کی صورت نکلی، بگاڑ کی فضاء بدلی اور امت میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ جناب عمر بن عبدالعزیزؒ کی نامزدگی کے لیے سلیمان بن عبدالملک کی کھلے دل سے تعریف کی گئی ہے اور فاتحین اسلام کے استیصال کو بھی امت نے اس کارِ خیر کی وجہ سے برداشت کرلیا۔ امت نے سلیمان کو ''مفتاح الخیر'' یعنی ''کلید خوبی'' کے لقب سے نوازا، لیکن اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد دوسرا جانشین اپنے بھائی یزید بن عبدالملک کو نامزد کرکے، اس تبدیلی کے اچھے اثرات کو محدود اور اس کی برکات کو کم کردیا[۸۱]۔ ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو موت نے مہلت دی ہوتی اور وہ تین سال کے مختصر عرصہ کے بجائے زیادہ طویل عرصہ تک مسند نشینِ خلافت رہتے تو اسلام کے نظام سیاست کاری میں بہتری پیدا ہوتی اور اس کی وہ گت نہ بنتی جو بعد کے ادوار (بقیہ عہد اموی، عہد عباسی وغیرہ) میں ہوئی، کیونکہ تاریخ نے یہ واقعہ محفوظ رکھا ہے کہ وہ یزید ثانی کی ولی عہدی کے باوجود اتقی، امثل اور اصلح ہونے کی بناء پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پوتے قاسم بن محمد کو اپنا جانشین (خلیفہ) اور امت کا امام مقرر کرنا چاہتے تھے۔[۸۲]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد ۱۰۱ھ میں ولی عہدی کی بناء پر یزید بن عبدالملک سریر آرائے خلافت ہوا۔ خاندانی شرف میں وہ اپنے بھائیوں سے ممتاز تھا کہ یزید اول کا نواسہ اور سفیانی خانوادہ کا بھی فرد تھا اور مروانی خانوادہ کا بھی۔ مگر جناب معاویہؓ کی پوتی عاتکہ بنت یزید اور مروان بن حکم کے بیٹے عبدالملک کے فرزند ہونے کے سوا اس میں کوئی خصوصیت و اہلیت نہ تھی۔ بہرحال جوں توں کرکے اس نے پانچ سال کی مدت گزار دی اور ۱۰۵ھ میں مرنے سے پہلے اپنے بھائی ہشام بن عبدالملک کو اور اس کے بعد اپنے بیٹے ولید بن یزید (ولید ثانی) کو اپنا جانشین مقرر کرگیا۔ یوں بیک وقت دو ولی عہدوں کی بدعت جاری و ساری رہی۔[۸۳]

ہشام بن عبدالملک کا عہد خلافت ۱۰۵ھ سے ۱۲۵ھ تک نسبتاً ایک طویل عرصہ ہے۔ اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور سادہ اخلاق کے لیے اس کے دور کی مورخین نے

تعریف کی ہے، وہ اپنے خاندان کا آخری مدبر تھا، مگر ولی عہد دوم نکما اور نااہل ترین شخص تھا، اسی لیے ہشام اپنے اس جانشین کو معزول کرنا چاہتا تھا، مگر یہ اموی خاندان اور دنیائے اسلام کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو پایا اور جب ۱۲۵ھ میں اس کا انتقال ہوا تو بدترین خاندانی عداوتوں کے پس منظر میں ولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان بن حکم، اپنے چچا ہشام بن عبدالملک جیسے مدبر و منتظم کا جانشین ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خاندانی عداوتوں اور قبائلی لڑائیوں کا آغاز ہوگیا جس نے اموی خلافت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ [۸۴]

ولید بن یزید (ولید ثانی) نے ۱۲۵ھ سے ۱۲۶ھ تک سوا سال کے قریب حکومت کی، ولید اول اور ہشام کے گھرانوں سے اس کی عداوت نفرت میں بدل گئی تھی، یوں بنو امیہ کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا، لیکن ولید ثانی کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ اس کی مذہب سے بے راہ روی اور خلاف مذہب حرکات تھیں، اس کا چچا ہشام اس سے اسی لیے ناراض تھا اور اسے منصب خلافت سے اس کے فسق و فجور کے باعث ہٹانا چاہتا تھا۔ عہد عباسی کے مورخین نے، یقیناً ولید ثانی کی جانب بہت سی غلط باتیں بھی منسوب کر دی ہیں مگر یہ سچ ہے کہ اس کی مے نوشی، موسیقی سے شغف، شعائر اسلام کے استخفاف اور فسق و فجور کی روایتیں متواتر ہیں اور ان سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کی ان ''مذہب مخالف'' حرکات کی وجہ سے شام میں اس کے خلاف مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جس میں پیش پیش اس کے خاندان کے افراد ہی تھے۔ مخالفوں کے ٹولے کا سردار یزید بن ولید بن عبدالملک بن مروان (یزید ثالث) تھا، جو اپنے تقویٰ اور نیکوکاری کے لیے مشہور تھا [۸۵]۔ بہرکیف جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ میں اپنے محاصرہ کے دوران میں ولید ثانی نے محاصرین کے سرغنہ یزید بن عنبسہ سکسکی سے اس کی مخالفت کی وجہ دریافت کی، تو اس نے یہ جواب دیا:

''ہم تمہارے مخالف اس لیے نہیں ہیں کہ ہمیں تم سے کوئی ذاتی عداوت ہے، ہم تو تمہاری مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ تم نے ان چیزوں کو حلال کر لیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ

نے حرام قرار دیا ہے، تم شراب پیتے ہو، تم اپنے باپ کی لونڈیوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہو اور تم اللہ کے دین کا استخفاف کر رہے ہو اور اللہ کے احکام کو پامال کر رہے ہو"۔[۸۶]

اسلام کے نظام سیاست کاری کی تاریخ میں خصوصاً عہد اموی کے تناظر میں یہ ایک نئی اور مستحسن روش تھی، بعد میں بھی ہم اس کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ ان مثالوں سے عہد اموی کی مزعومہ ''لامذہبیت'' کی ان روایتوں کی بے اصلی ثابت ہو جاتی ہے، جنہیں عہد عباسی کے درباری وضاعین نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی غرض سے بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے۔[۸۷]

جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ میں ولید ثانی کے قتل کے بعد اس کا برادر عم زاد یزید بن ولید (یزید ثالث) سریر آرائے خلافت ہوا۔ اس کا عہد نہایت مختصر اور داخلی انتشار سے پُر ہے۔ اس نے چھ ماہ کی حکومت کے بعد ذوالحجہ ۱۲۶ھ میں انتقال کیا۔ اس کے دور کی دو باتیں ہمارے موضوع سے بطور خاص تعلق رکھتی ہیں، ایک اس کی ''مذہبیت'' دوسری اس کی ''شورویت''۔ جب اس کی بیعت کی جانے لگی اور اس کے حامیوں نے اس کا نام تجویز کیا تو وہ کھڑا ہوا اور کہا:

''بار الہا! اگر میری خلافت تیری رضا کی خاطر ہے، تو میری دستگیری فرما اور میری اصلاح کر، لیکن اگر ایسا نہ ہو، اور یہ بیعت خلافت تیری خوشنودی کے لیے نہ ہو، تو اسے مجھ سے میری موت کے ذریعہ پھیر لے (یعنی مجھے موت دے دے)''۔[۸۸]۔

یزید ثالث کے شش ماہہ عہد کی دوسری اہم بات جو سیاسی تغیرات اور نظام میں تبدیلی کے طالب علم کے نقطہ نگاہ سے بڑی اہمیت کی مالک ہے، وہ اس کی تقریر ہے جو اس نے اپنی بیعت کے بعد لوگوں کے سامنے کی تھی۔ اس نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا:

''لوگو! اللہ کی قسم میں نے غرور و تکبر، دنیا کی حرص و طمع اور حکومت کی طلب و رغبت کے سبب یہ خروج نہیں کیا، اگر میں ایسا کروں تو میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کروں گا اور میرا رب مجھ پر رحم نہ کرے گا۔ میں نے یہ خروج اللہ، اس کے رسول اور اس کے دین کی

خاطر کیا، کیونکہ ہدایت کے نشانِ راہ کو ڈھایا جا رہا تھا، پرہیزگاروں کے نور کو بجھایا جا رہا تھا، سرکش ظالم غالب ہوگیا تھا، جس نے ہر حرمت کو حلال کر دیا تھا اور ہر بدعت کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ بخدا نہ اللہ کی کتاب (قرآن) کی تصدیق کرتا تھا اور نہ روز حساب (قیامت) پر اس کا ایمان تھا۔ وہ حسب میں میرا ابن عم اور نسب میں میرا کفوء وہم سر تھا۔ جب میں نے یہ حالات دیکھے تو اس معاملہ میں اللہ سے بھلائی طلب کی (استخارہ کیا) اور یہ دعاء کی کہ میں اپنے نفس پر اعتماد نہ کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے علاقہ کے لوگوں کو جنہوں نے میری پکار پر لبیک کہا، بلایا اور اس کام (ولید ثانی کے عزل) میں کوشش کی یہاں تک کہ اللہ نے عباد (بندوں) اور بلاد (ملک) کو ولید سے نجات دلائی۔ ایسا میری قوت و طاقت سے نہیں بلکہ اللہ کی قوت و طاقت سے ہوا۔

لوگو! مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ میں اس وقت تک پتھر پر پتھر اور اینٹ پر اینٹ نہ رکھوں (کوئی عمارت تعمیر نہ کراؤں) نہ کوئی نہر کھدواؤں، نہ کسی قسم کا مال اکٹھا کروں، نہ اسے زن و فرزند کو بخشوں اور نہ ایک علاقہ (بلد، صوبہ، خطہ) سے دوسرے علاقہ کو منتقل کروں، جب تک کہ اس علاقہ کی سرحدوں کی حفاظت کا بندوبست نہ کرلوں اور وہاں کے ضرورت مندوں کی اعانت و دستگیری نہ کرلوں۔ اگر اس علاقہ کی ضروریات کی تکمیل کے بعد بھی کچھ مال بچ رہے گا، تو میں اسے اس کے متصل زیادہ ضرورت مند علاقے کو منتقل کردوں گا۔ میں تم لوگوں کو تمہاری سرحدی فوجی چھاؤنیوں میں زیادہ عرصہ تک مقیم نہ رکھوں گا جس ۔۔۔ تم اور تمہارے اہل خانہ فتنے میں مبتلا ہوجائیں۔ میں تم لوگوں پر اپنے دروازے بند نہ ۔۔۔ں گا، کہ تمہارے قوی افراد تمہارے کم زور اشخاص کو ہڑپ کرجائیں۔ میں تمہارے ۔۔۔یوں کو جزیہ سے اس قدر زیر بار نہ کروں گا کہ وہ اپنے علاقوں سے ترک وطن کرجائیں اور ان کی نسل ختم ہوجائے۔ میں تم لوگوں کو تمہارے عطیے (اعطیات) سالانہ اور تمہاری تنخواہیں (ارزاق) ماہانہ اداء کرتا رہوں گا تا آنکہ مسلمانوں کے مابین معیشت کے وسائل کی فراوانی ہوجائے اور ان میں جو لوگ دور ہیں وہ ان کے مانند ہوجائیں جو قریب تر ہیں۔

تم لوگوں سے میں نے جو وعدے کیے ہیں، اگر میں انہیں پورا کروں تو تم پر میری اطاعت، فرماں برداری و حسن منشورہ (ذمہ داری میں ہاتھ بٹانا) لازم ہے۔ اگر میں اپنے وعدے ایفاء نہ کروں، تو تمہیں اختیار ہے کہ مجھے منصب خلافت سے علیحدہ کردو، یا پھر مجھ سے توبہ کرواؤ اور اگر میں توبہ کرلوں، تو میری توبہ کو تسلیم کرلو۔ اگر کوئی ایسا شخص تمہارے علم میں ہو، جو صلاح و تقویٰ سے معروف ہو اور تمہیں اپنی طرف سے ان حقوق کے دینے پر آمادہ ہو جو میں تمہیں دے رہا ہوں، اور تم اس کی بیعت کرنا چاہتے ہو، تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اس کی بیعت کر کے اس کی اطاعت قبول کرلے گا۔

لوگو! خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی طاعت لازم نہیں، وعدہ خلافی سے اس کے لیے کوئی ایفاء عہد نہیں، بے شک اطاعت تو اللہ ہی کی ہے، اس وقت تک امام کی اطاعت کرو جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرے، اگر وہ اللہ کی نافرمانی کرے اور معصیت کی جانب لوگوں کو بلائے، تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے اور اس کی گردن ماردی جائے، میں یہ بات کہتا ہوں اور اللہ سے اپنے لیے اور تم سب کے لیے دعاء مغفرت کرتا ہوں''۔[۸۹]

یزید ثالث کا یہ خطبہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے خطبۂ خلافت کی صدائے بازگشت ہے۔ ربیع الاول ۱۱ھ میں مسجد نبوی میں منبر رسول ﷺ سے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے روبرو کی گئی تقریر، اسلام کے نظام سیاست کی اساس اور اس کی کارکردگی کی بنیاد ہے۔ امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے حمد و صلوۃ کے بعد لوگوں سے یہ خطاب کیا تھا:

''لوگو! مجھے تمہارا والی و امیر مقرر کیا گیا ہے، لیکن میں تم لوگوں سے برتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں، تو میری اطاعت کرو، اور اگر میں غلطی کروں، تو میری اصلاح کرو، صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ تم میں سے جو لوگ کمزور ہیں، وہ میرے نزدیک قوی ہیں، تاآنکہ میں ان کے لیے ان کا حق نہ لے لوں، اور تم میں جو لوگ قوی ہیں، وہ میرے نزدیک کمزور ہیں، یہاں تک کہ میں ان سے حق واپس نہ لے لوں،

انشاء اللہ۔ تم میں سے کسی کو جہاد سے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ جو قوم جہاد ترک کردیتی ہے، اللہ اسے ذلیل و خوار کردیتا ہے۔ میں جب تک اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں، تو تم لوگوں پر میری اطاعت فرض نہیں ہے''۔[۹۰]

یزید ثالث کے خطبہ میں جن مالی اصلاحات و مواعید کا ذکر ہے، وہ عہد اموی کی بے اعتدالیوں کی نشان دہی کرتی ہیں اور ان سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ اسلامی نظام سیاسی میں ''مقامیت'' یا ''صوبائیت'' کا کس حد تک عمل دخل ہو گیا تھا۔ یہ امر عربوں کی مرکز گریز فطرت کا عکاس ہے اور اموی عہد کے تحزب، تشیع و قبائلی تعصب کا اسے لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اوپر ذکر کی گئی دونوں تقریروں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امام و خلیفہ کے ''عزل'' کا اختیار ''امت'' کو حاصل تھا، لیکن کسی واضح و مسلّم طریقہ کی عدم موجودگی میں یزید ثالث کو تلوار کا سہارا لینا پڑا اور جب تلوار حکم بنتی ہے تو انتشار و تشتت کی کوکھ سے ''فتنہ'' جنم لیتا ہے جو ''فساد'' اور بگاڑ کی آخری حد ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا اور شام میں عربوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر ''الجزیرہ'' کے اموی گورنر مروان بن محمد بن مروان نے، کہ پہلے مروانی خلیفہ کا پوتا تھا، علم بغاوت بلند کردیا اور ۱۲۷ھ میں دمشق پر اپنا قبضہ کرکے یزید ثالث کے ولی عہد و نامزد جانشین ابراہیم بن ولید بن عبدالملک بن مروان کو معزول اور ولی عہد دوم عبدالعزیز بن حجاج بن عبدالملک بن مروان کو ولایت عہد سے الگ کردیا''۔[۹۱]

مروان بن محمد بن مروان (مروان ثانی) کا شش سالہ عہد ۱۲۷ھ سے ذوالحجہ ۱۳۲ھ تک، داخلی انتشار کا دور ہے[۹۲]۔ شامی عربوں، اولاد ولید اول، سلیمان و ہشام کی مخالفتوں اور خانہ جنگیوں پر مستزاد الجزیرہ اور عرب کے خوارج کی بغاوتوں نے حکومت کے شیرازے کو بکھیر کر رکھ دیا، جس سے مشرق (خراسان) سے سیاہ بادلوں کی طرح اٹھنے والی عباسی تحریک اپنے سیلاب میں اموی حکومت کو بہا لے گئی اور پایانِ کار دریائے ''زاب'' کے کنارے اموی خلافت کا سفینہ کہ عربوں کی بالادستی کی کشتیٔ نوح تھا، غرق آب ہو گیا

[۹۳] اور پھر عربوں کی خالص بالادستی (اقتدار محت) کا خواب "دیوانے کا خواب" بن گیا۔ اس عبرت ناک سانحہ کی نوحہ خوانی و داستان سرائی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کے استحقاق خلافت کی بنیاد بھی ولی عہدی ٹھہری۔ ولید ثانی نے اپنے پندرہ ماہ کے مختصر اور پرشور و پرفسق و فجور عہد میں بھی اپنے بعد اپنے دو بیٹوں حکم بن ولید ثانی و عثمان بن ولید ثانی کو ولی عہد نامزد کیا تھا [۹۴] اور تمام ممالک محروسہ سے ان دونوں کی ولی عہدی کی بیعت لی گئی تھی۔ یزید ثالث نے ان دونوں کو ان کے باپ کے قتل کے بعد قید کر دیا تھا، جب ابراہیم بن ولید اول خلیفہ ہوا اور مروان ثانی نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دمشق کے قریب فوج لے کر چڑھ آیا تو ابراہیم کے آدمیوں نے ولید ثانی کے محبوس ولی عہدوں کو قتل کر دیا تا کہ مروان ثانی انہیں منصب خلافت پر متمکن نہ کر سکے، اس ہنگامۂ قتل و غارت سے ایک اموی سردار ابو محمد سفیانی زندہ بچ رہا تھا، اس نے مروان کے روبرو یہ شہادت دی کہ ان ولی عہدوں نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور حکم بن ولید ثانی کے چند اشعار سنائے جن میں یہ شعر بھی تھا: [۹۵]

فَاِن اَهلِک اَنا وَوَلیُّ عَهدی فَمَروانُ اَمیرُ المؤمنینا

(یعنی اگر میں اور میرا ولی عہد (عثمان) مارے جائیں تو مروان (ثانی) مسلمانوں کا امیر اور امام و خلیفہ ہوگا)

ہم اس بحث کو اموی عہد تک کے تغیرات و تطورات کے حوالے سے مروان ثانی کے ایک مکتوب کے اہم نکات پر ختم کرنا چاہتے ہیں، جن سے اموی خلفاء کا خلافت سے متعلق نظریہ واضح ہوتا ہے۔ یہ مکتوب ولید ثانی کے بھائی غمر بن یزید بن عبدالملک بن مروان کو لکھا گیا تھا: [۹۶]

''یہ خلافت اللہ کی جانب سے اس کے رسولوں کے منہج و سنت پر اور اس کے دین کے قوانین (شرائع) کے قیام و انصرام پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خلفاء کو یہ منصب عطاء فرما کر، شرف و بزرگی عطاء کی ہے، اللہ نے ان خلفاء کو اور ان کا احترام کرنے والوں کو عزت و

اقتدار ارزانی فرمایا ہے، جنہوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کے برخلاف راستہ اختیار کیا ان پر ہلاکت ہو، مسلمانوں کی مدد کے ساتھ خلافت کے حقوق کو مرعی رکھنے والے یکے بعد دیگرے اٹھتے رہیں گے"۔

حواشی

[۱] القرآن المجید، البقرہ ۱۴۳، آل عمران، ۱۱۰، ۱۵۹، النساء ۵۹، النور ۵۵، الشوریٰ ۳۸، الحج ۴۱۔

[۲] ابن خلدون، المقدمہ، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر س ن، ص ۱۹۲، ابوالحسن الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵ و بعد۔

[۳] محمد بن عبدالکریم الشہرستانی، الملل والنحل، مطبوعہ مصطفیٰ البابی والحلبی ۱۹۶۱ء، جلد اول، صفحہ ۲۴ تا ۲۷۔

[۴] الشہرستانی، الملل والنحل، جلد اول، ص ۱۴ تا ۱۶۔

[۵] محمد بن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک، مطبوعہ دارالمعارف مصر ۱۹۶۹ء، جلد ہشتم، صفحہ ۶۳۱ و بعد۔

[۶] ابن الاثیر جزری، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۷ء، جلد دوم، صفحہ ۲۲۰۔

[۷] طبری، جلد سوم، صفحہ ۲۲۰ و بعد۔

[۸] طبری، ۳: ۳۲۱ و بعد، ابن کثیر دمشقی، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ القدوسیہ، لاہور ۱۹۸۴ء، جلد ہشتم، صفحہ ۳۰۲۔

[۹] ابن الاثیر، ۲: ۲۱۷۔

[۱۰] ابن الاثیر، ۲: ۲۲۰۔

[۱۱] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۱۹۱۔

[۱۲] ابن الاثیر، ۲: ۲۹۲، ۲۹۳۔

[۱۳] الماوردی، ص ۱۰۔

[۱۴] طبری، ۴: ۲۳۲۔

[۱۵] ابن الاثیر، ۲: ۲۹۱ و ۲۹۲۔

[۱۶] طبری، ۴: ۲۲۸۔

[۱۷] طبری، ۴: ۲۲۷ و ۲۲۸۔ [۱۸] ابن الاثیر، ۳: ۲۷ و بعد۔

[۱۹] ابن الاثیر، ۳: ۳۴ تا ۴۰۔

[۲۰] طبری، ۴: ۲۲۸ (سیدنا عمر فاروق کا قول (مثلاً)۔

[۲۱] ابن الاثیر، ۳: ۱۱۴۔

[۲۲] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۵، طبری ۴: ۲۲۷۔

[۲۳] طبری، ۴: ۴۲۹۔۴۳۲ و ۴۳۷۔ [۲۴] طبری ۴: ۴۳۷۔

[۲۵] طبری، ۴: ۴۲۹ تا ۴۳۱ و ۴۶۷ و ۴۶۸۔

[۲۶] طبری، ۴: ۴۴۲۔ [۲۷] طبری، ۴: ۴۵۶۔

[۲۸] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۵۔

[۲۹] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۱۴۔ [۳۰] طبری، ۵: ۱۰۱ و بعد۔

[۳۱] طبری، ۵: ۱۴۰۔ [۳۲] طبری، ۵: ۱۶۱۔

[۳۳] طبری، ۵: ۱۴۶ و ۱۴۷۔ [۳۴] طبری، ۵: ۱۶۲ و ۱۶۳۔

[۳۵] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۵ و ۲۰۶۔

[۳۶] طبری، ۵: ۳۰۱ تا ۳۰۴۔ [۳۷] طبری، ۵: ۳۲۳۔

[۳۸] ابن الاثیر، ۳: ۲۵۲۔

[۳۹] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۶ و ۲۰۷۔

[۴۰] طبری، ۵: ۳۴۲۔ [۴۱] طبری، ۵: ۳۳۸ تا ۳۴۲۔

[۴۲] طبری، ۵: ۴۰۰ و بعد۔ [۴۳] طبری، ۵: ۴۸۵ و بعد۔

[۴۴] طبری، ۵: ۴۸۷ و بعد۔ [۴۵] طبری، ۵: ۴۹۶ و بعد۔

[۴۶] طبری، ۵: ۵۳۰ و ۵۳۱۔

[۴۷] احمد امین، فجر الاسلام، مطبوعہ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۹۱ و بعد۔

[۴۸] ابن الاثیر، ۲: ۲۷۶ و ۲۹۸۔ [۴۹] فجر الاسلام، ص ۱۵۲ تا ۱۵۶۔

[۵۰] فجر الاسلام، ص ۱۷۰ و بعد۔
[۵۱] فجر الاسلام، ص ۱۸۲ و بعد۔
[۵۲] طبری، ۷: ۲۶۲ و بعد۔
[۵۳] طبری، ۵: ۵۳۰ و ۵۳۱۔
[۵۴] طبری، ۵: ۵۳۴۔
[۵۵] طبری، ۶: ۷ و بعد۔
[۵۶] طبری، ۶: ۱۱۹۔
[۵۷] طبری، ۶: ۱۳۸۔
[۵۸] طبری، ۵: ۵۳۶ و ۵۳۷۔
[۵۹] طبری، ۵: ۵۳۵ و بعد۔
[۶۰] طبری، ۵: ۵۳۰۔
[۶۱] طبری، ۵: ۵۳۶۔
[۶۲] طبری، ۵: ۵۲۹ و ۵۳۰۔
[۶۳] طبری، ۵: ۵۵۱ و بعد۔
[۶۴] طبری، ۶: ۱۳ و ۱۴۔
[۶۵] فجر الاسلام، ص ۲۵۷ و بعد۔
[۶۶] حسن ابراہیم حسن، تاریخ الاسلام السیاسی، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۶۴ء، جلد اول، صفحہ ۳۴۲۔
[۶۷] تاریخ الاسلام السیاسی، ۱: ۴۱۱۔
[۶۸] طبری، ۶: ۱۳ و بعد، شہرستانی، ۱: ۱۴۷ تا ۱۵۰، تاریخ الاسلامی السیاسی، ۱: ۴۰۲ و بعد۔
[۶۹] فجر الاسلام، صفحہ ۲۶۷ و بعد۔
[۷۰] فجر الاسلام، ص ۲۵۸ تا ۲۶۱۔
[۷۱] طبری، ۶: ۴۱۸۔
[۷۲] طبری، ۵: ۵۳۷۔
[۷۳] طبری، ۵: ۶۱۰۔
[۷۴] طبری، ۶: ۴۱۶۔
[۷۵] طبری، ۶: ۴۹۸ و ۴۹۹۔
[۷۶] ابن الاثیر، ۴: ۱۳۷ تا ۱۴۲۔
[۷۷] طبری، ۶: ۱۴۵۔
[۷۸] ابن الاثیر، ۳: ۳۴۷۔
[۷۹] طبری، ۶: ۵۵۰۔
[۸۰] طبری، ۶: ۵۵۵ و بعد، ابن الاثیر، ۴: ۱۶۳۔
[۸۱] ابن الاثیر، ۴: ۱۵۱۔
[۸۲] طبری، ۶: ۵۶۵ و بعد، ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۶ و ۲۰۷۔
[۸۳] طبری، ۶: ۵۷۴ و بعد۔
[۸۴] طبری، ۷: ۲۰۹ و بعد۔

[۸۵] طبری، ۷:۲۳۱ و بعد۔
[۸۶] طبری، ۷:۲۴۶۔
[۸۷] جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء، مطبوعہ اصح المطابع، کراچی س ن، صفحہ ۱۸۔
[۸۸] طبری، ۷:۲۴۰۔
[۸۹] الجاحظ، البیان والتبیین، مطبوعہ دار صعب، بیروت س ن، جلد دوم صفحہ ۲۸۴، طبری، ۷:۲۶۸ و ۲۶۹۔
[۹۰] ابن الاثیر، ۲:۲۲۴ و ۲۲۵۔
[۹۱] طبری، ۷:۳۰۰ و بعد۔
[۹۲] طبری، ۷:۴۴۲۔
[۹۳] طبری، ۷:۳۰۰ و بعد۔
[۹۴] طبری، ۷:۲۱۸۔
[۹۵] طبری، ۷:۳۱۱ و ۳۱۲۔
[۹۶] طبری ۷:۲۸۱۔

(مطبوعہ ۲۰۰۱ء)

○○○

اسلام کا نظامِ احتساب

مفہوم :

اسلام ایک مکمل ضابطہٗ حیات پیش کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے دنیوی اظہار کو مقصد نہیں حصولِ مقصد کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ انسان کی یہ زندگی دراصل ایک مکمل، مقدس اور بامقصد زندگی کی منزل کا جادہ ہے، خود منزل نہیں ہے۔ مزرعہٗ ہستی کا حاصل اُس زندگی میں ملے گا جو اِس کے بعد آنی ہے۔ یہ زندگی جہد مسلسل اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔ یہاں کا ہر لمحہ اُس منزل مقصود کی جانب ایک قدم ہے جو حاصل زیست اور سرمایہٗ حیات ہے۔ ہمارا یہ قدم صحیح منزل کی جانب اٹھتا ہے یا غلط سمت کی طرف، اس کی نگرانی اور دیدبانی ریاست اسلامی کا فریضہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَلتَکُن مِّنکُم اُمَّۃٌ یَّدعُونَ اِلَی الخَیرِ وَیَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَیَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ

''تم میں ایک ایسی جماعت موجود ہو جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے منع کرے''۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امتِ اسلامیہ پر فرداً فرداً بھی فرض ہے اور اجتماعی طور پر بھی ''ترک معروف اور فعل منکر کے ظہور پر بھلائیوں کے کرنے کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا'' احتساب کہلاتا ہے[۱]۔ یہ احتساب انسانی اعمال پر تحدید عائد کرتا ہے، افعال سیئہ سے احتراز کی تلقین کرتا ہے اور ان کے ارتکاب پر دار و گیر کرتا ہے اور یوں معاشرہ کو برائیوں سے محفوظ رکھنے کا نہایت ہی موثر ذریعہ ہے۔ اسلامی

ریاست اپنے اس فرض کی انجام دہی کی غرض سے جو ادارہ قائم کرتی ہے اسے حسبة (احتساب) کہتے ہیں۔

نشوونما:

حضرت عمر فاروقؓ پہلے شخص تھے جنہوں نے نظامِ احتساب کی بنیاد رکھی۔ وہ محتسب کے فرائض خود انجام دیتے تھے[۲]۔ تاریخ میں ہمیں ان کے احتساب کے بہت سے واقعات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ انہوں نے ایک شتربان کو دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لاد رکھا ہے تو اُسے درے لگائے اور سختی سے ڈانٹا۔ ایامِ حج میں انہوں نے لوگوں کو عورتوں کے ساتھ طواف کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا اور ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ نماز پڑھنے پر دُرے سے مارا[۳]۔ اسی طرح جب ایک ہٹے کٹے آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو نہ صرف یہ کہ اسے زجر و توبیخ کی بلکہ اس کی جھولی جو آٹے سے بھری ہوئی تھی، چھین کر بیت المال کے اونٹوں کے آگے ڈال دی[۴]۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں بھی احتساب کا یہ طریقہ رائج رہا۔ اس دَور میں خلیفة المسلمین کی جانب سے اس فریضہ کی انجام دہی پر کسی دوسرے آدمی کا تقرر بھی کیا جانے لگا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب مدینہ میں کبوتر بازی اور غلیل بازی کی وبا عام ہوگئی تو آپ نے اپنی خلافت کے آٹھویں سال ۳۱ھ میں اس کی روک تھام کی غرض سے ایک شخص کا تقرر فرمایا جو لوگوں کو ایسا کرنے سے روکتا تھا[۵]۔ اس طور سے یہ پہلا موقع تھا کہ احتساب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک شخص کا تقرر کیا گیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے فرائض مخصوص تھے اور انہیں عمومیت حاصل نہ تھی۔ اسی طرح حضرت عثمان کے عہد میں احتساب سے متعلق شوریٰ کا بھی انعقاد ہوتا تھا اور اہلِ شوریٰ کے مشورے سے نبیذ پینے والوں پر جس کا استعمال مدینہ میں بہت بڑھ گیا تھا حد جاری کی گئی[۶]۔ حضرت علیؓ بھی اپنے دَورِ خلافت میں کوفہ میں بنفسِ نفیس احتساب کی خدمت انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ کو اس بات کا پتا چلا کہ اہل کوفہ برسرِ راہ بیٹھ کر منہیات کا ارتکاب کرتے ہیں

تو آپ نے انہیں راستوں میں بیٹھنے سے روک دیا اور انہیں اشرافِ کوفہ کی اس یقین دہانی کے بعد کہ اب ان سے قابل اعتراض حرکات کا صدور نہ ہوگا اس شرط پر اجازت دی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں گے۔ راہ گیروں کو سلام کریں گے۔ ان سے کوئی تعرض نہ کریں گے اور اگر کوئی راہ سے بھٹکا ہوا شخص ان کے پاس آئے تو اسے راستہ بتائیں گے۔[۷]

عہدِ اموی میں بھی احتساب کے فرائض ولاۃ ہی انجام دیتے تھے اور اس کے لیے کوئی علیحدہ محکمہ نہیں قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ زیاد بن ابی سفیان نے اپنے دَورِ امارت بصرہ میں لوگوں کی اخلاقی بے راہ روی کو روکنے کے لیے سخت اقدامات کیے اور شرطہ کو ایسے لوگوں پر تشدد کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ اہل کوفہ و بصرہ جب نماز میں سجدوں سے اٹھتے ہیں تو اپنی پیشانیوں پر لگی ہوئی گرد کو صاف کرتے ہیں تو انہیں یہ خوف ہوا کہ کہیں لوگ اس طریقہ کو نماز کی سنت نہ سمجھ بیٹھیں، اس لیے انہوں نے صحنِ مسجد میں کنکریاں ڈلوادیں تاکہ لوگ ایسا نہ کرسکیں[۸]۔ ولید کے عہد میں خود خلیفہ بازاروں کے نرخوں کی نگرانی کرتا تھا[۹]۔ عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کو وقت سے نماز پڑھنے کی تاکید کی۔ شراب کی دکانوں کو بند کرایا۔ حمام میں تصاویر بنانے اور عورتوں اور مردوں کے ایک ساتھ نہانے پر پابندی عائد کی۔ لوگ زلفیں رکھنے لگے تھے، انہوں نے آدمی مقرر کیے جو ایسی زلفوں کو کاٹ دیتے تھے[۱۰]۔ ہشام کے دَور میں خلیفہ نے احتساب کے فرائض کی انجام دہی سے غفلت نہ برتی۔ اس نے ایسے لوگوں پر سختی کی جو عقائد میں خرابی ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، بدعات کا قلع قمع کیا اور مئے ونغمہ پر پابندی لگائی[۱۱]۔ ہشام ہی کے عہد میں خالد بن عبداللہ قسری والیِ عراق نے اس شکایت پر کہ لوگ مساجد کے ماذنوں پر چڑھ کر پڑوس کے مکانوں میں جھانکتے ہیں۔ ماذنے کی بلندی عام مکانات کی چھتوں سے کم کرادی[۱۲]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ اموی میں احتساب کے فرائض محکمہ شرطہ کو تفویض کیے گئے تھے اور صاحبِ شرطہ ہی اس سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔[۱۳]

عہدِ عباسی میں جہاں بہت سی دفتری اصلاحات ہوئیں، وہیں شرطہ سے احتساب

کی ذمہ داریاں لے کر ایک علیحدہ محکمہ حسبہ قائم کیا گیا۔ یہ مہدی کا عہد تھا۔ مہدی کے بعد سے خلافت عباسی کے اختتام تک احتساب کا علیحدہ محکمہ قائم رہا۔ یہ محکمہ عموماً صیغۂ قضاء کے ماتحت ہوتا تھا[۱۴]۔ مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ محتسب قاضیوں سے بھی تعمیل احکام میں نہ چوکتے تھے چنانچہ بغداد کے والیِ حسبہ ابراہیم بن بطحا نے اپنے عہد کے قاضی القضاء ابوعمر بن حماد کے مکان کے باہر دیکھا کہ اہل مقدمہ دروازے پر بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اُس وقت دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ اور دھوپ نہایت تیز تھی۔ والیِ حسبہ نے قاضی کے حاجب کو بلا کر کہا کہ قاضی صاحب سے جا کر کہو کہ اہل معاملہ دھوپ میں بیٹھے بیٹھے پریشان ہو رہے ہیں۔ اس لیے یا تو باہر نکل کر ان کے مقدمات کے تصفیہ کی غرض سے اجلاس کریں یا پھر معذوری کا اظہار کریں تاکہ یہ لوگ لوٹ جائیں اور اس اذیت سے انہیں نجات ملے[۱۵]۔ عہد عباسیہ میں نہایت لائق اور عالم حضرات احتساب کی خدمت پر مامور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ مقتدر کے عہد خلافت میں ابوسعید اصطخری جو امام شافعی کے نہایت ممتاز اصحاب میں تھے، اس منصب پر فائز تھے۔ والیِ حسبہ کے نائبین بھی ہوتے تھے جو بازاروں اور شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے اور مجرمین کو محتسب کے سامنے پیش کرتے تھے[۱۶]۔

اندلس میں محکمۂ احتساب کو ''خطۃ الاحتساب'' کہتے تھے اور ایک قاضی اس کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ خود بازاروں میں اپنے عملے کے ساتھ جاتا تھا۔ اس کے نائبوں کے پاس باٹ اور ترازو ہوتے تھے اور وہ خریداروں میں سے بچوں وغیرہ کی خریدی ہوئی چیزوں کو لے کر وزن کراتا۔ اگر وزن کم ہوتا تو دکان دار کو سزا دیتا تھا۔ احتساب کے قواعد وضوابط اندلس میں نہایت مستحکم بنیادوں پر مرتب کیے گئے تھے اور ان کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔[۱۷]

بنو فاطمہ کے عہد حکومت میں کسی باعزت شخص کو محتسب مقرر کیا جاتا تھا جو قاضی کے ماتحت ہوتا۔ وہ باری باری سے مصر قدیم اور قاہرۂ معزیہ کی جامع مسجدوں میں اپنے

اجلاس کرتا تھا۔ اس کے نائب بازاروں میں گھوم کر مجرموں کو پکڑتے تھے۔ اپنے احکام کے نفاذ میں یہ شرطہ سے مدد لیتے تھے۔ بنو فاطمہ کے دَور میں محتسب کی تنخواہ تیس دینار ماہانہ ہوتی تھی۔[۱۸]

خلافتِ عباسیہ کے زوال کے زمانہ میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں، ان میں نظامِ احتساب کو بڑی اہمیت دی گئی اور محتسب کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ محمود غزنوی کے عہد میں محتسب کے اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ سلطان کے بڑے بڑے سپہ سالاروں کو بھی بدمستی کی حالت میں سرِ راہ پھرتے ہوئے پکڑ لیا جاتا تھا اور خود سلطان اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ علی نوشتگین جو پچاس ہزار سپاہ کا سالار تھا۔ خدم وحشم کے ساتھ روزِ روشن میں بدمست بارگاہِ سلطان سے اپنے محل کو جاتا تھا کہ محتسب نے جو اپنے عملے کے سَو سوار و پیادہ کے ہمراہ تھا، اسے دیکھ لیا اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ علی نوشتگین کو گھوڑے سے نیچے کھینچ لائیں۔ پھر خود اپنے گھوڑے سے اتر کر اسے نہایت بُری طرح پیٹا۔ اس کے لاؤ لشکر کے لوگ یہ ماجرا دیکھتے رہے اور انہیں چوں کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پٹ پٹا کر جب سپہ سالار گھر جانے لگا تو اپنے کیے پر نادم تھا۔ دوسرے دن سلطان کو اپنی پیٹھ کا زخم دکھایا۔ محمود ہنسا، اور بولا کہ توبہ کرو اور آئندہ بدمستی کی حالت میں گھر سے باہر نہ نکلنا[۱۹]۔ سلاجقہ کے عہد میں بھی احتساب کا نہایت معقول انتظام تھا اور ہر شہر میں ایک محتسب مقرر کیا جاتا تھا۔ دارالحکومت کا محتسب سلطان کے کسی قدیم الخدمت مقرب کو بنایا جاتا تھا۔[۲۰]

برعظیم پاکستان و ہندوستان میں بھی نظامِ احتساب موجود تھا۔ سلاطین دہلی کے دَورِ حکومت میں ہر مسلم آبادی میں ایک قاضی اور ایک محتسب ہوتا تھا۔ غیاث الدین بلبن فعال حسبہ کو ایک اچھی حکومت کی شرطِ اولین سمجھتا تھا۔ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق نے احتساب کے نظام کو بہتر بنانے میں نہایت اہتمام کیا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں محتسب معزز افراد میں سے مقرر کیا جاتا تھا۔ اور اسے آٹھ ہزار تنکہ تنخواہ ملتی تھی۔ بعض اوقات خود سلطان

محتسب کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اسی طرح فیروز تغلق کے عہد میں بھی اس محکمہ کو بڑی اہمیت حاصل رہی [۲۱]۔ مغلوں کے دَورِ سلطنت میں حسبہ کا محکمہ دیوانِ قضا کے ماتحت تھا۔ اہم شہروں میں محتسب ہوتا تھا جسے صدر الصدور کی جانب سے مقرر کیا جاتا تھا۔ ایسے محتسبوں کو دوسو پچاس ذات اور دس سوار کا منصب دیا جاتا تھا۔ سواروں کی ایک تعداد ان کی ماتحتی میں دی جاتی تھی جو ان کو فرائض منصبی کی ادائیگی میں مدد دیتی تھی۔ چھوٹے شہروں میں جن لوگوں کو محتسب کی خدمت تفویض کی جاتی تھی انہیں بھی مناسب تنخواہ اور بطور مدد معاش زرعی زمین دی جاتی تھی۔ اس دَور میں محتسب کا تقرر عموماً صوبائی منصب دار کرتے تھے اور کوئی مرکزی نظامِ احتساب نہ تھا۔ مگر عالمگیر کے عہدِ حکومت میں ایک عالم ملا وجیہہ کو پورے ملک کا محتسب مقرر کیا گیا اور انہیں ایک ہزار ذات اور سو سوار کا منصب دیا گیا اور پندرہ ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی۔ منصب داروں اور احدیوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ کی گئی تاکہ وہ اپنے احکامات پر عمل کرا سکیں۔ اس طور سے سلطنتِ مغلیہ میں سب سے پہلی بار اس زمانہ میں احتساب کا مرکزی نظام وجود میں آیا۔ [۲۲] مختصر یہ کہ اسلام میں احتساب کو ابتدا ہی سے نہایت اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دَور میں یہ محکمہ قائم رہا ہے۔

اوصاف:

محتسب کے عہدے پر کس قسم کے لوگوں کو مقرر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ماوردی نے مندرجہ ذیل اوصاف کی نشاندہی کی ہے:

۱۔ محتسب کو آزاد ہونا چاہئے، کیونکہ غلام کے لیے اس فریضہ کی انجام دہی دشوار ہے۔

۲۔ اسے عادل بھی ہونا چاہئے۔

۳۔ محتسب کو صاحب رائے اور تدبیر بھی ہونا چاہئے۔

۴۔ اسے قوتِ فیصلہ کا مالک ہونا چاہئے اور مقدمات میں جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت اس میں ہونی چاہئے۔

۵۔ امور دینی کی انجام دہی میں محتسب کو نہایت سخت ہونا چاہئے۔

۶۔ اسے منکرات ظاہرہ کا عالم ہونا چاہئے کہ ان کے ارتکاب پر لوگوں کو پکڑ سکے۔

۷۔ محتسب کو بارعب بھی ہونا چاہئے تا کہ لوگ اس سے ڈریں۔[۲۳]

ابو سعید اصطخری جو اپنے عہد کے شافعی فقہاء میں سر آمد روزگار تھے، اس خیال کے حامی تھے کہ جن مسائل میں ائمہ مجتہدین کے مابین اختلافات ہیں ان میں محتسب کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور اپنے اجتہاد پر لوگوں کو عامل ہونے پر وہ مجبور بھی کرسکتا ہے۔ اس صورت میں محتسب کو مجتہد بھی ہونا چاہئے۔ مگر اس بات کو علماء نے تسلیم نہیں کیا ہے اور محتسب کے لیے منکراتِ ظاہرہ سے کماحقہ واقف ہونا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔[۲۴]

فرائض:

محتسب کے فرائض کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیادوں پر مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) امر بالمعروف: وہ امور جن کے کرنے کا محتسب حکم دیتا ہے اور جن پر لوگوں کو عامل بنانا اس کے فرض منصبی کا جزو ہے تین قسم کے ہیں:

۱۔ امور متعلقہ حقوق اللہ۔

۲۔ امور متعلقہ حقوق العباد۔

۳۔ امور مشترکہ مابین حقوق اللہ اور حقوق العباد۔

وہ امور جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اجتماعی: ایسے امور جن کی ادائیگی پر پوری جماعت کو مجبور کیا جائے۔

۲۔ انفرادی: وہ امور جن کی انجام دہی کا فردِ واحد کو پابند کیا جائے۔

اسی طرح حقوق العباد سے وابستہ امور کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عام: وہ امور جن کے کرنے پر عامۃ الناس کو مجبور کیا جائے۔

۲۔ خاص: وہ امور جنہیں انجام دینے کا فردِ واحد کو پابند کیا جائے۔

(ب) نہی عن المنکر: منکرات، جن کے ارتکاب سے لوگوں کو روکنا محتسب کی ذمہ داری

ہے، تین طرح کے ہیں:

۱۔ منکرات متعلقہ حقوق اللہ۔

۲۔ منکرات متعلقہ حقوق العباد۔

۳۔ منکرات مشترکہ مابین حقوق اللہ وحقوق العباد۔

وہ منکرات، جن کے ارتکاب سے اس لیے منع کیا جائے کہ اس سے حقوق اللہ تلف ہوتے ہیں، تین قسم کے ہیں:

۱۔ عبادات: عبادات میں مسنون اور مشروع امور کی مخالفت۔

۲۔ محظورات: ایسے کاموں کا ارتکاب جن سے برائیوں کا شبہ کیا جاسکے اور تہمت لگ سکے۔

۳۔ معاملاتِ منکرہ۔

مندرجہ بالا تقسیموں کی رُو سے محتسب کے جو فرائض متعین ہوتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) امر بالمعروف متعلق حقوق اللہ (اجتماعی):

۱۔ جن قصبات میں انعقاد جمعہ ضروری ہو اگر ان کے باشندے نماز جمعہ کا انتظام نہ کریں تو محتسب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کو ایسا کرنے پر مجبور کرے اور عدم تعمیل کی صورت میں ان سے مواخذہ کرے۔

۲۔ مساجد میں باجماعت نماز کا برپا کرنا اور اذان کا قائم کرنا کہ شعائر اسلام سے غفلت اور ادائیگی سے کوتاہی موجب معصیت ہے۔ محتسب کی ذمہ داری ہے کہ بروقت ادائیگیٔ نماز پر لوگوں کو مجبور کرے۔

(ب) امر بالمعروف متعلقہ حقوق اللہ (انفرادی):

۱۔ اگر کوئی شخص وقتِ مقررہ پر نماز نہ ادا کرے تو محتسب اس سے باز پرس کرے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اگر تارک صلوٰۃ بھول چوک کا عذر کرے تو محتسب کو چاہیے

کہ اس شخص تارک صلوٰۃ کو قیامِ صلوٰۃ پر آمادہ کرے اور اسے تادیب نہ کرے لیکن اگر ایسا شخص اپنی سستی اور کاہلی کا بہانہ بنائے تو پھر محتسب ایسے شخص کو زجر و توبیخ کرے۔

(ج) امر بالمعروف متعلقہ حقوق العباد (عام):

ا۔ اگر کسی شہر میں پینے کے پانی کا مخزن مسدود ہو جائے اور اس کے سوا لوگوں کے پینے کا پانی کہیں اور نہ ہو، بیت المال میں اتنی رقم بھی نہ ہو کہ اس کی مرمت کی جا سکے اور وہاں کے اربابِ استطاعت از خود اس کی درستگی کی تدبیر نہ کرتے ہوں تو محتسب اصحاب حیثیت کو اس کی اصلاح کی ترغیب دے اور اگر وہ لوگ ایسا نہ کریں تو سلطان کو اس کی اطلاع کرے مگر خود ان لوگوں کو کسی قسم کی سزا نہ دے۔

۲۔ اسی طرح اگر کسی شہر کے لوگ ضرورت مند مسافروں کی مدد نہ کرتے ہوں، تو بیت المال کے خالی ہونے کی حالت میں محتسب اربابِ استطاعت کو مسافروں کی مدد کرنے پر آمادہ کرے مگر ان پر اس ترغیب کے علاوہ کوئی جبر نہ کرے۔

۳۔ مساجدِ شہر مرمت طلب ہوں یا منہدم ہو چکی ہوں اور حکومت ان کی مرمت کرنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو تو بھی محتسب اربابِ دولت کو اس جانب مائل کرے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ مساجد کی ضروری مرمت یا تعمیر سے کوتاہی نہ کریں۔

۴۔ اگر کسی ایسے شہر کی فصیل یا شہر پناہ مرمت طلب ہو جو دشمنوں کی سرحدات کے قریب واقع ہے اور بیت المال میں کافی رقم موجود نہیں ہے تو محتسب اس کی اطلاع حاکم وقت کو دے گا اور وہاں کے ذی حیثیت اصحاب کو اس کی مرمت پر مجبور نہیں کرے گا، لیکن اس اطلاع سے جو تاخیر ہو وہ کسی عام نقصان کا باعث بن سکتی ہو تو محتسب کو اس بات کی اجازت ہے کہ لوگوں کو مجبور کر کے شہر پناہ یا فصیل کو درست کرا دے۔

(د) امر بالمعروف متعلقہ حقوق العباد (خاص):

ا۔ اگر کوئی شخص قرض یا کسی حق کی ادائیگی میں تاخیر کرے اور دعوے دار محتسب سے رجوع کرے تو محتسب کو چاہئے کہ بصورتِ استطاعت قرض دار یا مدعا علیہ کو قرض یا حق

کی ادائیگی کا حکم دے اور اس میں سختی سے کام لے مگر اسے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ مدیوں یا مدعا علیہ کو قید کر دے کیونکہ ایسا کرنا اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے۔

۲۔ اگر حکومت کی جانب سے متعلقین کے نان ونفقہ کی ادائیگی کا کسی شخص کو حکم دیا گیا ہے، تو محتسب بصورتِ تاخیر حق داروں کی شکایت پر ایسے شخص سے مواخذہ کرے اور اسے ادائیگی رقم متعینہ پر مجبور کرے۔

۳۔ کم سنوں کی کفالت کی ذمہ داری جب عدالت کی جانب سے کسی شخص پر عائد کردی جائے، اور وہ شخص ایسا کرنے سے پہلوتہی کرے تو محتسب اسے اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا پابند کرے۔

(ہ) امر بالمعروف متعلقہ حقوقِ مشترکہ فی ما بین اللہ والعباد:

۱۔ سرپرستوں کو مجبور کرے کہ یتیموں کی ان کے کفو میں شادی کریں۔ بصورتِ منع، محتسب کو یہ حق نہیں ہے کہ ان سرپرستوں (اولیاء) کو تادیب کرے۔

۲۔ بیوہ عورتوں کو عدت کے احکام کی بجا آوری کا پابند کرے اور بصورتِ مخالفت انہیں سزا دے۔

۳۔ اگر کوئی شخص اپنی جائز اولاد کی پرورش سے پہلوتہی کرے تو اسے مجبور کرے اور تادیباً سزا بھی دے۔

۴۔ مالکوں کو غلاموں اور باندیوں کے حقوق کی ادائیگی کا پابند کرے۔

۵۔ جانوروں کے مالکوں کو ہدایت کرے کہ اپنے مویشیوں کے چارے پانی کا معقول انتظام کریں۔

۶۔ لاوارث بچے کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد اگر کوئی شخص اس کی کفالت میں کوتاہی کرے تو محتسب کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کو لاوارث بچے کی کفالت کے حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرے اور بصورتِ دیگر ایسے بچے کو ایسے شخص کے سپرد کرنے کا اسے پابند کرے جو اس کی کفالت کر سکتا ہو۔

۷۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو کوئی گم گشتہ مال ملا ہو اور وہ اس کی حفاظت سے پہلو تہی کرتا ہو تو محتسب اس کی بھی خبر لینے کا مجاز ہے اور بصورتِ انتقال مال ایسا شخص اس کے نقصانات کے تاوان کا بھی ذمہ دار ہے۔

(و) نہی عن المنکر، متعلقہ حقوق اللہ (عبادات):

۱۔ اگر کوئی شخص عباداتِ اسلامی کی شرعی صورتوں یا ان کے مسنون اوصاف کی مخالفت کا قصد کرے مثلاً، سرّی نمازوں میں جہر کرے، جہری نمازوں میں سرّ کرے، نماز کی رکعتوں میں اضافہ کرے، یا اذان میں غیر مسنون اذکار بڑھائے تو محتسب کو چاہئے کہ ان باتوں کا انکار کرے اور ایسا کرنے والے کو تادیب کرے۔

۲۔ اگر کوئی شخص ماہِ رمضان میں سرِ عام کھا پی رہا ہو تو محتسب کو چاہئے کہ اس سے اکل و شرب کا سبب دریافت کرے۔ اگر بلا عذر شرعی وہ شخص ایسا کر رہا ہے تو اسے سزا دے اور اگر کوئی عذر شرعی ہے یعنی وہ شخص مریض یا مسافر ہے تو اسے ہدایت کرے کہ وہ برسر عام اکل و شرب سے پرہیز کرے۔

۳۔ اگر کسی شخص کے متعلق علم ہو کہ وہ صحت مند ہے اور پھر بھی گداگری کرتا ہے تو محتسب کا فرض ہے کہ اسے ایسا کرنے سے منع کرے۔ اس کی تادیب کرے اور اسے کام کرنے پر مجبور کرے۔

۴۔ اگر محتسب کسی ایسے شخص کو علومِ شرعیہ کی تعلیم دیتے ہوئے دیکھے جو فقیہ یا واعظ نہیں ہے اور اس کی غلط تاویل یا تحریف سے عوام الناس کے دھوکے میں پڑ جانے کا خطرہ ہے تو ایسے شخص کو درس و تدریس سے روک دے اور لوگوں پر اس کی پُرفریبی ظاہر کر دے۔

۵۔ اگر کوئی مبتدع جسے دعوئ علم بھی ہو دین میں ایسی بات نکالے جو اجماع و نص کے خلاف ہو اور اس کی اس بات پر علمائے عصر نے اسے برا بھلا بھی کہا ہو تو ایسے شخص کو سزا دینا محتسب پر لازم ہے۔

۶۔ اگر کوئی مفسر یا راوئ حدیث ایسی تاویل آیات کرے جو ظاہر تنزیل کے خلاف ہو یا منکر و منفرد روایت ہو جس سے لوگوں میں فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو محتسب کو چاہئے کہ اس کا انکار کرے اور ایسے شخص کو ایسا کرنے سے روکے۔ یہ علم، کہ یہ تاویل یا حدیث باعثِ فساد، منکر اور ظاہر تنزیل کے خلاف ہے، محتسب کو علمائے عصر کے متفقہ فیصلوں یا خود اس کی اپنی قوت اجتہاد سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(ز) نہی عن المنکر متعلقہ حقوق اللہ (محظورات):

۱۔ عورتوں اور مردوں کو ایک ساتھ طواف کرنے یا یک جا ہو کر نماز پڑھنے سے روکنا چاہئے۔ اسی طرح انہیں برسرِ عام بات چیت کرنے سے بھی منع کیا جائے۔ محتسب کو چاہئے کہ ان حالات میں شبہ پر عمل نہ کرے بلکہ اطمینان سے تحقیق حال کے بعد سزا دینے کا فیصلہ کرے۔

۲۔ اگر مسلمان شراب سرِ عام لے کر نکلیں تو شراب لنڈھا کر ایسے مسلمان کو سزا دی جائے مگر ذمی کی شراب نہ لنڈھائی جائے، اسے صرف فہمائش کرنا کافی ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص حالتِ نشہ میں برسرِ راہ گھومے تو محتسب کو چاہئے کہ اُسے سزا دے مگر اس سزا کا تعلق حدِ شرعی سے نہیں کہ محتسب کو اس کا اختیار نہیں ہے۔

۴۔ ایسے لغو کھیل کود کے آلات جو حرام ہیں، محتسب کو چاہئے کہ انہیں توڑ دے اور ان کو لے کر باہر آنے والوں کو سزا دے۔ کھیلوں میں ایسے کھیل، جن سے تربیت اور تعلیم یا شوق حلال مقصود ہیں، مباح ہیں۔ صرف غیر مباح کھیلوں پر قدغن ہونی چاہئے۔ کون سا کھیل مباح اور کون سا حرام ہے۔ اس کا فیصلہ حالات کے حسب اقتضاء محتسب کو کرنا چاہئے۔

(ح) نہی عن المنکر متعلقہ حقوق اللہ (معاملات):

۱۔ نکاح محرمات کو روکنا محتسب کا فریضہ ہے۔

۲۔ بیوع فاسدہ کی سختی سے ممانعت کرنی چاہئے۔

۳۔ متعہ سے روکنا بھی محتسب پر فرض ہے۔ کیونکہ وہ زنا کی جانب قدم زنی کرتا ہے جو متفقہ طور پر حرام ہے۔

۴۔ خرید و فروخت کی اشیا میں دھوکہ دہی سے کام لینے والوں کو سختی سے روکنا چاہئے۔

۵۔ قیمت کی ادائیگی میں فریب کرنے والوں پر بھی قدغن کرنا محتسب کے فرائض منصبی ہیں شامل ہے۔

۶۔ مویشیوں کے تھنوں میں خریداروں کو دھوکہ دینے کی غرض سے دودھ جمع کرنا بھی قابل دست اندازیٔ محتسب ہے۔

۷۔ ناپ تول میں کمی کو روکنا اور صحیح اوزان کے چلن کی بھی ذمہ داری محتسب پر ہے۔ اس سلسلہ میں تنازعات کا تصفیہ بھی اسی کا فریضہ ہے۔

(ط) نہی عن المنکر متعلقہ حقوق العباد:

۱۔ اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کے خلاف اس امر کی شکایت محتسب کے اجلاس میں پیش کرے کہ اس کے پڑوسی نے اس کے گھر کے حدود یا حرم سرا میں ناجائز تعمیرات کر لی ہیں یا اس کی دیوار سے متصل درخت لگا لیے ہیں تو محتسب اس کی شکایت کی سماعت اس صورت میں کرنے کا مجاز ہے جبکہ پڑوسی کو اس باب میں کسی قسم کا تنازعہ نہ ہو۔ بصورتِ جواب دعویٰ اس شکایت کی سماعت قاضی کے اجلاس میں ہوگی۔

۲۔ اگر کسی مکان میں لگے ہوئے درختوں کی شاخیں پھیل کر پڑوسی کے مکان میں داخل ہو جائیں اور پڑوسی کو اعتراض ہو، تو محتسب ایسے درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کو کٹوا دے گا مگر درخت کے مالک کو سزا نہ دے گا۔

۳۔ اگر کسی مستاجر کو اجیر سے اُجرت کم دینے یا کام زیادہ لینے کی شکایت ہو تو محتسب دخل اندازی کر کے معاملے کا تصفیہ کرانے کا مجاز ہے۔

۴۔ اگر مریض یا اس کے وارث یہ شکایت کریں کہ ان کے علاج میں طبیب

سستی برت رہا ہے تو محتسب اس میں مداخلت کرے کیونکہ اگر ذرا بھی تساہل برتا گیا، تو لوگوں کی جانوں کو خطرات لاحق ہو جائیں گے۔

۵۔ معلمین طلبہ کو زدوکوب اور تعلیم کی جانب سے غفلت برت کر کم سن بچوں کے اخلاق و آداب کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے ان کی دیکھ بھال بھی محتسب کے ذمہ ہے۔

۶۔ رنگ ریز، پارچہ باف، دھوبی اور سنار کے حالات سے واقف ہونا بھی محتسب کے لیے ضروری ہے۔ اچھے اور دیانت دار اہلِ حرفہ کو باقی رکھنا اور بددیانت لوگوں کو دور کرنا عوام الناس کی بہبود کے لیے ضروری ہے۔

۷۔ کاری گر اگر خراب کام کریں اور لوگوں کو فریب دیں تو ان کے خلاف شکایت کی سماعت بھی محتسب کرے گا اور ان پر جرمانے بھی عائد کرے گا۔

(ی) نہی عن المنکر متعلقہ امور مشترکہ مابین حقوق اللہ وحقوق العباد:

۱۔ لوگوں کو مکانوں کی چھتیں اتنی بلند کرنے سے روکے جس سے دوسروں کی بے پردگی ہونے کا احتمال ہوتا ہو۔

۲۔ ذمیوں کو مسلمانوں سے نمایاں لباس پہننے پر مجبور کرے۔

۳۔ ذمیوں کو ان کے ایسے عقائد کی سرِ عام اشاعت سے جو اسلام کے صریح خلاف ہوں، منع کرے۔

۴۔ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے اور گالی دینے سے ذمیوں کو باز رکھے۔

۵۔ ائمہ مساجد ضرورت سے زیادہ نماز کو لمبی کریں جس سے کم زوروں اور ضرورت مندوں کو تکلیف پہنچے تو اس پر ان کی گرفت کرے۔

۶۔ قاضی اگر فصلِ خصومات میں تاخیر کریں یا اہل مقدمہ کو ان کی خدمت میں باریابی نہ ہو پائے تو محتسب کو اس پر قاضی سے مواخذہ کرنے کا حق ہے۔

۷۔ آقا اپنے غلام سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے تو محتسب اس میں دخل

دینے کا مجاز ہے۔

۸۔ جانوروں پر ان کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ لادنے والوں کو سزا دینا بھی محتسب کی ذمہ داری ہے۔

۹۔ ملاح اپنی کشتیوں میں گنجائش سے زیادہ مال لادیں جس سے کشتی کے غرق ہوجانے کا اندیشہ ہو تو محتسب اس کی بھی گرفت کرسکتا ہے۔ اسی طرح تیز ہوا میں کشتی چلانے پر اور اگر کشتی میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی سوار ہوں تو انہیں الگ جگہ نہ بٹھانے اور ان کے لیے الگ جائے حوائج ضروریہ کا انتظام نہ کرنے پر بھی محتسب کشتی بان سے مواخذہ کرسکتا ہے۔

۱۰۔ بازاروں میں خوانچہ فروشوں سے گذرگاہوں کو صاف رکھنے کی ذمہ داری بھی محتسب کی ہے، تاکہ راہ گیروں کو تکلیف نہ ہو۔

۱۱۔ شارع عام پر تعمیرات کی روک تھام کرنا اور غیر قانونی طور پر تعمیر ہونے والے مکانوں کو خواہ وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو گروادینا بھی محتسب کا کام ہے۔

۱۲۔ عام استعمال کے مقامات میں تعمیری سامان اور دوسرے اسباب رکھنے والوں کو اگر ان سے لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو روک دینا بھی اس کا فرض منصبی ہے۔

۱۳۔ اسی طرح ان عام استعمال کے مقامات پر کوڑے خانے، نابدان اور باغ کے کنویں کی تعمیر سے اگر مضرت عامہ کا خطرہ ہو تو انہیں بھی محتسب روک سکتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں نقصان عامہ یا عدم نقصانِ عامہ کا فیصلہ محتسب اپنے اجتہاد عرفی سے کرے گا۔

۱۴۔ مُردوں کو ان کی قبروں سے نکال کر دوسرے مقامات پر منتقل کرنے سے بھی لوگوں کو روکنا محتسب کی ذمہ داری ہے۔ ہاں اگر یہ زمین غصب کردہ ہو اور مالک کی مرضی کے خلاف میت کو اس میں دفن کیا گیا ہو تو صاحبِ زمین کی درخواست پر میت منتقل کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر قبر کو موسلا دھار بارش یا سیلاب سے خطرہ ہو تو بھی اس کی منتقلی کی

اجازت دی جاسکتی ہے۔

۱۵۔ انسانوں اور جانوروں کو آختہ کرنے سے بھی روکنا محتسب کی ذمہ داری ہے۔ آختہ کرنے والوں کو سزا بھی دینی چاہئے۔ اگر دیت یا قصاص ضروری ہو تو اس کی ادائیگی کا بھی حکم محتسب دے سکتا ہے۔

۱۶۔ مجاہدین کے علاوہ کسی اور کو سیاہ خضاب لگانے کی اجازت نہ دے اور جو شخص عورتوں کے لیے ایسا خضاب تیار کرتا ہے، محتسب کو چاہئے کہ اسے تادیب کرے مگر مہندی اور کشم کے خضاب سے لوگوں کو نہ روکے۔

۱۷۔ کہانت اور مداری کے طریقوں سے کسب معاش کرنے والوں کو روکے اور ان تماشوں میں پیسہ دینے، لینے والوں کو سزا دے[۲۵]

حدود و اختیارات:

محتسب کو ایسے منکرات کی تفتیش یا تجسس کی اجازت نہیں ہے جو ظاہر نہ ہوں، جب تک جرم ظاہر نہ ہوجائے اسے دست اندازی کا حق نہیں حاصل ہے۔ اسی طرح اسے محض شک و شبہ کی بنا پر لوگوں سے مواخذہ کرنے اور اُن سے بے گناہی کا ثبوت طلب کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ہاں بعض مستثنیات میں وہ اس کلیہ کے خلاف بھی کارروائی کرنے کا مجاز ہے۔ مثلاً اسے یہ اطلاع ملے کہ کچھ لوگوں نے ایک شخص کو قتل کے ارادہ سے حبس بے جا میں رکھ چھوڑا ہے، تو محتسب دست اندازی کرکے وقوعہ سے قبل جرم کا انسداد کرسکتا ہے۔

جن معاملات کی قانونی حیثیت واضح ہو اور ان میں کوئی تنازعہ نہ ہو محتسب اُن میں دخل انداز ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے پڑوس کی زمین میں تصرف بے جا کا ارتکاب کرے اور اس زمین کی ملکیت میں ان کا باہم تنازعہ نہ ہو تو محتسب زیادتی کرنے والے شخص کو سزا دے کر استقرار حق کراسکتا ہے۔ لیکن اگر تصرف بے جا کرنے والے شخص کو اس زمین کی ملکیت میں تنازعہ ہو تو محتسب کو دخل دینے کا حق نہیں۔ اس کا فیصلہ عدالت قضاء

سے ہی ہوگا۔

مختلف اسلامی فرقوں کے مابین جن مسائل میں اختلافات ہیں، ان میں محتسب کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے خیالات کو مخالف فرقوں پر مسلط کرے یا اُن کی خلاف ورزی کی صورت میں اُن سے مواخذہ کرے۔ ہاں اگر ان مسائل مختلف فیہا میں ایسی باتیں بھی شامل ہوں جن کا ارتکاب کسی فتنے کا باعث ہو تو محتسب اس امر کا مجاز ہے کہ انہیں روک دے۔

محتسب کو وزن و پیمانے میں کمی بیشی، خرید و فروخت کی اشیا اور ان کی قیمتوں میں دھوکہ دہی اور اقرار شدہ قرضہ جات کی ادائیگی کے ضمن میں صرف جزوی عدالتی اختیارات حاصل ہیں۔ دیگر امور میں اسے عدالت کے اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

محتسب کی حیثیت قاضی سے کم تر ہے اور قاضی کو یہ اختیار ہے کہ تعمیلِ احکام کے لیے محتسب کو ہدایت جاری کرے۔ اسی لیے بعض نظاماتِ احتساب میں صیغۂ حسبہ کو محکمہ قضاء کے ماتحت بھی کر دیا جاتا تھا۔

محتسب کو مقدمات کی سرسری سماعت کر کے موقعۂ واردات یا اپنے مقامِ اجلاس پر فوری طور پر فیصلے صادر کرنے چاہئیں جبکہ قاضی غور و فکر اور تاخیر سے کام لے کر تحقیق حال کرنے کے بعد فصل خصومات کرتا ہے۔ [۲۶]

جن لوگوں نے محتسب کو اس کے فرائض کی نوعیت کے لحاظ سے (اخلاقِ عامہ کا نگران) یا (بلدیاتی پولیس کا سربراہ) کہا ہے۔ درحقیقت انہوں نے اس کے فرائض کی ہمہ گیری کو نظر انداز کر دیا ہے اور صرف ایک ہی رخ کو پیش نظر رکھا ہے۔ دراصل اس کے فرائض میں بلدیاتی پولس اور اخلاقِ عامہ کی نگرانی ہی نہیں، بلکہ اس کے فرائض کی ایک طویل فہرست ہے جو معاشرتی زندگی کی بہت وسیع حدوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ [۲۷]

حواشی

[۱] ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۳۶۰ھ، صفحہ ۲۴۰۔

[۲] حسن ابراہیم حسن، تاریخ الاسلامی السیاسی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۶۴ء، جلد اول، صفحہ ۴۸۹۔

[۳] الاحکام السلطانیہ، ص ۲۴۹۔

[۴] شبلی نعمانی، الفاروق، مطبوعہ سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۴۵۹ و ۴۶۰۔

[۵] محمد بن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک، مطبوعہ دار المعارف، مصر، ۱۹۶۳ء، جلد چہارم، ص ۳۹۸۔

[۶] بحوالہ سابق۔

[۷] الجاحظہ بصری، البیان والتبیین، مطبوعہ الاستقامۃ، قاہرہ، ۱۳۶۶ھ، جلد دوم، ص ۱۰۷۔

[۸] الاحکام السلطانیہ، ص ۲۴۴۔

[۹] تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۴۹۶۔

[۱۰] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۳۷۷ھ، جلد پنجم، ص ۳۵۷ و بعد۔

[۱۱] ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۶۷ء، جلد چہارم، ص ۲۵۵ و ۲۵۶۔

[۱۲] ابوالعباس المبرد، الکامل فی الادب، مطبوعہ مطبعہ حجازی، مصر، ۱۳۶۵ھ، جلد دوم، ص ۶۶

[۱۳] بنوامیہ کے عہد میں شرطہ کی مدد سے ولاۃ وخلفاء احتساب کے فرائض انجام دیتے تھے۔

[۱۴] ابن خلدون، المقدمہ، مطبوعہ تجاریہ کبریٰ، قاہرہ، س ن، ص ۲۲۶۔

[۱۵] الاحکام السلطانیہ، ص ۲۵۷۔

[۱۶] ایضاً،ص ۲۵۱۔

[۱۷] جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، مطبوعہ دار ہلال، مصر، ۱۹۵۸ء، جلد اول، ص ۲۵۲

[۱۸] حسن ابراہیم حسن، تاریخ الدولۃ الفاطمیہ، مطبوعہ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ص ۳۲۴ و ۳۲۵۔

[۱۹] نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، مطبوعہ رام نرائن پریس، الہ آباد، ۱۹۳۱ء، ص ۳۹ و ۴۰۔

[۲۰] ایضاً، ص ۳۹۔

[۲۱] اشتیاق حسین قریشی، دی ایڈمنسٹریشن آف سلطانیٹ آف دہلی، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۶ و ۱۶۷۔

[۲۲] اشتیاق حسین قریشی، دی ایڈمنسٹریشن آف مغل ایمپائر، مطبوعہ کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۳ و ۲۰۴۔

[۲۳] الاحکام السلطانیہ، ص ۲۴۰ و بعد۔

[۲۴] ایضاً، ص ۲۴۱۔

[۲۵] محتسب کے فرائض سے متعلق تمام بحث کی اساس ابوالحسن الماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ کے باب ہشتم از ص ۲۳۴ تا ۲۵۱ ہے۔ ترتیب و تہذیب میری ہے۔

[۲۶] الاحکام السلطانیہ باب ہشتم صفحات ۲۴۰ تا ۲۵۱ کی مختلف بحثوں سے ماخوذ۔

[۲۷] ایڈمنسٹریشن آف سلطانیٹ آف دہلی، ۱۶۵ و فلپ خودی حطی، ہسٹری آف دی عربس، مطبوعہ نیو یارک، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۲۲۔

(ماہنامہ المعارف، لاہور ۱۹۶۹ء)

○○○

جامعہ نظامیہ بغداد

۲۴۷ھ میں خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ[۱] کی شہادت خلافت عباسیہ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور خلافت کا جسدِ بلند و بالا بتدریج تحلیل ہونے لگا۔ مرکزی حکومت کے ضعف سے فائدہ اٹھا کر بعض طالع آماؤں نے سر اٹھایا اور ملک کے طول و عرض میں چھوٹی چھوٹی خود مختار امارتیں قائم ہونے لگیں۔ اس طوائف الملوکی کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ مرکز گریز قوتوں کے سر اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ رقابت، خانہ جنگی اور انتشار نے دنیائے اسلام کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ اس تباہی اور بربادی سے اسلام سے متصل غیر مسلم ریاستوں نے فائدہ اٹھایا۔ اور ثغور (سرحدات اسلامی) پر تاخت و تاراج کے سلسلے شروع کر دیئے، جہاد کا جذبہ سرد پڑ گیا اور عسکری قوت ضعف و انحلال کی نذر ہوگئی۔ یاس، محرومی اور قنوطیت کے گہرے بادل فضائے اسلامی پر چھا گئے اور بظاہر یہ خیال کیا جانے لگا کہ یہ مریض جاں بلب کوئی دم کا مہمان ہے کہ اسلامی مشرق سے سلجوقی ترکوں کا آفتاب تاباں طلوع ہوا۔

سلطنت سلاجقہ کے بانی طغرل بیگ محمد[۲] نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی جس میں اسلامی عمل داری کے اکثر حصے شامل تھے اور یوں ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہوا۔ طغرل کا جانشین اس کا شہرہ آفاق بھتیجا الپ ارسلاں[۳] ہوا۔ الپ ارسلاں اسلام کی عظمت کی شمشیر براں اور اس کا پشت پناہ تھا۔ اس نے اپنے ولولہ انگیز مجاہدانہ کارناموں سے اسلام کے دشمنوں کی صفوں میں ہلچل مچادی۔ قیصر روم کے سرِ پُر غرور کو اس کے حضور

جھکنا پڑا۔ فتوحات کے علاوہ علم پروری اور علم نوازی میں الپ ارسلان سر آمد روزگار تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ [۴] سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے بھی جہاد کی روح کو مضمحل نہ ہونے دیا، بلکہ اور توانائی بخشی۔ اسی طرح علم و فن کی ترقی میں بھی وہ اپنے اسلاف کی روش کا پیرو رہا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ملک شاہ نے جہاد بالسیف و جہاد بالقلم کو جاری و ساری رکھنے میں اپنے اب و جد کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔

الپ ارسلان اور ملک شاہ کے عہد ہائے حکومت کی بلند عمارت جس شخص کے حسن تدبیر سے تعمیر ہوئی اور جس شخص کے قلمدان وزارت نے عمارت کو مختلف النوع نقش و نگار سے آراستہ کیا وہ ان کا وزیر بزرگ نظام الملک طوسی [۵] تھا۔ طوس کے اس دہقان زادہ کی قسمت میں کشور علم و فن کی سربراہی اور اہل علم و فن کی سرپرستی لکھی ہوئی تھی۔ ہم اس نابغۂ عصر اور یکتائے روزگار شخص کے حالات زندگی کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اور اس بحث کو صرف ان امور تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جن کا تعلق معارف پروری اور قیام مدارس سے ہے۔

نظام الملک نے تعلیم کی توسیع و ترقی میں بڑی کوشش کی اور ممالک محروسہ میں متعدد درس گاہیں قائم کیں، مگر جس درسگاہ نے اسے شہرت دوام عطاء کی وہ بغداد کی عظیم تعلیم گاہ تھی جو اسی کی نسبت سے نظامیہ کہلاتی ہے۔ وہ درس گاہیں جو بغداد کے نظامیہ سے قبل اور اس کے بعد سلطنت سلاجقہ کے علاقوں میں قائم ہوئیں وہ گویا بغداد کی اس درس گاہ سے ملحق تھیں۔ بالفاظِ دیگر نظامیۂ بغداد ایک یونیورسٹی (جامعہ) یا مرکزی ادارہ تھا اور سلطنت سلجوقیہ میں قائم کیے جانے والے دوسرے ادارے اس کے ملحقہ کالج۔

بروز سہ شنبہ یکم ذی القعدہ ۴۵۷ھ مطابق ۱۴/ اکتوبر ۱۰۶۵ء کو شہر بغداد کے مشرقی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین پر مدرسہ کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ تعمیر کے نگران شیخ الشیوخ ابوسعد صوفی نیشاپوری تھے۔ دو سال تک تعمیر کا کام جاری رہا اور یکم ذی القعدہ ۴۵۹ھ مطابق ۱۳/ ستمبر ۱۰۶۷ء کو عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔

عمارت کے صدر دروازے پر نظام الملک کا نام نقش کیا گیا۔ مدرسہ کے چاروں طرف بازار بنائے گئے اور حمام تعمیر کرائے گئے جس سے ایک طرف تو عمارت کے حسن میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف مدرسہ کے لئے مادی آمدنی کا بھی بندوبست ہو گیا۔ پوری تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار کی لاگت آئی۔ عام اندازے کے مطابق یہ رقم آج کل کے ساٹھ لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی۔ اتنی خطیر رقم خرچ کر کے جو عمارت بنائی گئی ہو اس کی وسعت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ خصوصاً اس لئے بھی کے اس زمانے میں تعمیری سامان کی قیمت اور معماروں کی اجرت نسبتاً بہت کم تھی۔

روز شنبہ ۱۰ ذی القعدہ ۴۵۹ ھ۔ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۰۶۷ء کو نظامیہ کی رسم افتتاح انجام پائی اس موقع پر پورا شہر نئی عمارت میں امنڈ آیا۔ تقریب کا آغاز شیخ ابو اسحاق شیرازی کو کرنا تھا مگر وہ بعض شکوک کی بنا پر اس میں شریک نہ ہوئے تو شیخ ابو نصر بن صباغ نے سند درس کو رونق بخشی اور یوں نظامیہ میں تدریس شروع ہوئی۔[۶]

نظامیہ کی انتظامی ساخت نہایت منظم اور باقاعدہ تھی۔ مستشرق لیوی نے، اے بغداد کرانیکل میں اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ اس نظام کو بعد میں یورپ کی جامعات نے اختیار کیا اور مغربی جامعات کی انتظامی ہیئت اسی کی نقل تھی۔[۷]

نظامیہ کے عہدہ داروں میں سب سے بڑا عہدہ دار متولی کہلاتا تھا۔ اسے جدید جامعات کا وائس چانسلر سمجھئے۔ دفتری نظام کا سربراہ بھی یہی تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ نظامیہ کے حدود میں قیام کرے۔ دفتری اور انتظامی امور کی انجام دہی اسی سے وابستہ تھی۔ دوسرا انتظامی افسر ناظر تھا۔ یہ نظامیہ سے متعلق جائیدادوں اور اوقاف کا نگران تھا۔ گویا ناظر افسر مالیات یا ہماری جامعات کا خازن تھا۔ یہ عہدہ بڑا اہم تھا اور اس پر بڑے اعتماد کے لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعد میں خود بانی نظامیہ کا پڑپوتا خواجہ ابونصر متوفی ۵۶۱ ھ اس عہدہ پر فائز ہوا تھا۔ ان دونوں افسروں کے دفتر علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔

غیر تدریسی عملے میں مفتی کو اہمیت حاصل تھی جو دارالافتاء کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس دارالافتاء سے عوام کو مسائل شرعیہ کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی تھیں ۔ دوسرا عہدہ دار جو غیر تدریسی ذمہ داریوں کو انجام دیتا تھا واعظ تھا۔ کبھی نظامیہ کے شیوخ خود وعظ دیتے اور کبھی بغداد میں باہر سے آنے والے علماء یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ ان مواعظ کی محفلوں میں طلبہ و اساتذہ کے علاوہ امرا، علماء و عوام بھی شریک ہوتے تھے ۔ یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ لکھی جاتی ہے کہ یہ محفل وعظ کبھی کبھی مناظرے کی مجالس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور علماء باہم دگر بحث و جدال پر اتر آتے تھے ۔ ایسے مناظرے حنابلہ و اشاعرہ کے مابین ہوتے تھے۔ ان مناظروں کی وجہ سے بلوے بھی ہو جاتے تھے ۔ ایسا ہی ایک بلوہ ۴۶۸ھ میں شیخ ابونصر شافعی کی تقریر پر اس وقت ہوا جب انھوں نے حنابلہ پر لعن طعن کیا، جس سے بگڑ کر حنابلہ نے کئی آدمیوں کو قتل کر دیا اور نظامیہ کے بازار کو آگ لگا دی ۔ بہر کیف عموماً جمعہ اور دوسرے اہم موقعوں پر محافل تذکیر بپا کی جاتی تھیں ۔ ان اہم مواقع میں سلاطین کی تخت نشینی اور ان کی وفات کے ایام بھی شامل ہوتے تھے ۔

تدریسی عملے میں جو ترتیب قائم کی گئی تھی وہ آج کل کی جامعات سے کچھ مختلف نہ تھی ۔ نظامیہ کے تدریسی عملے میں اپنے عہد کے سرآمد روزگار علماء و فضلاء شامل تھے ۔ یہاں کی مسند درس پر متمکن ہونا بڑی عزت کی بات سمجھی جاتی تھی ۔ بڑے بڑے علماء اس بات کے متمنی رہتے تھے کہ انھیں اس درسگاہ کی پروفیسری ملے ۔ اساتذہ کے تقرر میں بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اور نامور علماء کو درس و تدریس کا منصب تفویض کیا جاتا تھا اور ان کی تقرری اس وقت تک مکمل نہ ہوتی تھی جب تک خلیفہ اس کی منظوری نہ دیتا تھا۔ ایسی مثالیں نادر الوقوع نہیں ہیں کہ کسی عالم کی تقرری کی سفارش کی گئی مگر خلیفۂ وقت نے اس کی منظوری نہ دی اور وہ تقرر روبہ عمل نہ آسکا۔

تدریسی عملے میں سب سے اعلیٰ مقام شیخ کو حاصل تھا۔ اسے پروفیسر سمجھئے ۔ ہر فن کے شیوخ الگ الگ مقرر کئے جاتے تھے۔ تدریسی عملے میں دوسرا عہدہ نائب کا تھا۔ نائب

بھی اپنے عہد کے نامور علماء میں سے منتخب کئے جاتے تھے۔ امام محمد الغزالی جیسے نابغۂ عصر چار سال تک نظامیہ میں نائب شیخ ہی تھے۔ تیسرا تدریسی عہدہ معید کا تھا۔ اس کا فریضہ یہ تھا کہ شیخ یا نائب شیخ کے لیکچروں کو تدریس کے بعد طلبہ کے سامنے پڑھے اور اگر ضرورت ہو تو اس کی تشریح کرے۔ ہر شیخ یا نائب شیخ کے ساتھ ایسے دو یا دو سے زائد معید ہوتے تھے۔ ہم انھیں ٹیوٹر کہہ سکتے ہیں۔[۸]

نظامیہ کے لیکچروں میں طلبہ کے علاوہ باہر کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کا پتا اندلسی سیاح ابن جبیر کے ایک مندرجہ سے چلتا ہے جس نے اپنی سیاحت کے دوران میں یہاں ایک لکچر میں شرکت کی تھی۔ یہ لکچر، نماز ظہر کے بعد شروع ہوا اور نماز مغرب تک جاری رہا۔ ان لکچروں میں طلبہ خاموش تماشائی نہ ہوتے تھے بلکہ وہ استاد سے تحریری یا زبانی سوالات بھی کرتے تھے۔ یہاں کا طریق تدریس بھی عہد حاضر کی جامعات سے مختلف نہ تھا۔ نظامیہ کے اساتذہ لکچرز روم میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر لکچر دیتے تھے اور طلبہ تپائیوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ اس طرح استاد کے لئے ایک مخصوص لباس ہوتا تھا جو سیاہ طیلسان اور عمامے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور اسے اسی لباس میں درس دینا ہوتا تھا۔[۹]

ابن اثیر کے ایک مندرجہ کی بناء پر جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں خلیفہ کی آخری منظوری ضروری تھی اور منظوری نہ ملنے کی صورت میں تقرر منسوخ کر دیا جاتا تھا، پروفیسر ہٹی نے یہ استدلال کیا ہے کہ نظامیہ حکومت کے کنٹرول میں تھا۔[۱۰] جہاں تک اس ادارے کی مالی کفالت کا تعلق ہے، یہ خلفائے عباسیہ کی تحویل میں نہ تھا۔ اور یہی حال اس کے انتظامی امور کے انصرام کا بھی تھا۔ مگر تدریس سے متعلق معاملات میں خلفاء ضرور دلچسپی لیتے تھے، اس لئے پروفیسر موصوف کا یہ قیاس درست نہیں ہے۔ دراصل جو ادارہ براہ راست خلفائے عباسیہ کے کنٹرول میں تھا اور جس کے تمام امور کی انجام دہی ان کے ذمہ تھی، وہ بعد میں قائم ہونے والا مدرسہ مستنصریہ تھا۔

نظامیہ کی تاسیس کے ساتھ ہی ایک وسیع کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں ہر

علم وفن کی کتابیں لاکر جمع کی گئی تھیں، اسے خزانۃ الکتب کہتے تھے اور اس کے افسر کو خازن۔ اس منصب پر بھی اپنے عہد کے مشاہیر مقرر کیے جاتے تھے۔ اس کتب خانے میں کتابوں کا برابر اضافہ کیا جاتا رہا، چنانچہ اسی طرح کا ایک اضافہ ۵۸۹ھ میں خلیفہ ناصرلدین اللہ عباسی [۱۱] کے عہد میں ہوا جبکہ قصر خلافت سے نادر کتابوں کی ایک بڑی تعداد نظامیہ لائی گئی۔ [۱۲]

نصاب تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے یہ درس گاہ ایک خالص دینی اور ادبی تعلیم گاہ تھی۔ یہاں قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، فرائض اور اشعری علم کلام کے علاوہ عربی زبان وادب، نحو ولغت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علم مناظرہ جس نے فرقہ بندیوں کے زور کے باعث ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی اس کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان مضامین کے شیوخ اور دیگر اساتذہ الگ الگ مقرر کئے جاتے تھے۔ گویا ہر مضمون ایک شعبہ تھا جس کے مخصوص اساتذہ ہوتے تھے۔

تدریس کے اعلیٰ معیار کے ساتھ ساتھ نظامیہ پہلی درس گاہ تھی جس میں طلبہ کی مادی ضروریات اور آسائش کا معقول بندوبست کیا گیا تھا۔ ہر طالب علم کو وظیفہ دیا جاتا تھا اور اس کے قیام وطعام وکتب کی ذمہ داری درس گاہ کی انتظامیہ پر تھی۔ قیام کے لئے عمارت میں وسیع دارالاقامہ اور طعام کے لئے مطبخ موجود تھے۔ [۱۳]

نظامیہ کے مصارف کے لئے سرکاری امداد یا ارباب خیر کی فیاضوں اور چندوں پر اعتماد نہیں کیا گیا تھا، بلکہ متعدد بازار، حمام اور زرعی جاگیریں اس کے لئے وقف تھیں۔ ان کا انصرام ناظر اوقاف کرتا تھا۔ یہ گویا مستقل آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ نظام الملک کی ذاتی املاک کی آمدنی سے دس فیصد اور سلاجقہ کے خزانے سے دو لاکھ دینار سالانہ کی رقم جو تعلیمی اخراجات کے لئے وقف تھی، ان میں سے بھی نظامیہ کو حصہ رسدی ملتا تھا۔ نظامیہ کا سالانہ خرچ پندرہ ہزار دینار تھا۔ اگر ہم ایک دینا کو ایک پونڈ کے مساوی سمجھیں تو یہ رقم ۱۰ لاکھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اخراجات کی اس کثیر رقم سے نظامیہ کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا

ہے۔[۱۴]

اگر چہ نظامیہ بغداد سے پہلے نظام الملک نے اسی نام کے کئی مدرسے قائم کیے تھے مگر اپنے قیام کے بعد بغداد کے مدرسہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی اور دوسری درسگاہیں اس کے ماتحت اداروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ اس لئے یہ دعویٰ کرنا بے جا نہ ہو گا کہ نظامیہ بغداد صرف تدریسی جامعہ نہ تھی بلکہ ایک الحاق یونیورسٹی بھی تھی۔ ان ملحقہ اداروں میں سے چند مشہور درس گاہیں یہ ہیں:

۱۔ **نظامیہ نیشاپور**: سلاجقہ کے اوائل عہد میں نیشاپور کو پایہ تخت کی حیثیت حاصل تھی، اس لئے یہاں خواجہ نظام الملک نے امام الحرمین کے حجاز سے واپس آنے پر ان کے اعزاز میں یہ درس گاہ قائم کی۔ وہ تیس سال تک یہاں مسند درس پر متمکن رہے نیشاپور کی یہ درس گاہ بغداد کے بعد دوسری تمام درس گاہوں سے بڑی تھی۔ اس کی عمارت بھی نہایت شاندار تھی۔ امام غزالی اور شمس الاسلام کیا ہراسی جیسے علماء نے یہیں تعلیم پائی تھی۔ یہاں کے شیوخ میں امام الحرمین عبدالملک الجوینی متوفی ۴۷۸ھ کے علاوہ امام غزالی بھی شامل ہیں۔

۲۔ **نظامیہ اصفہان**: اصفہان کو ملک شاہ نے اپنا مستقر حکومت بنایا تھا۔ یہاں بھی نظام الملک نے مدرسہ قائم کیا جو اہمیت میں نیشاپور کے بعد آتا تھا۔ اس کے ائمہ میں محمد بن ابی بکر خجندی متوفی ۴۸۲ھ اور فخر الدین ابو المعالی متوفی ۵۵۹ھ مشہور ہیں۔

۳۔ **نظامیہ مرو**: مرو کو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عہد اموی میں خراسان کا مرکز یہی شہر تھا۔ عباسی دعوت کا بھی مرکز مرو ہی تھا۔ طغرل بیگ کے بھائی چغری بیگ داؤد[۱۵] کا پایہ تخت بھی یہی شہر تھا۔ چغری بیگ کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان مرو ہی کا حاکم تھا۔ یہیں نظام الملک نے اس کی ملازمت اختیار کی تھی۔ گویا خواجۂ بزرگ کی بلند اقبالی کا نقطۂ آغاز بھی مرو ہی تھا۔ اخیر اخیر میں سنجر سلجوقی[۱۶] کا دارالحکومت بھی یہی تھا۔ یہاں کا مدرسہ بھی بڑا مشہور تھا۔ اور اس کے اساتذہ میں ابو الفتح اسعد بن محمد کو

خاصی شہرت حاصل ہے۔

۴۔ **نظامیۂ موصل**: موصل کا شہر جزیرہ عراق وایران کی شاہراہوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ نظام الملک نے یہاں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کے شیوخ میں احمد بن نصیر انباری متوفی ۵۹۸ھ اور ابو حامد محمد بن کمال الدین شہرزوری متوفی ۵۸۶ھ مشہور ہیں۔

۵۔ **نظامیۂ آمل**: طبرستان کا مشہور شہر آمل بھی نظام الملک کی فیاضیوں سے محروم نہ رہا اور یہاں بھی اس نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کے اساتذہ میں ہبۃ اللہ بن سعد رویانی متوفی ۵۴۷ھ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

۶۔ **نظامیۂ بصرہ**: بصرہ عہد اسلامی میں علم وفن کا مرکز تھا۔ یہاں بھی نظامیہ نام کا مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کی عمارت وسعت میں بغداد کے نظامیہ سے بڑی تھی۔ یہ مدرسہ مزار حضرت زبیر بن العوامؓ کے متصل تھا۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کے عہد میں یہ مدرسہ برباد ہوا۔ اس میں محمد بن قیان انباری متوفی ۵۰۳ھ عرصہ تک مدرس رہے۔

۷۔ **نظامیۂ ہرات**: اس مدرسہ کے مشہور اساتذہ میں محمد بن علی بن حامد فقیہ متوطن غزنی تھے۔ انھوں نے ۴۹۵ھ میں وفات پائی۔

۸۔ **نظامیۂ بلخ**: نظامیہ بلخ کے اساتذہ میں عبداللہ بن طاہر اسفرائنی متوفی ۴۸۸ھ اور عمر بن احمد ابوالحفص طالقانی متوفی ۵۳۶ھ کو امتیاز حاصل ہے۔

۹۔ **نظامیۂ طوس**: طوس نظام الملک کا وطن تھا وہ بھلا کیسے اس کی علمی فیاضیوں سے محروم رہتا۔ چنانچہ اس نے یہاں بھی ایک درس گاہ قائم کی تھی۔

۱۰۔ **نظامیۂ جزیرہ ابن عمر**: جزیرہ کے صوبہ میں ’’جزیرۂ ابن عمر‘‘ جیسے غیر اہم اور چھوٹے مقام پر بھی نظامیہ کی شاخ موجود تھی۔

جن فضلائے وقت نے مختلف اوقات میں جامعۂ نظامیہ کی مسند درس کو زینت بخشی ان میں چند ممتاز نام یہ ہیں۔

۱۔ **شیخ ابو اسحاق شیرازی**: ابراہیم بن علی بن یوسف جو ابو

اسحاق شیرازی کے نام سے مشہور رہیں، فارس کے شہر فیروز آباد میں ۳۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی نشو ونما شیراز میں ہوئی۔ اسی لئے شیرازی کہلاتے ہیں۔ فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم دینیہ میں ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ شیخ الاسلام کہلائے۔ جمادی الآخرہ ۴۷۶ھ میں وفات پائی فقہ میں التنبیہ والمھذب، لمع وشرح لمع اصول فقہ میں اور کتاب النکت اختلاف مذاہب میں ان سے یادگار ہیں۔[۱۷]

۲۔ شیخ ابو نصر بن صباغ: عبدالسید بن محمد جو ابونصر بن صباغ کے نام سے متعارف ہیں۔ ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۷۷ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ زہد و ورع میں سرآمد روزگار تھے۔ کتاب الشامل اور کتاب الکامل ان کی تصانیف ہیں۔ ابتداءً بیس روز تک نظامیہ میں تدریس کی خدمت انجام دی اور بعد ازاں شیخ ابو اسحاق شیرازی کے بعد مستقلاً ایک سال تک یہاں کے مدرس رہے۔[۱۸]

۳۔ شیخ ابو سعد: عبدالرحمان بن مامون بن علی کی کنیت ابوسعد ہے ۴۲۶ھ میں پیدا ہوئے۔ حدیث وفقہ کی تعلیم متعدد شیوخ سے حاصل کی۔ نظامیہ میں اصول فقہ کا درس ایک عرصہ تک دیتے رہے۔ نہایت فصیح و فاضل تھے۔ شب جمعہ ۱۸؍شوال ۴۷۸ھ میں وفات پائی۔ بغداد کے مقبرہ باب ابرز میں دفن کئے گئے۔[۱۹]

۴۔ شیخ ابو القاسم دبوسی: علی بن ابی یعلی علوی حسینی معروف بہ ابوالقاسم دبوسی، سمرقند و بخارا کے درمیان واقع شہر دبوسہ میں پیدا ہوئے۔ حسب الطلب ۴۷۸ھ میں بغداد آئے اور نظامیہ کی مسند درس کو رونق بخشی۔ ۴۸۲ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت ونحو کے امام تھے۔ مگر ان کی شہرت فقہ و جدلیات (مناظرے) کے ماہر کی حیثیت سے زیادہ ہے۔[۲۰]

۵۔ شیخ عبد الوہاب بن محمد شیرازی: قاضی ابومحمد عبدالوہاب فن حدیث کے امام تھے۔ فقہ میں بھی بلند پایہ عالم تھے۔ ۴۸۳ھ میں نظامیہ کے مدرس ہوئے اور ایک عرصے تک تدریس میں مصروف رہے۔ رمضان ۵۰۰ھ میں وفات

پائی۔[۲۱]

۶۔ شمس الاسلام کیا ہراسی : ابوالحسن علی بن محمد کے القاب عماد الدین اور شمس الاسلام ہیں مگر مشہور ہیں کیا ہراسی کے نام سے۔ نظامیۂ نیشاپور کے طالبعلم اور امام الحرمین کے نہایت لائق شاگردوں میں تھے۔ انہیں غزالی ثانی کہا جاتا ہے جن کے یہ ہم سبق تھے۔ محدث، فقیہہ اور اصولی تھے۔ نظامیہ کے اساتذہ میں تھے۔ ۵۰۴ھ میں وفات پائی اور اپنے استاد شیخ ابواسحاق شیرازی کے پہلو میں بغداد کے مقبرہ باب ابرز میں پیوند خاک ہوئے۔[۲۲]

۷۔ حجتہ الاسلام امام غزالی : حجتہ الاسلام، حجتہ الدین امام ابو حامد محمد بن محمد بن احمد غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے اور یہیں ۵۰۵ھ میں وفات پائی۔ امام الحرمین کے شاگردوں اور نظامیۂ نیشاپور کے منتہی تھے۔ نظام الملک کی درخواست پر ۴۸۴ تا ۴۸۸ھ نظامیۂ بغداد میں درس دیا۔ پھر بیت المقدس اور شام کے سفر پر نکل گئے۔
[۲۳]

۸۔ شیخ ابو الحسن فصیحی : ابوالحسن علی بن ابی زید محمد نحوی استرآباد کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبدالقاہر جرجانی سے علم نحو کی تکمیل کی نحو میں ان کی کتاب الجمل الصغریٰ مشہور ہے۔ نحو کے امام تھے اور ایک عرصہ تک نظامیہ میں نحو کا درس دیتے رہے۔ خوش نویسی و خطاطی کے بھی ماہر تھے۔ ۱۳/ذوالحجہ ۵۱۶ھ میں بغداد میں وفات پائی۔[۲۴]

۹۔ شیخ ابو بکر خجندی : محمد بن عبداللطیف ابن محمد بن ثابت ابو بکر خجندی فن حدیث و مناظرے کے ماہر تھے۔ تقریر کا ملکہ راسخہ رکھتے تھے۔ نظامیہ کی مسند درس و وعظ پر متمکن رہے۔ ۵۵۲ھ میں وفات پائی۔[۲۵]

۱۰۔ شیخ ابو النجیب سہروردی : شیخ عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی کی کنیت ابوالنجیب ہے۔ محدث و فقیہہ تھے۔ ۴۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۶۳ھ

میں وفات پائی۔ نظامیہ کی کرسیٔ درس کو انھوں نے بھی زینت دی۔ بادۂ تصوف سے سرشار تھے۔ اخیر عمر میں اپنا ذاتی مدرسہ اور رباط (سرائے) تعمیر کی تھی۔ اسی مدرسہ میں وفات تک درس دیتے رہے اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ [۲۶]

جن ناموروں نے مختلف اوقات میں اس چشمۂ علم وعرفان سے فیض پایا، ان کی تعداد چھ ہزار سے اوپر ہے۔ ان طلبہ میں ہزاروں مشہور اور معروف زمانہ ہوئے ہیں۔ ان میں فارسی زبان کے مشہور شاعر و نثر نگار شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی اور مراکش واندلس میں موحدون کی حکومت قائم کرنے والے روحانی پیشوا ابوعبداللہ محمد بن تومرت مصمودی بھی شامل ہیں۔ [۲۷]

نظامیۂ بغداد، سلاجقہ کے زوال اور خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد بھی قائم رہا۔ جب ۷۹۵ھ مطابق ۱۳۹۳ھ میں امیر تیمور لنگ نے بغداد پر قبضہ کیا تو بھی جامعۂ نظامیہ موجود تھی۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ۷۹۷ھ مطابق ۱۳۹۵ھ میں اس جامعہ کو مستنصریہ کی درس گاہ میں ضم کر دیا گیا۔ اس طور سے تین سو اڑتیس (۳۳۸) سال تک قائم رہنے کے بعد نظامیہ کی عظیم تعلیم گاہ وقت کے بے رحم ہاتھوں سے آغوشِ فناء میں چلی گئی۔

حواشی:

[۱] دسواں عباسی خلیفہ جعفر بن معتصم اپنے بھائی واثق کی وفات پر ۲۴ ذی الحجہ ۲۳۲ھ کو المتوکل علی اللہ کے لقب سے مسند نشین خلافت ہوا۔ ۴ر شوال ۲۴۷ھ کی شب میں ترک امراء اور ولی عہد سلطنت منتصر کی سازش سے شہید ہوا اور اسی کے ساتھ با اختیار خلفاء کا دور ختم ہوگیا۔ (ابوالفداء۔ المختصر فی اخبار البشر مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۵ھ۔ ج ۲، ص ۳۷۔۴۱)

[۲] رکن الدین ابو طالب طغرل بن میکائیل بن سلجوق مستقلا ۴۳۰ھ میں حکمران ہوا۔ چند ماہ اوپر چوبیس سال حکومت کی اور جمعہ ۸ رمضان ۴۵۵ھ کو انتقال کیا۔ مرو میں سپرد خاک ہوا۔ وہ

شجاع، حلیم، کریم اور خدا ترس و منصف حکمران تھا۔خاندان سلجوقیہ کی سلطنت کا بانی وہی ہے۔
(صدرالدین الحسینی۔اخبارالدولتہ السلجوقیہ۔مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۔۲۳)

[۳] عضدالدولہ ابوالشجاع محمد الپ ارسلاں بن چغری بیگ داؤد اپنے باپ کے انتقال کے بعد ۴۵۲ھ میں مرو میں تخت نشین ہوا۔ جب ۴۵۵ھ میں اس کے چچا طغرل بیگ محمد نے وفات پائی تو الپ ارسلاں دولت سلجوقیہ کا دوسرا سلطان ہوا۔ دس سال تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ ربیع الاول ۴۶۵ھ میں یوسف خوارزمی نامی ایک معمولی قلعہ دار کی چھری سے زخمی ہو کر شہید ہوا۔ (اخبارالدولتہ السلجوقیہ ص ۵۳ و ۵۴) ابوالفداء ج ۲ ص ۱۸۹، ابن الجوزی المنتظم، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۹ھ، ج ۸، ص ۲۷۶۔۲۷۹)

[۴] جلال الدولہ، یمین امیر المومنین ابوالفتح ملک شاہ ۱۰ ربیع الاول ۴۶۵ھ کو اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے باپ الپ ارسلاں کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں سلجوقی سلطنت نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور حدود چین سے اقصائے شام تک اس کا خطبہ پڑھا گیا۔ بیس سال کے قریب حکومت کر کے ۱۵ شوال ۴۸۵ھ میں انتقال کیا۔ اصفہان میں سپرد خاک ہوا۔ اور اس کے ساتھ خاندان سلجوق کی عظمت بھی دفن ہوگئی (ابوالفداء، ج ۲، ص ۲۰۳۔ اخبارالدولتہ السلجوقیہ ص ۷۱، المنتظم، ج ۹، ص ۷۰)

[۵] حسن بن علی بن اسحاق بن عباس طوس میں ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا۔ آبائی پیشہ کھیتی باڑی اور باغبانی تھا۔ حسن نے علوم مروجہ کی تعلیم طوس کے علاوہ نیشاپور اور بخارا میں حاصل کی۔ حصول علم کے بعد فکر معاش میں غزنین آیا اور کچھ دنوں دفتر انشاء میں منشی رہا پھر بلخ گیا وہاں سے حسن نے مرو کی راہ لی جہاں طغرل کا بھائی چغری بیگ سریر آرائے سلطنت تھا۔ یہاں اس کے جوہر کھلے۔ چغری بیگ نے اسے ولی عہد سلطنت الپ ارسلاں کا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کیا۔ الپ ارسلاں کی تخت نشینی پر حسن ۴۵۶ھ میں مملکت سلجوقیہ کا وزیراعظم ہوا۔ نظام الملک اتابک، خواجہ بزرگ اور رضیٔ، امیر المومنین کے خطابات سے نوازا گیا۔ الپ ارسلاں کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کا وزیراعظم بھی یہی رہا تاآنکہ ۴۸۵ھ میں ایک باطنی ابو طاہر حارث کے زخم خنجر سے شہید ہوا۔

نظام الملک، عالم ادیب، انشاء پرداز اور مصنف تھا۔ سیاست نامہ، کہ دولت سلجوقیہ کا

دستور اور امور جہاں بانی کی مستند ترین دستاویز ہے۔ اس کی وسعت معلومات اور انشا پردازی پر شاہد عدل ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے ملک کے طول و عرض میں مدارس قائم کیے۔ علماء کے وظائف مقرر کیے اور طلبہ کے تعلیمی اخراجات کے انتظامات کیے۔ اس کی شہادت دولت سلجوقیہ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ (اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۶۶۔۶۷، المنتظم، ج ۹، ص ۶۴۔۶۸، ابو الفداء ۲: ۲۰۲ تاج الدین سبکی طبقات الشافعیۃ الکبریٰ مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۳ھ، ج ۳ ص ۱۳۵ و بعد)

[۶] المنتظم، ج ۸، ص ۲۳۸، ۲۴۶، ۲۴۷؛ اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۶۸؛ ابو الفداء، ج ۲، ص ۱۸۵ و ۱۸۶؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ ازہریہ، مصر ۱۳۰۲ھ، ج ۱۰، ص ۲۰، ۲۳ (شیخ ابو اسحاق کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ جس زمین پر نظامیہ کی تعمیر ہوئی وہ غصب کردہ تھی۔ جب ان کی باقاعدہ تشفی کرادی گئی تو بیس روز کے بعد انھوں نے تدریس کا کام شروع کیا)

[۷] اے بغداد کرنیکل۔ مطبوعہ کیمبرج ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۹۳۔

[۸] آر اے نکلسن، لٹریری ہسٹری آف دی عربس، کیمبرج ۱۹۶۹ء ص ۲۷۶، پی، کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربس' نیویارک ۱۹۵۸ء ص ۴۱۰۔۴۱۲؛ مقالات شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۵۵ء ج ۳ ص ۴۰، ۴۱، عبدالرزاق کانپوری نظام الملک طوسی، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء ص ۵۲۱ و ۵۲۲

[۹] سفرنامہ ابن جُبیر، ترجمہ اردو حافظ احمد علی شوق رامپوری، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۹ء ص ۱۷۸ و ۱۷۹۔ [۱۰] پی، کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربس، ص ۴۱۰۔

[۱۱] ابو العباس احمد بن المستضیٔ باللہ عباسی ۵۵۳ھ میں پیدا ہوا۔ ۵۷۵ھ میں خلیفہ ہوا اور ۴۷ سال حکومت کر کے ۶۲۲ھ میں فوت ہوا۔ وہ بخیل، سخت گیر اور ظالم تھا۔ مگر انتظام حکومت کی قابلیت رکھتا تھا۔ خلافت عباسیہ کو اس نے استحکام بخشا اور اپنے حریفوں کو کامیابی سے زیر کیا۔ (سبط ابن الجوزی، مرآۃ الزمان، مطبوعہ حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۰ھ ج ۸ ق ۲، ص ۶۳۵، ابو الفداء، ج ۳، ص ۱۳۵، ۱۳۶)

[۱۲] مرآۃ الزمان ج ۸، ق ۱ ص ۴۲۱، ۴۲۲ (ان کتابوں کی تعداد دس ہزار تھی جن میں نادر مخطوطات بھی تھے۔) [۱۳] بحوالہ سابق شمار نمبر ۶، ۷، ۸۔

[۱۴] مقالات شبلی ج ۳، ص ۴۰ بحوالہ آ ثار البلاد قزدینی (ذکر طوس) والروضتین فی تاریخ الدولتین ۔ الابن الاثیر۔

[۱۵] چغری بیگ داؤد، میکائیل بن سلجوق کا بیٹا اور طغرل بیگ محمد کا بھائی تھا۔ غزنویوں کے مقابلے میں اس نے بڑی جرأت اور فوجی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ مرو اور اس کے متعلقات کا خود مختار حکمران تھا۔ ۴۵۲ھ کے دوسرے مہینے میں انتقال کیا۔ الپ ارسلاں اس کا بیٹا تھا۔ وہی اس کا جانشین ہوا۔ چغری بیگ کی عمر انتقال کے وقت ستر سال تھی ۔ (اخبار الدولۃ السلجو قیہ، ص ۲۹)

[۱۶] سنجر بن ملک شاہ بن الپ ارسلاں رجب ۴۷۹ھ میں پیدا ہوا۔ وہ بیس سال تک اپنے بھائی محمد کا نائب اور اکتالیس سال تک مستقلاً حکمران تھا۔ کل مدت حکومت ساٹھ سال سے اوپر ہے۔ وہ اپنے خاندان کا آخری باعظمت سلطان تھا۔ ۵۴۸ھ میں ترکان غز سے شکست کھا کر تین سال تک ان کی قید میں رہا۔ جب ۵۵۱ھ میں وہاں سے بھاگ کر مرو آیا تو حکومت منتشر ہو چکی تھی ۔ ان منتشر اجزاء کو جمع کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ ۵۵۲ھ میں پیام اجل آ پہنچا۔ مرو میں اپنے خاندانی مقبرہ میں دفن ہوا۔ (المنتظم، ج ۱۰، ص ۱۷۸)۔

[۱۷] المنتظم ج ۹ ص ۷، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۸۸ وبعد۔

[۱۸] المنتظم ج ۹ ص ۱۲، طبقات الشافعیۃ ج ۳ ص ۲۳۰، ۲۳۱۔

[۱۹] المنتظم ج ۹ ص ۱۸۔ [۲۰] ایضاً ج ۹ ص ۱۸۔ [۲۱] ایضاً ج ۹ ص ۱۵۲۔

[۲۲] ایضاً ج ۹ ص ۱۶۷۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴، ص ۲۸۱، ۲۸۲۔

[۲۳] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴، ص ۱۰۱۔ ۱۰۵۔

[۲۴] ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان، مطبوعہ النہضتہ المصریہ ۱۹۴۸ء، ج ۳ ص ۲۴۔

[۲۵] المنتظم ج ۱۰ ص ۱۷۹۔ [۲۶] ایضاً ج ۱۰ ص ۳۲۵۔

[۲۷] پی کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربس ص ۴۱۱۔ عبدالرازق کانپوری، نظام الملک طوسی، ص ۵۲۴

(ماہنامہ المعارف، لاہور ۱۹۷۳ء)

○○○

جامعہ مستنصریہ بغداد

آل عباس نے ۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ (مطابق ۷۵۰ء تا ۱۲۵۸) تک سوا پانچ سو سال کے قریب حکومت کی ان کا دور خلافت علوم وفنون کی ترقی اور دانش وحکمت کی سرپرستی کے لئے مشہور ہے۔ دنیائے اسلام کی عقلی سرگرمیاں اور ذہنی مساعی عباسیوں ہی کی رہین احسان ہیں۔ ان کا دارالحکومت بغداد [۱] اپنے عہد کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا اور طالبان علم وتشنگانِ دانش اسی مرکزِ معارف وسرچشمۂ عرفان کی جانب کشاں کشاں چلے آتے تھے۔

علم نوازی اور علماء پروری کچھ خلافت عباسیہ کے دورعروج ہی کا طرۂ امتیاز نہیں بلکہ دورِ انحطاط میں بھی دانش وبینش کی سرپرستی خلفائے عباسیہ کا مایۂ افتخار رہی ہے۔ ابو جعفر المنصور [۲] وعبداللہ المامون [۳] نے علم وحکمت کی جو شمع روشن کی تھی اسے ان کے جانشینوں نے برابر روشن رکھا اور جب تک اس خانوادہ کا آخری حکمران مستعصم باللہ [۴] تاتاریوں کے ہاتھوں شہید نہ ہوگیا، یہ شمع فروزاں رہی۔

بغداد کے چپے چپے پر علما کے حلقہ ہائے درس اور یہاں کے گوشے گوشے میں فضلاء کے مراکز تعلیم وتعلم موجود تھے لیکن ایک عظیم مرکزی درس گاہ جو اپنے حلقہ اثر کے لحاظ سے ملک کے ایک بڑے حصے پر محیط ہو اور جس کے زیر انتظام صوبہ جاتی تعلیمی ادارے ہوں سب سے پہلے سلاجقہ کے مشہور وزیر نظام الملک [۵] نے نظامیۂ بغداد [۶] کے نام سے پانچویں صدی ہجری کے چھٹے عشرے میں قائم کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس قسم کی مرکزی درس گاہ کا قیام عمل میں آیا، مگر بغداد کی علمی تاریخ میں یہ بات حیرت کے ساتھ لکھی جائے

گی کہ ان تمام علمی عمارتوں میں سے جو بغداد یا اس کے ماتحت علاقوں میں تعمیر ہوئیں، کوئی شاندار عمارت کسی عباسی خلیفہ کے نام سے منسوب نہ کی گئی تھی، اور دارالخلافہ اب تک اس خاص حیثیت سے دوسری مسلمان نسلوں کا ممنون منت تھا۔

عباسیوں کی طویل حکومت کا نفسِ واپسیں تھا اور وہ بساط سیاست سے اٹھنے ہی والے تھے کہ آخری حکمران سے پہلے اور سلسلہ خلافت کے چھتیسویں خلیفہ المستنصر باللہ نے اس کی تلافی کی۔ اس نے ایک شاندار درس گاہ کی تعمیر کا آغاز اس اہتمام سے کیا کہ اس کارنامے کے سامنے دوسروں کے کارنامے ماند پڑ گئے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

۶۲۳ھ (مطابق ۱۲۲۶ء) میں ابوجعفر المنصور، مستنصر باللہ کے لقب سے سریر آرائے خلافت ہوا۔ اس نے کم و بیش سولہ سال تک حکومت کی اور (۶۴۰ھ۔ مطابق ۱۲۴۲ء) میں وفات پائی۔ سیاسی اعتبار سے یہ دور ابتلاء و انحطاط کا دور تھا۔ تاتاری[۷] ریگستانی بادِ سموم کی طرح صحرائے گوپی سے اٹھ کر ترکستان و ایران کے چمن زاروں کو تباہ کر چکے تھے اور ان کے تیز و تند جھکڑ گلستان عراق کو اپنی لپیٹ میں لیا ہی چاہتے تھے۔ ایک کرب و حزن و الم کی فضا چھائی ہوئی تھی اور دنیائے اسلام اس ابتلائے عظیم سے لرزہ براندام تھی۔ ایسے عالم میں گلشن علم کی آبیاری اور باغ حکمت کی چمن بندی کا حوصلہ بڑے دل گردے کا کام تھا۔ یہ خلیفہ مستنصر باللہ ہی کی ہمت و عزم کی کارفرمائی تھی، جس نے اس زمانے میں ایک عظیم الشان درس گاہ تعمیر کی۔

مشہور مورخ حافظ شمس الدین ذہبی[۸] کا بیان ہے کہ مستنصر باللہ نے ۶۲۵ھ میں قصر خلافت کے متصل دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک عالیشان عمارت کی بنیاد رکھی۔ چھ سال کی مدت میں یہ عمارت بن کر تیار ہوئی اور ماہ رجب ۶۳۱ھ میں جمعرات کے دن درس گاہ کا افتتاح ہوا۔ اس افتتاحی تقریب میں بغداد کے قضاۃ، علما، اساتذہ، ارکان

دولت و عمائد سلطنت شریک تھے۔ عوام کی بھی ایک بھاری جمعیت موجود تھی۔[۹]

مستنصریہ میں ایک بڑے کتب خانے کا اہتمام کیا گیا اور قصر خلافت کے عظیم کتب خانے سے ایک سو ساٹھ بارِ شتر نفیس منتخب کتابیں لا کر اس نئے کتب خانے میں رکھی گئیں۔ کتابوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور یوں مستنصریہ کی لائبریری اپنے عہد کی سب سے عمدہ اور نادر ذخیرۂ کتب بن گئی۔ قصر خلافت سے ابن البواب [۱۰] و ابن المقلہ [۱۱] جیسے نامور خوشنویسوں کی وصلیاں بھی لا کر اس کتب خانے میں رکھی گئیں۔[۱۲]

مستنصریہ کی درس گاہ اصلاً ایک دینی تعلیم گاہ تھی۔ چنانچہ ابتداء میں یہاں اہل السنّت والجماعت کے چاروں مسالک، حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے فقہی حلقہ ہائے درس الگ الگ قائم کیے گئے۔ ان چاروں مسلکوں کے اساتذہ و طلباء کے قیام و تدریس کے انتظام ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ہر مسلک کے طلبہ کی تعلیم کی غرض سے جن اساتذہ کا تقرر کیا گیا، ان میں شیخ الفقہ کے علاوہ شیخ الحدیث و شیخ الفرائض بھی ہوتے تھے۔ ان شیوخ کے سوا بعض ایسے تدریسی شعبے بھی ہوتے تھے، جن کا تعلق دینیات سے نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ شیخ النحو عربی زبان اور ادبیات سے متعلق شعبے کا سربراہ ہوتا تھا۔ اسی طرح شیخ الطب بھی تھا۔ جس سے علم طب کے طلبہ درس لیتے تھے۔ ابن واصل کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ ان طلبہ کے لئے عملی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ اور اس غرض سے مستنصریہ کے ساتھ ایک شفا خانے کا الحاق کیا گیا تھا[۱۳] خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جب بغداد پر منگولوں کی حکومت ہوئی تو اہل السنّت والجماعت کی دینیات کے علاوہ شیعہ دینیات کی تعلیم کا بھی یہاں بندوبست کیا گیا۔

ابن بطوطہ جس نے (۷۲۷ھ۔ مطابق ۱۳۲۶ء) میں بغداد کا سفر کیا تھا۔ مستنصریہ کے طریقۂ تدریس کے بارے میں لکھتا ہے کہ ہر شعبے کی تدریس کے لئے ایک ایوان مخصوص ہے جہاں استاد ایک بلند کرسی پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں اور ان کے دونوں طرف دو استاد ذرا نیچے بیٹھے ہوئے ان کے لکچرز کو بلند آواز سے دہراتے ہیں۔ یہ لوگ

معید کہلاتے ہیں۔ طلبہ جو درس میں شریک ہوتے ہیں ان کی تعداد بہت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود پورے درس میں سکون و وقار کی فضاء قائم رہتی ہے۔ ابن بطوطہ کا یہ بھی بیان ہے کہ اساتذہ کا مخصوص لباس ہوتا ہے ان کے طیلسان (گاؤن) اور عمامے کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوران درس ان کے لئے یہ لباس زیب تن کرنا لازمی ہے۔[۱۴]

درس گاہ سے ملحق ایک دارالافتاء بھی قائم کیا گیا تھا۔ جہاں مفتی ہوتے تھے۔ اہم سیاسی و مذہبی امور میں مستنصریہ کے عام شیوخ اور بغداد کے دیگر فضلاء بھی یہاں فتویٰ دینے کی غرض سے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ ۶۵۶ھ میں ہلاکو نے تسخیر بغداد کے بعد جب علمائے اسلام سے اپنے حق میں فیصلہ کرانا چاہا تو اس مقصد کے لئے علماء کا اجتماع مستنصریہ ہی میں ہوا اور اس عہد کے مشہور عالم رضی الدین علی بن طاوس نے ہلاکو کی حکومت کے جواز میں اپنا فتویٰ یہیں دیا تھا جب کہ دوسرے علماء نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا تھا۔[۱۵]

ابتدائے قیام ہی میں مستنصریہ میں طلبہ کی مادی ضروریات کا بطور خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ان کے قیام و طعام کے علاوہ ان کے لئے مٹھائیوں، میوؤں اور ٹھنڈے پانی کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو بستر، قلم، کاغذ اور دوات بھی مفت فراہم کیے جاتے تھے۔ درس گاہ سے ملحق ایک اعلیٰ قسم کا حمام بھی اساتذہ و طلبہ کے لئے بنایا گیا تھا۔ ان تمام انتظامات پر مستزاد یہ کہ ہر طالب علم کو ماہانہ ایک اشرفی جیب خرچ کے طور پر دی جاتی تھی۔[۱۶]

مستنصریہ کی عمارت بغداد کے مشرقی حصے میں واقع تھی۔ یہ حصہ شہر کا سب سے آباد علاقہ تھا۔ یہاں بکثرت بازار تھے۔ سب سے بڑا بازار سوق الثلاثاء کہلاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کے کارخانے بھی تھے۔ عمارتوں کے سلسلے کے وسط میں نظامیہ کی درس گاہ اور اس کے آخری سرے پر مستنصریہ کی عالی شان عمارت تھی۔ اس آباد خطے میں اس تعلیم گاہ کی تعمیر کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس کے اخراجات کے لئے دکانیں اور بازار بنائے جاسکیں۔ چنانچہ مصارف کی غرض سے بہت سی عمارتیں بنا کر مستنصریہ پر وقف کی گئیں۔

سیوطی کے بیان کے مطابق ان اوقاف سے ستر ہزار مثقال سونے کی مالیت کے

بقدر سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔[۱۷] اس طور سے درس گاہ کی ضروریات کے لیے کسی چندے یا مالی اعانت کی کوئی ضرورت نہ پیش آتی تھی یہی وجہ تھی کہ زوال عباسیہ کے بعد بھی مستنصریہ بغداد کی مرکزی حیثیت قائم رہی اور جب ۱۳۹۵ء میں امیر تیمور[۱۸] کے قبضہ بغداد کے زمانہ میں نظامیہ کی درس گاہ کو بھی اس میں ضم کر دیا گیا تو اس کی شان اور بھی بڑھ گئی۔[۱۹]

مستنصریہ ایک سرکاری ادارہ تھا اور اس کی نگرانی براہ راست خلفاء کرتے تھے طلبہ کی اخلاقی حالت کی نگرانی اور دوسرے عمومی مسائل کی دیکھ بھال خود مستنصر کرتا تھا۔ عباسیوں کے بعد تاتاریوں نے اس کے معائنے اور نگرانی کو اپنے فرائض منصبی کا جزو سمجھا۔ مورخ ابن الطقطقی نے لکھا ہے کہ ۶۹۸ھ میں جبکہ تاتاری سلطان غازان خان مستنصریہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ شافعیہ کے شیخ علامہ جمال الدین عبداللہ عاقولی نے جو درس قرآن میں مصروف تھے درس بند کر کے اس کا استقبال کیا تو سلطان نے اس پر سختی سے ان کی گرفت کی تھی۔[۲۰]

بہر کیف بغداد پر عباسیوں کے بعد تاتاریوں، ایل خانیوں[۲۱]، تیموریوں، صفویوں[۲۲] اور عثمانیوں[۲۳] نے یکے بعد دیگر حکومتیں کیں اور مستنصریہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ قائم رہا۔ آخر کار اسے بھی زوال آیا اور عثمانی ترکوں کے آخر دور میں اسے بند کر دیا گیا اور وہ عظیم عمارت اس صدی کے آغاز تک عراق کے ترکی کسٹم آفس کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اور آجکل عراق کے محکمۂ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے۔ پتا نہیں کہ وہ نادرہ روزگار گھڑی جسے مستنصر کے مشہور ہیئت دان علی بن تغلب بن ابی ضیا بعلبکی [۲۴] نے تیار کیا تھا۔ اور جو مستنصریہ کے صدر دروازے پر نصب کی تھی کہاں گئی۔[۲۵]

مستنصریہ کی علمی حیثیت کا ہر دور میں اعتراف کیا گیا ہے۔ ابن واصل[۲۶]، سبط ابن الجوزی[۲۷]، ابن الطقطقی[۲۸]، ذہبی، سیوطی[۲۹] وغیرہ نے اسے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے، فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی جب بغداد کی تباہی پر روئے تو مستنصریہ کی ویرانی پر بھی ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

بکت جدرُ المستنصریة ندبۃً
علی العلماءِ الراسخینَ ذوی الحجرِ
(مستنصریہ کے در و دیواران شہرۂ آفاق علماء پر جو وہاں درس دیتے تھے اشکبار ہیں!)

حواشی:

[۱] بغداد: ابو جعفر المنصور نے ۱۴۵ھ میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر اپنا نیا دارالحکومت آباد کیا۔ یہ شہر جلدی ہی ترقی کر گیا۔ مہدی نے دجلہ کے مشرقی کنارے پر نئی عمارتیں بنوائیں اور یہی حصہ قصر امارت و سرکاری عمارتوں کے باعث شہر کا سب سے بارونق علاقہ بن گیا۔ دریائے دجلہ پر متعدد پل بنا کر شہر کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ مشرقی حصے کو رصافہ اور مغربی حصے کو کرخ کہتے تھے۔ ۶۵۶ھ میں عباسیوں کے زوال کے ساتھ بغداد کی عظمت کا آفتاب بھی غروب ہو گیا۔ (جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ مطبوعہ دارالہلال، مصر ۱۹۵۸ء، جز دوم ص ۱۸۲۔۱۸۶)

[۲] دوسرا عباسی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ المنصور ۱۳۶ھ میں اپنے بھائی سفاح کی موت کے بعد سریر آرائے خلافت ہوا۔ بائیس سال حکومت کر کے ۱۵۸ھ میں اس نے وفات پائی۔ خلافت عباسیہ کا حقیقی بانی منصور ہی ہے۔ علم و فضل کی ترقی کا آغاز اسی کے دور سے ہوا۔ (ابن الطقطقی، الفخری، مطبوعہ رحمانیہ مصر ۱۹۲۷ء ص ۱۱۵ و مابعد)

[۳] اپنے بھائی محمد الامین کو قتل کرا کے عبداللہ المامون ۱۹۸ھ میں مسند نشین سلطنت عباسیہ ہوا۔ اس نے بیس سال تک حکومت کی۔ ۲۱۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا دور حکومت جہاں علمی ترقیوں کے لئے مشہور ہے وہیں سیاسی انتشار اور مذہبی عدم رواداری کے لئے بھی انگشت نمائے خلق ہے۔ (الفخری۔ ص ۱۶۱ و مابعد۔ تفصیلی حالات کے لئے علامہ شبلی کی المامون ملاحظہ ہو)

[۴] المستعصم باللہ: آخری عباسی خلیفہ ابو احمد عبداللہ (۶۴۰ھ مطابق ۱۲۴۲ء) میں مسند خلافت

پر متمکن ہوا۔ سولہ سال حکومت کرنے کے بعد (۶۵۶ھ۔ مطابق ۱۲۵۸ء) میں تاتاریوں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ اسی کے ساتھ خلافت عباسیۂ بغداد کا خاتمہ ہوگیا۔ اپنی بعض ذاتی کمزریوں کے باوجود المستعصم باللہ نیک سیرت اور نیکوکار تھا۔ (الفخری۔ ص ۲۴۴ و مابعد)

[۵] نظام الملک: طوس کا دہقان زادہ ابوعلی حسن بن علی ۴۰۹ھ میں پیدا ہوا۔ علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد حاکم بلخ کا سکریٹری ہوا۔ پھر سلجوقیوں کے دربار سے وابستہ ہوا اور ولی عہد الپ ارسلان کا سکریڑی مقرر ہوا۔ جب الپ ارسلان ۴۵۵ھ میں سلطان ہوا تو حسن کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ نظام الملک کا خطاب بھی اسی دور وزارت کی یادگار ہے۔ الپ ارسلاں اور اس کے جانشین ملک شاہ کے زمانے میں تیس سال تک منصب وزارت پر فائز رہا۔ ۴۸۵ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ نظام الملک عالم، انشا پرواز اور مدبر تھا۔ اس کی کتاب ''سیاست نامہ'' اس کے علم وفضل پر شاہد ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر وہ علم دوست اور علما پرور تھا۔ اس نے سلاجقہ کی حکومت کے طول وعرض میں بیسیوں مدارس قائم کیے جن میں بغداد کے علاوہ نیشاپور کا مدرسہ بڑا مشہور تھا۔ (تفصیل کے لیے مولوی عبدالرزق کانپوری کی مشہور کتاب ''نظام الملک طوسیؒ'' مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی ملاحظہ کریں)

[۶] نظامیۂ بغداد: نظام الملک طوسی نے (۴۵۷ھ۔ مطابق ۱۰۶۷ء) میں اس درسگاہ کی تعمیر کا آغاز کیا۔ دو سال بعد جب عمارت مکمل ہوئی تو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کا افتتاح ہوا۔ اسلامی درسگاہوں میں اسے بڑی شہرت ہوئی۔ علامہ ابواسحاق شیرازی، امام غزالی اور ابن الجوزی جیسے ائمہ فن اس ادارے کے استاد رہے اور شیخ سعدی شیرازی، محمد بن تومرت افریقی جیسے شہرہ آفاق حضرات نظامیہ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ (۷۹۷ھ۔ مطابق ۱۳۹۵ء) میں امیر تیمور نے نظامیہ کو بند کرکے کم وبیش تین سو چالیس سال کی علمی روایت پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ (نظام الملک طوسی۔ ص ۵۱۲ و مابعد)

[۷] تاتاری: منگولیا اور جنوبی سائبیریا کے خانہ بدوش قبائل کو اہل چین نے تاتار کا نام دیا۔ انھوں نے تاتاریوں کے مختلف گروہوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ دیوار چین کے قریب

بسنے والے سفید تاتار ۔۲۔ صحرائے گوبی کے شمال میں رہنے والے سیاہ تاتار ۔۳۔ اور سیاہ تاتاریوں کے شمال میں جنگلات میں آباد شکاری تاتاری قبائل۔اسی تیسرے خاندان میں ۱۱۵۵ء میں تموچین پیدا ہوا جو چنگیز خاں کے لقب سے تاتاریوں کا عظیم حکمران ہوا۔اس کے عہد میں اسلامی ممالک پر تاتاریوں کی یلغاروں کا آغاز ہوا۔اوراس کے پوتے ہلاکو خاں نے (۶۵۶ھ۔ مطابق ۱۲۵۸ء) میں بغداد پر قبضہ کرلیا۔ (کارل بروکلمان۔تاریخ شعوب اسلامیہ ۔(ترجمہ انگریزی) مطبوعہ لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۴۴، ۲۴۵۔اصل کتاب جرمن زبان میں ہے۔اس کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے)۔

[۸] ذہبی: حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی ۶۷۳ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور یہیں ۷۴۸ھ میں وفات پائی۔ ذہبی اپنے عہد کے بہت بڑے محدث ،مورخ اور ماہر اسمائے رجال تھے(ابو الفداء۔المختصر فی اخبار البشر،مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۵ھ (ذیل ابن الوردی) جزء چہارم،صفحہ ۱۵۰ و نیز ابن شاکر کتبی ،فوات الوفیات،مطبوعہ سعادت مصر ۱۹۵۱ء۔ ج ۲،ص ۳۷۰)۔

[۹] سیوطی: تاریخ الخلفاء۔مطبوعہ اصح المطابع کراچی ۳۴۶ و ۳۴۷ و نیز المختصر فی اخبار البشر ج ۳۔صفحہ ۱۷۱۔

[۱۰] ابن البواب: علی بن ہلال کی کنیت ابوالحسن اور عرف ابن البواب ہے۔نہایت خوشخط تھے۔ مدینۂ منصورہ (مغربی بغداد) کی جامع مسجد میں واعظ تھے۔۴۱۳ھ میں بغداد میں وفات پائی اور باب الحرب کے مقبرے میں سپرد خاک کیے گئے ۔(ابن الجوزی۔المنتظم فی تاریخ الامم۔مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۹ء جلد ہشتم صفحہ ۱۰)

[۱۱] ابن المقلہ: محمد بن علی نام کنیت ابوالحسن معروف بہ ابن المقلہ شوال ۲۷۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوا۔سولہ سال کی عمر میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوا۔معمولی عہدے سے ترقی کر کے منصب وزارت تک پہنچا اور تین خلفا۔مقتدر، قاہر، وراضی کا وزیر رہا۔خطاطی اور انشاء پردازی میں یگانۂ روزگار تھا۔اخیر عمر میں خلیفہ راضی نے ناراض ہو کر قید کر دیا تھا۔اسی حالت میں (۳۲۸ھ) میں انتقال کیا۔(المنتظم جلد ۶،ص ۳۰۹ تا ۳۱۱) و نیز خیر الدین زرکلی ،الاعلام،مطبوعہ مصر ۱۹۵۴ء جلد

ہفتم ص ۱۵۷، ۱۵۸۔

[۱۲] سبط ابن الجوزی۔ مرآۃ الزمان مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۵۲ھ جلد ہشتم قسم اول ص ۷۳۹)

[۱۳] تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۴۷۔

[۱۴] ابن بطوطہ بحوالہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۶ء۔ جلد اول ص ۴۰۹، ۴۱۰۔

[۱۵] الفخری، ص ۱۱

[۱۶] تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۷۔

[۱۷] تاریخ الخلفاء، ص ۳۴۷ و نظام الملک طوسی، ص ۵۱۶، ۵۱۷

[۱۸] امیر تیمور: تیمور ایک غریب گھرانے میں (۷۳۶ھ۔ مطابق ۱۳۳۵ء) میں پیدا ہوا۔ بڑا ہو کر ایل خانیوں کے ہاں ملازم ہوا اور کش کی گورنری پر فائز ہوا۔ تیمور نے اپنی حوصلہ مندیوں سے ایل خانی سلاطین کو قابو میں کر کے ان کے نام پر تسخیر عالم کا بیڑا اٹھایا۔ جب (۸۰۷ھ۔ مطابق ۱۴۰۵ء) میں اس کا انتقال ہوا تو ایک عظیم سلطنت جو ہندوستان سے اناطولیہ تک پھیلی ہوئی تھی اس کے زیر نگیں تھی۔ مقبرہ تاشقند میں ہے۔

[۱۹] فلپ کے۔ حتی۔ ہسٹری آف دی عربس۔ نیویارک، ۱۹۵۸، ص ۴۱۱

[۲۰] الفخری، ص ۲۲، ۲۳۔

[۲۱] ایل خانی: چنگیز کے پوتے ہلاکو کو ایران و عراق کی حکومت دی گئی تھی جو منگولی خاقان کے برائے نام ماتحت تھی۔ اس سلطنت کو ایل خانی سلطنت کہتے ہیں۔ اس پر ہلاکو اور اس کے دس جانشینوں نے (۶۵۴ھ۔ مطابق ۱۲۵۶ء) سے (۷۳۶ھ۔ مطابق ۱۳۳۶ء) تک حکومت کی۔ بغداد ایل خانیوں کے قبضے میں تھا اور ان کا دائرہ حکومت ایران سے ایشیائے کوچک تک تھا۔ ایل خانیوں میں سے سب سے پہلے تیسرے حکمران احمد بن ہلاکو نے اسلام قبول کیا اور یوں "پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" (دی محمڈن ڈائناسٹیز، ص ۱۹۹ تا ۲۰۱۔)

[۲۲] صفوی:۔ شیخ صفی الدین اردبیلی کی نسل میں اسماعیل صفوی نے (۹۰۷ھ۔ مطابق ۱۵۰۲ء) میں ایران میں صفوی خاندان کی حکومت قائم کی۔ یوں تو یہ حکومت (۱۱۴۸ھ۔ مطابق ۱۷۳۶ء)

تک باقی رہی مگران کا آفتاب اقبال شاہ عباس کبیر کی ۱۰۳۸ھ۔ مطابق ۱۶۲۹ء میں وفات کے بعد گہنا گیا۔ آخر نادر شاہ افشار نے صفویوں کا ۱۱۴۸ھ۔ مطابق ۱۷۲۶ء میں خاتمہ کر دیا۔ (محمڈن ڈاینا سٹیز، ص ۲۳۲ تا ۲۳۵)

[۲۳] ترکان عثمانی اوغز قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ حملۂ تاتار کے زمانے اور اس کے بعد ایشیائے کوچک میں آباد ہوئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے عظیم سلطنت قائم کی جو ۶۹۹ھ۔ مطابق ۱۲۹۹ء سے ۱۳۴۳ھ۔ مطابق ۱۹۲۴ء تک قائم رہی۔ عثمانی سلطنت اسلام کا آخری حصار اور عثمانی سلاطین اسلام کے آخری سپاہی تھے۔

[۲۴] علی بن تغلب بن ابی الضیاء بعلبک کا رہنے والا تھا مگر اس نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ گھڑی سازی میں اسے اتنی شہرت ہوئی کہ الساعاتی (گھڑی ساز) کی نسبت سے وہ اور اس کا خاندان مشہور ہوا۔ مستنصریہ کے صدر دروازے پر جو گھڑی لگائی گئی تھی اس کی صورت یہ تھی کہ وہ لاجوردی رنگ کی دائرہ کی شکل میں تھی۔ اس کے وسط میں ایک سورج بنا ہوا تھا جو برابر حرکت کرتا رہتا تھا۔ (عبدالقادر قرشی۔ الجواہر المضیہ، مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد، ۱۳۳۲ھ ص ۸۰ و شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ج ۶، ص ۲۳۹ و ۲۴۰)

[۲۵] شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد سوم ص ۴۶، ۴۷۔

[۲۶] ابن واصل: جمال الدین ابوعبداللہ محمد بن سالم مازنی تمیمی حموی، ابن واصل کے عرف سے مشہور ہیں۔ وہ مورخ، منطقی، اصولی اور علم و ہندسہ و فقہ کے عالم تھے۔ حماۃ میں ۶۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور یہیں کے قاضی القضاۃ و شیخ الشیوخ ہوئے۔ مملوک سلطان مصر و شام الملک الظاہر بیرس کے دربار میں ابن واصل کو بڑا تقرب حاصل تھا۔ ان کی متعدد تصانیف تاریخ، منطق، اصول فقہ اور علم ہندسہ میں ہیں۔ تاریخی کتابوں میں ''مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب'' و ''التاریخ الصالحی'' مشہور ہیں۔ انھوں نے اغانی کی تلخیص بھی کی ہے۔ حماۃ میں (۶۹۷ھ۔ مطابق ۱۲۹۸ء) میں وفات پائی۔ (الاعلام، ج ۷، ص ۳)

[۲۷] سبط ابن الجوزی: شمس الدین ابو المظفر یوسف قزاد علی، مشہور عالم ابو الفرج ابن الجوزی

کے نواسے تھے، علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے۔ مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان نہایت ضخیم کتاب ان سے یادگار ہے۔ وہ ایوبی حکمران الملک الافضل علی کے متوسلین میں تھے اور زیادہ تر دمشق میں قیام کرتے تھے۔ ۶۵۴ھ میں وفات پائی۔ (مرآۃ الزمان جلد ہشتم قیم اول و دوم سے اقتباس) و نیز جرجی زیدان۔ "تاریخ آداب اللغتہ العربیہ" مطبوعہ دارالہلال مصر ۱۹۵۸ء، ج ۳، ص ۸۹)

[۲۸] ابن طقطقی: ابو جعفر محمد علی بن طباطبا کا نسبی تعلق حضرت حسینؓ بن علیؓ سے ہے۔ اس کا باپ ایل خانی سلطان اباقا خان کی سرکار میں محصل (Tax Collector) تھا۔ ابن طقطقی (۶۶۰ھ۔ مطابق ۱۲۶۲ء) میں پیدا ہوا۔ اس کی نشو و نما بغداد میں ہوئی۔ موصل کے گورنر فخر الدین عیسیٰ کے متوسلین میں سے تھا اور اسی کے نام پر اپنی شہرہ آفاق کتاب الفخری لکھی جو تاریخ، ادب اور سیاست کے موضوعات پر ایک مستند کتاب شمار کی جاتی ہے وہ حلہ نجف و کربلا میں علویوں کا نقیب بھی تھا۔ (۷۰۹ھ۔ مطابق ۱۳۰۹ء) میں وفات پائی۔ (دنیائے اسلام مترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی، مطبوعہ مقبول اکیڈیمی، لاہور ۱۹۶۴ء۔ مقالہ بر ابن طقطقی از جیمز کرٹ زک ص ۶۱۰) نیز الاعلام جلد ۷، صفحہ ۱۷۴)

[۲۹] شیخ الاسلام جلال الدین سیوطی بالائی مصر کے شہر اسیوط میں (۸۴۹ھ۔ مطابق ۱۴۴۵ء) میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں حفظ کلام مجید کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے، جو تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تراجم، ادب اور لغت کے مضامین پر محتوی ہے۔ مشہور تصانیف میں قرآن کی تفسیر جلالین، (بہ شرکت جلال الدین محلی) الاتقان، طبقات المفسرّین، تاریخ الخلفاء اور مصر و قاہرہ کی تاریخ حسن المحاضرہ ہیں۔ انھوں نے (۹۱۱ھ۔ مطابق ۱۵۰۵ء) میں وفات پائی۔ متاخرین علمائے اسلام میں سیوطی جیسا جامع الکمال شخص نہیں ملتا۔

(ماہنامہ المعارف، لاہور ۱۹۷۲ء)

ooo

قاضی ابویعلیٰ کی ''الاحکام السلطانیہ''

۲۴۷ھ میں خلیفۂ عباسی جعفر المتوکل علی اللہ [۱] کے قتل کے بعد خلافت عباسیہ انتشار کا شکار ہوگئی، اور جلد ہی خلافت اسلامیہ کے مشرقی و مغربی صوبوں میں خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں [۲]۔ ان حکومتوں کے عباسیوں سے تعلقات کبھی معاندانہ، کبھی حریفانہ اور کبھی دوستانہ رہے، لیکن یہ امراء، عوام اور علماء کے خوف سے بظاہر خلافت کے ماتحت اور خادم ہونے کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ اقتدار اعلیٰ اور خلافت اسلامیہ کا حقیقی منبع و مخزن خلفائے عباسی ہی سمجھے جاتے تھے۔ اس طور سے عملاً یہ مقامی امراء حکمراں ہوتے تھے مگر نظریاتی اعتبار سے خلفائے عباسی کو اقتدار کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ اقتدار کی یہ عملی و نظری تقسیم نہ صرف یہ کہ نظام حکومت میں دوعملی کا سبب بنی بلکہ اسلامی سیاسی مفکرین میں بھی دو مختلف مدارس فکر کے قیام کا باعث ہوئی۔ ایک مدرسۂ فکر اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مرجع سلطان کی ذات کو سمجھتا تھا اور اس کا نظریہ تھا کہ یہ خودمختار امراء اور سلاطین ہی درحقیقت اقتدارِ حکومت کے وارث اور جانشین ہیں۔ [۳]

اس کے برعکس مسلمان سیاسی مفکرین کا ایک گروہ اس خیال کا حامی تھا کہ اقتدار کا سرچشمہ اور حکومت کا حقیقی مستحق خلیفہ ہے اور خودمختار امراء و سلاطین اس حق کو خلیفہ کی اجازت سے استعمال کرسکتے ہیں [۴]۔ یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ علماء کے ایک طبقہ میں مقبول ہوا بلکہ عوام اور امراء بھی اسی کے حامی تھے۔ عوام میں قبولیت حاصل کرنے اور اپنے حریفوں پر سبقت لے جانے کا جذبہ بڑے بڑے سرکشوں کو خلافت عباسیہ کے آستان نیاز پر

جبین ناز خم کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محمود غزنوی [۵] اور طغرل بیگ سلجوقی [۶] جیسے جلیل القدر حکمراں خلفائے عباسی سے حصول خلعت و فرمان حکومت کے متمنی رہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے خلفائے عباسی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور ان کی اطاعت سے سرتابی نہ کرتے تھے اور جب کسی حکمران نے عباسیوں کی اطاعت سے انحراف کیا تو اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ [۷] نے جب خلیفہ ناصر الدین اللہ [۸] کی اطاعت سے سرتابی کی اور آمادۂ جنگ ہو گیا اور اس نے خیوا میں ایک متوازی علوی خلیفہ علاء الملک ترمذی کو مسند خلافت پر متمکن کر دیا، تو عوام و خواص سبھی اس سے ناراض ہوئے اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ [۹]

مسلمان سیاسی مفکرین میں نظام الملک طوسی [۱۰] متوفی ۴۸۵ھ اور امیر عنصر المعالی کیکاؤس [۱۱] متوفی ۴۷۵ھ اس مدرسۂ فکر کے پیرو ہیں جو سلاطین و امراء کو حکومت کا حقدار اور اقتدار کا منبع سمجھتا ہے۔ مگر سلفی مدرسۂ فکر سے، جس کے حامی خلیفہ ہی کو تمام اختیارات کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ ابوالحسن علیؒ الماوردی جیسا نابغۂ عصر پیدا ہوا جس نے اپنی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' کے ذریعہ اسلامی سیاسی افکار میں نئے اقدار کی نشو و نما کی۔

ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب بصری، بغدادی، ماوردی قریباً ۳۶۴ھ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے عہد کے شافعی فقہاء و قضاۃ میں سر آمد روزگار تھا۔ اس نے متعدد کتابیں فقہ، تفسیر، عقائد اور اصول فقہ کے موضوعات پر تصنیف کیں۔ مگر اس کی اصل شہرت ''الاحکام السلطانیہ'' کی بدولت ہوئی۔ یہ کتاب اسلامی سیاسیات پر نہایت معتبر دستاویز شمار کی جاتی ہے امت کے مختلف طبقات نے ہر دور میں اس کی جانب توجہ کی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم، خلاصے اور تحشئے کیے گئے۔ ماوردی کا شمار اپنے عہد میں قضاۃ و فقہاء میں ہوتا تھا۔ مگر اس کتاب کی بدولت بعد کی علمی دنیا نے اسے ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے جانا، جس کے افکار سیاسی کی اساس قرآن، حدیث، تعامل صحابہؓ اعمال خلفائے راشدین اور ائمہ و فقہاء کے اجتہادات پر ہے۔ اس حیثیت سے اس کی سیاست خالص دینی سیاست

ہے، جس میں لادینیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہے۔

ماوردی کو الاحکام السلطانیہ کے مصنف اور افکار سیاسیہ میں اسلامی اقدار کے داعی ہونے کا جو فخر حاصل ہے اس میں ایک اور مصنف اس کا سہیم وشریک ہے مگر اسے ماوردی جیسی شہرت اور قبولیت عامہ نہ حاصل ہوسکی۔ یہ مصنف قاضی ابویعلیٰ حنبلی ہے۔ اس نے بھی ماوردی کے زمانہ میں الاحکام السلطانیہ نامی کتاب تحریر کی اور اسلامی سیاسی افکار متعین کیے۔ قاضی ابویعلیٰ کی کتاب بار اول قاہرہ کے مشہور ''مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی داولادہ'' سے ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب کیسے گوشہ خمول سے منصۂ شہود پر آئی اس کا حال اس کے مصحح اور محشی شیخ محمد حامد الفقی کی زبان سے سنئے جو جامع ازہر کے ایک ممتاز عالم اور مصر کی انجمن انصار السنۃ المحمدیہ کے سربراہ تھے۔

''۱۳۵۴ھ میں میرے قیام مکہ کے دوران میں علامہ شیخ عبداللہ بن بلیہد نے کتاب الاحکام السلطانیۃ کا ایک قلمی نسخہ مجھے مرحمت فرمایا کہ میں اس کی اشاعت کا انتظام کروں۔ میں فریضۂ حج اداء کر کے مصر واپس آیا تو اس کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں متعدد ناشرین سے بات چیت کی مگر ان میں سے کوئی بھی اس پر آمادہ نہ ہوا اور یہ عذر کیا کہ اس کتاب کا چلن نہ ہوسکے گا۔ ان ناشرین و طابعین کے پیش نظر جمہور اسلام کے مفادات کے بجائے اپنی مالی منفعت کا جذبہ تھا۔ غرض اسی کد و کاوش میں پورا سال گزر گیا اور یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ تا آنکہ ۱۳۵۵ھ کا موسم حج آ گیا اور میں حسب عادت قدیم حج کی غرض سے مکہ گیا۔ شیخ ابن بلیہد اور دوسرے دوستوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کتاب الاحکام السلطانیہ کی طباعت کے لیے اصرار کیا۔ آخر جب میں فریضۂ حج ادا کر کے مصر پہنچا تو میری ملاقات مصطفیٰ البابی الحلبی مرحوم کے لڑکوں سے ہوئی۔ میں نے ان سے اس کتاب کا تذکرہ کیا اور یہ لوگ بطیبِ خاطر اس کی اشاعت پر آمادہ ہوگئے جب اس کی کتابت ہوچکی تو میں نے علمائے مکہ کو اس کی اطلاع دی اور جب مکہ گیا تو جلالۃ الملک عبدالعزیز بن سعود کی خدمت میں ان اوراق کو پیش کیا۔ جس پر سلطان نے مسرت کا اظہار

فرمایا اور یوں یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی، جو قلمی نسخہ مجھے شیخ ابن بلیہد نے دیا تھا اسے شیخ سلیمان بن حمدان نے جو مکہ میں ہیئۃ مراقبۃ القضاء کے رکن ہیں ایک پرانے نسخہ سے جو ۸۶۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ نقل کیا تھا۔ جب ہم نے اس کی طباعت شروع کی تو ایک اور قلمی نسخہ مل گیا جو شیخ عبداللہ بن حسن آل شیخ کی ملکیت ہے۔ شیخ مکہ میں ہیئۃ مراقبۃ القضاء کے صدر ہیں۔ یہ نسخہ اس کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں نہایت ضروری تھا اور ہم نے اس سے کافی استفادہ کیا"۔[۱۲]

اس کتاب کی روایت کی اجازت شیخ عبداللہ بن بلیہد کو شیخ عبدالستار دہلوی مقیم مکہ سے ملی۔ شیخ عبدالستار نے اس کی روایت کی اجازت اٹھارہ مختلف طریقوں سے مصنف کتاب سے حاصل کی[۱۳]۔ ان راویان کتاب میں علامہ ابن حجر عسقلانی[۱۴]، قاضی امجد الدین فیروز آبادی[۱۵]، حافظ محمد بن احمد ذہبی [۱۶]، علامہ ابن قیم جوزیہ [۱۷] اور امام احمد بن تیمیہ [۱۸] جیسی زبردست اور شہرہ آفاق ہستیاں شامل ہیں۔

مصنفِ کتاب کے حالات زندگی "طبقات الحنابلہ" میں موجود ہیں اس کتاب کا مصنف خود صاحب کتاب کا بیٹا قاضی ابوالحسن محمد [۱۹] ہے۔ اس کے علاوہ خطیب بغدادی [۲۰] نے "تاریخ بغداد" میں بھی اس کے حالات بیان کیے ہیں۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عبدالقادر نابلسی [۲۱] نے "مختصر طبقات" میں اور حافظ ابن کثیر دمشقی [۲۲] نے "البدایہ والنہایہ" میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ تذکرے مجمل ہیں۔ ان سے کسی قدر زیادہ ذکر "المنتظم" میں ابوالفرج بن جوزی [۲۳] نے کیا ہے۔

اس کا نام محمد بن حسین بن محمد بن خلف بن احمد الفراء اور کنیت ابویعلیٰ ہے۔ وہ ۲۸ رمحرم ۳۸۰ھ میں پیدا ہوا، اور شب دوشنبہ ۱۹ ررمضان ۴۵۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ جامع منصور بغداد میں اس کی نماز جنازہ اس کے بیٹے ابوالقاسم [۲۴] نے پڑھائی۔ جنازہ میں شرکاء کی تعداد بے حساب تھی۔ بغداد کے بازار بند رہے اور جنازہ کے ساتھ نقباء، امراء، قضاۃ اور فقہاء بہت بڑی تعداد میں شریک رہے۔ اسے اس کی وصیت کے مطابق ان

کپڑوں میں کفن دیا گیا جو اس نے خود اس مقصد کے لیے کات کر تیار کیے تھے اور امام احمد بن حنبل [۲۵] کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ قاضی ابو یعلیٰ نے پانچ سال کی عمر میں حدیث کی سماعت کی۔ ابو القاسم ابن حبابہ [۲۶]، ابو القاسم السراج [۲۷] اور اپنے والد ابو عبداللہ [۲۸] وغیرہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ طلب حدیث میں بغداد کے علاوہ مکہ، دمشق اور حلب کا سفر کیا۔ وہ خلیفہ قائم بامراللہ (۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ) کے عہد خلافت میں ۴۳۲ھ میں بغداد مستقل قیام کی غرض سے آیا۔ اس کے ساتھ علماء اور طلبہ کا ایک جم غفیر تھا۔ جب اس کی کتاب ''ابطال التاویلات'' کی شہرت ہوئی تو خلیفہ نے اسے منگوا کر پڑھا اور مصنف کا شکریہ ادا کیا۔ جب قاضی القضات ابن ماکولا شافعی [۲۹] کا ۴۴۷ھ میں انتقال ہوا تو خلیفہ نے قاضی ابو یعلیٰ کو دار الخلافت کا قاضی بنانا چاہا۔ اس نے ابتداء میں منصب قضاء قبول کرنے سے انکار کیا مگر بعد میں خلیفہ کے پیہم اصرار سے اسے منظور کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ شاہی سواری کے جلوس میں شریک نہ ہوگا۔ استقبال کے لیے نہ جائے گا اور دربار سلطانی میں حاضری نہ دے گا ''طبقات حنابلہ'' کے مصنف نے فقہائے حنابلہ کے پانچویں طبقے میں اسے شمار کیا ہے۔ اس کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے جامع منصور میں امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد [۳۰] کی مسند درس پر فائز ہو کر درس حدیث دیا تو لوگ نہایت کثرت سے اس میں شریک ہوئے۔ لوگوں کا مجمع اتنا زیادہ تھا کہ درس کے بعد جمعہ کی نماز میں نمازیوں نے جگہ کی تنگی کی وجہ سے فرش مسجد کے بجائے ایک دوسرے کی پیٹھوں پر سجدے کیے۔ صاحبِ ''طبقات الحنابلہ'' کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کی سماع کے لیے اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا۔

قاضی ابو یعلیٰ کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) احکام القرآن، (۲) مسائل الایمان، (۳) معتمد، (۴) الرد علی الاشعریہ، (۵) الرد علی الکرامیہ، (۶) ابطال التاویلات، (۷) اثبات امامتہ الخلفاء الاربعہ، (۸) تبریۃ معاویہ، (۹) جوابات مسائل وردت من الحرم، من میافارقین، من اصفہان،

(۱۰) الکفایہ فی اصول الفقہ، (۱۱) الاحکام السلطانیہ، (۱۲) فضائل احمدؒ، (۱۳) مقدمۃ فی الادب، (۱۴) کتاب فی الطب، (۱۵) کتاب اللباس، (۱۶) شروط اہل الذمہ، (۱۷) التوکل، (۱۸) ذم الغناء، (۱۹) ابطال الحیل، (۲۰) الفرق بین الآل و الاہل، (۲۱) الخلاف الکبیر وغیرہ۔

ابویعلیٰ، ابوالحسن ماوردی سے سولہ سال بعد ۳۸۰ھ میں پیدا ہوا، اور اس کے آٹھ سال بعد ۴۵۸ھ میں اس نے وفات پائی۔ وہ ۴۳۲ھ سے ۴۵۸ھ تک ۲۶ سال بغداد میں رہا۔ ۴۴۷ھ میں قاضی ابن ماکولا کے انتقال کے بعد قاضی ہوا اور اپنی وفات تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ اس طرح وہ گیارہ سال تک بغداد، حران اور حلوان کا قاضی رہا۔ اس کے حلقۂ درس کو بغداد میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ خلیفہ قائم بامراللہ اس کا ہم خیال اور مداح تھا کہ اس کا رجحان طبع حنابلہ کی جانب تھا۔ اسی لیے قاضی ابویعلیٰ کو بارگاہ خلافت میں جو تقرب حاصل تھا وہ قاضی ابوالحسن ماوردی کو نہ مل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ شافعی تھا اور خلیفہ کی نگاہ میں اس کی وہ عزت نہ ہوسکتی تھی جتنی کہ ایک حنبلی قاضی کی تھی۔ ماوردی کو جو تقرب حاصل تھا وہ بویہی امراء تک محدود تھا۔ اگرچہ ابتداء میں بنو بویہ بنو عباس پر مسلط رہے مگر پانچویں صدی ہجری میں ان کے ضعف اور سلاجقہ کے اقتدار کی وجہ سے خلیفہ عباسی کا دبدبہ فی الجملہ قائم ہوگیا تھا[۳۱] اور یوں جو حیثیت ابویعلیٰ کو حاصل تھی وہ ماوردی سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ اس کے علاوہ عوام کی اکثریت حنابلہ کی حامی تھی۔ اس لیے ابویعلیٰ ان میں ماوردی سے زیادہ مقبول تھا۔ اور اس کا ثبوت اس کے حلقۂ درس اور جنازہ میں عوام وخواص کے ازدحام سے بہم پہنچتا ہے۔ مگر ہمیں معاصر تذکروں سے ان دونوں کی کسی چشمک کا پتا نہیں چلتا۔

گو زندگی میں ابویعلیٰ کو ماوردی سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی مگر مرنے کے بعد ماوردی نے جو نام پایا وہ اس کے نام سے کہیں زیادہ روشن ہے۔ اس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ہر تذکرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اور بطور خاص اس کی دو کتابوں ''الحادی فی اصول الفقہ'' اور ''الاحکام السلطانیہ'' کا ذکر ضرور ہے۔ اس کے برعکس ابویعلیٰ کا تذکرہ جن

کتابوں میں ہے ان میں سے ایک اس کے بیٹے ابوالحسین بن ابی یعلیٰ کے ''طبقات حنابلہ'' یا اس کی تلخیص مرتبہ شمس الدین نابلسی کے سوا کسی کتاب میں اس کی تصنیف ''الاحکام السلطانیہ'' کا ذکر نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں دونوں کا مختصر حال لکھا ہے۔ جہاں ماوردی کا بیان ہے وہاں لکھا ہے کہ وہ ''الاحکام السلطانیہ'' کا مصنف ہے [۳۲]۔ مگر اس نے ابویعلیٰ کی کسی کتاب کا نام نہیں لکھا ہے۔ [۳۳]

ابویعلیٰ کی ''الاحکام السلطانیہ'' مندرجہ ذیل پندرہ فصلوں پر مشتمل ہے:

۱۔ امامت کے مسائل۔

۲۔ تقرر حکام۔ وزارت، امارتِ اقلیم، امارتِ جہاد، ولایتِ قضاء، ولایتِ مظالم کے مباحث۔

۳۔ نقیب الاشراف کا تقرر۔

۴۔ امامتِ صلوٰۃ۔

۵۔ امارتِ حج۔

۶۔ امارتِ صدقات۔

۷۔ تقسیمِ فئی، وغنیمت۔

۸۔ جزیہ وخراج کے مسائل۔

۹۔ مختلف شہروں کے احکام۔

۱۰۔ غیر آباد زمینوں کی آبادکاری اور آب پاشی کے لیے کنویں کھودنے کے احکام۔

۱۱۔ چراگاہ اور عام مفاد کے مقامات کے احکام۔

۱۲۔ جاگیر کے احکام۔

۱۳۔ قیامِ دیوان اور اس کے احکام کا بیان۔

۱۴۔ جرائم کے احکام۔

۱۵۔ احتساب کے احکام۔

ابوالحسن ماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' بھی انہیں مباحث پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنی پوری کتاب کو بیس ابواب پر منقسم کیا ہے۔ ان میں سے چودہ ابواب تو بعینہ وہی ہیں جو ابویعلیٰ کے یہاں ہیں۔ ابویعلیٰ کی فصل دوم ''تقرر حکام'' کو ماوردی نے پانچ مستقل ابواب میں بیان کیا ہے، اور یوں دونوں کتابوں کے تمام عنوانات ایک جیسے ہیں۔ صرف ماوردی کے ہاں ایک عنوان زائد ہے جو ابویعلیٰ کی کتاب میں نہیں ہے اور یہ اس کتاب کا پانچواں باب ہے جس کا عنوان ''مصالح ملکی کے لیے جنگ'' ہے [۳۴]، اور جسے اس نے جہاد سے الگ بیان کیا ہے۔ جبکہ ابویعلیٰ کے ہاں یہ بحث امارت جہاد کے ضمن میں آ گئی ہے۔ [۳۵]

ابویعلیٰ کا طرز استدلال محدثانہ ہے، جو حنبلی علماء کی خصوصیت ہے۔ وہ ہر دعویٰ کی دلیل میں حدیث اور تعامل صحابہ پیش کرتا ہے۔ مگر ان احادیث کا سلسلۂ روایت امام احمد بن حنبل کے سوا کسی اور محدث تک نہیں پہنچتا۔ وہ اپنی کتاب کے آغاز میں وجوب امامت سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر لوگوں کے امور کے انتظام کے لیے امام نہ ہو تو فتنہ بپا ہو جاتا ہے اس کے بعد امام احمد بن حنبلؒ کی روایت سے وہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ اس موقع پر انصار نے مہاجرین سے کہا تھا کہ ایک امیر تم میں سے ہو اور ایک ہم میں سے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے کہا تھا کہ قبیلۂ قریش کے سوا عرب کسی اور کی اطاعت قبول نہ کریں گے۔ تو اگر امامت واجب نہ ہوتی تو یہ مکالمہ اور گفتگو ہی نہ ہوتی۔ اور لوگ یہ کہہ دیتے کہ خلافت سرے سے ضروری ہی نہیں۔ نہ تو قریش اور نہ ہی کوئی دوسرا قبیلہ اس کا حقدار ہے۔ مگر لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلافت کو ہر شخص ضروری اور واجب سمجھتا تھا۔ [۳۶]

اگر کسی مسئلہ میں مجتہدین کے مابین اختلاف رائے ہو تو ماوردی اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے برعکس ابویعلیٰ صرف امام احمد بن حنبل کے مسلک کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً مسئلہ یہ ہے کہ ذمیوں سے جزیہ کس شرح سے وصول کیا جائے۔ وہ امام احمد بن حنبل کے تین اقوال نقل کرتا ہے۔ اول یہ کہ جزیہ کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ شرح مقرر

ہے۔ غریبوں سے ۱۲ درم، متوسط الحال افراد سے ۲۴ درم اور متمول طبقے سے ۴۸ درم فی کس سالانہ۔ دوم یہ کہ نہ تو جزیہ کی کم سے کم شرح متعین ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ۔ اس کی شرح کا تعین امام وقت کے اجتہاد پر منحصر ہے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ جزیہ کی کم ازکم شرح تو متعین ہے۔ مگر زیادہ سے زیادہ شرح کا تعین شارع نے نہیں کیا ہے۔ امام وقت، حضرت عمر فاروقؓ کی مقرر کی ہوئی شرح میں اضافہ کرنے کا مجاز ہے مگر اسے اس میں کسی کمی کا اختیار نہیں ہے[۳۷]۔ اس کے برعکس جب اسی مسئلہ کو ماوردی بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق تمام ائمۂ مجتہدین کی رایوں کو بیان کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جزیہ کی شرح کے تعین میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ[۳۸] نے اس کی تین تقسیمیں کی ہیں۔ دولت مندوں سے ۴۸ درم، متوسط الحال لوگوں سے ۲۴ درم اور غریبوں سے ۱۲ درم سالانہ۔ اس طور سے جزیہ کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ شرح مقرر کی گئی ہے۔ اور اس میں والیوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ امام مالک[۳۹] کی رائے ہے کہ جزیہ کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ شرح کی کوئی تعیین نہیں ہے اس کا انحصار والیوں کے اجتہاد پر ہے۔ امام شافعی[۴۰] کا مسلک یہ ہے کہ جزیہ کی کم ازکم شرح ایک دینار (۱۲ درم) سالانہ ہے۔ اس سے کم ناجائز ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ شرح متعین نہیں ہے۔ اس کا انحصار والیوں کے اجتہاد پر ہے۔ انہیں اختیار ہے خواہ وہ ہر طبقے سے یکساں شرح سے جزیہ وصول کریں یا ان کی حیثیت کے مطابق مختلف شرحوں سے۔[۴۱]

ہم ابوالحسن ماوردی اور ابویعلیٰ کے اندازِ بیان کے فرق کی مزید وضاحت کی غرض سے ایک ہی موضوع پر دونوں کے خیالات کا لفظی ترجمہ ذیل میں پیش کرتے ہیں:

مرتدین سے جنگ (ابوالحسن ماوردی):

مرتدین کو کس طرح قتل کیا جائے اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا انہیں فوراً قتل کر دیا جائے یا تین دن کی مہلت دی جائے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان کے قتل میں عجلت کی جائے تاکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں تاخیر نہ ہو دوسری رائے یہ ہے کہ انہیں تین

دن کی مہلت دی جائے کہ شاید وہ توبہ کرلیں۔ کیونکہ حضرت علیؓ نے مستور وعجلی کو توبہ کرلینے کے لیے تین دن کی مہلت دی تھی اور اسے اس کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ مرتد کو تلوار سے بحالت اسیری قتل کیا جائے۔ امام شافعیؒ کے اصحاب میں سے ابن سُریج کا قول ہے کہ مرتد کو اس وقت تک لکڑی سے مارا جائے جب تک کہ وہ مر نہ جائے۔ کیونکہ یہ طریقۂ قتل تلوار کی بہ نسبت سست رو اور دیر طلب ہے۔ ممکن ہے کہ مرتد اس دوران میں توبہ کرلے۔

اور جب مرتد کو قتل کردیا جائے تو نہ اسے غسل دیا جائے، نہ اُس کی نماز جنازہ پڑھائی جائے اور نہ اس کے لیے قبر تیار کی جائے بلکہ اسے گڑھا کھود کر دفن کردیا جائے۔ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس نے مرتد ہو کر گویا ان کے خلاف خروج کیا تھا اور نہ اسے مشرکین کے مرگھٹ میں گاڑا جائے کیونکہ اسے سابق میں حرمتِ اسلام حاصل تھی جو اس کو مشرکین سے جدا کردیتی ہے۔

اس کا مال بیت المال کے لیے فی ہے، اور فی کی مدات میں صرف کیا جائے۔ کوئی مسلمان یا غیر مسلم اس کا وارث نہیں ہوسکتا۔ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ مرتد ہونے سے پہلے جو مال اس نے کمایا ہے اس کا مسلمان وارث ہے اور حالت ارتداد میں کمایا ہوا مال فی ہے۔ امام ابو یوسف [۴۲] کا قول ہے کہ مسلمان مرتد کے مال کا وارث ہے خواہ وہ مال ارتداد سے قبل یا بعد کمایا ہو۔ اگر مرتد دارالحرب میں چلا جائے تو اس کا جو مال دارالاسلام میں ہوگا وہ اس پر وقفِ مقصود ہوگا اور اگر وہ دوبارہ مسلمان ہوجائے تو یہ مال اسے واپس کردیا جائے گا لیکن اگر بحالت ارتداد مر جائے تو یہ سارا مال فی ہوجائے گا۔ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ اگر مرتد دارالحرب میں بھاگ جائے تو بمنزلہ مردہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کا مال اس کے وارثوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔ اگر اس کے بعد وہ مسلمان ہو کر دارالاسلام میں واپس آجائے تو اس کا جو مال اس کے ورثہ کے پاس موجود ہو وہ اسے لوٹا دیا جائے۔ اور جو وہ خرچ کرچکے ہوں وہ ان سے وصول نہ کیا جائے۔ [۴۳]

مرتدین سے جنگ (ابو یعلیٰ الفراء):

مرتدین کو تین دن ڈرانے کے بعد ان سے جنگ واجب ہے، خواہ مرتد عورت ہو یا مرد۔ مرتدین کو جزیہ کی ادائیگی اور معاہدہ کی بنا پر ان کے ارتداد پر باقی رکھنا جائز نہیں ہے۔ ان کے ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت نہ کھایا جائے۔ ان کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے اور جب انہیں قتل کیا جائے تو غسل نہ دیا جائے۔ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ مرتد ہو کر مسلمانوں سے الگ ہو گئے اور انہیں مشرکین کے قبرستان میں بھی دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کو سابق میں حرمتِ اسلام حاصل تھی۔ انہیں گڑھا کھود کر دفن کر دیا جائے۔

ان کا مال مسلمانوں کے بیت المال کا فیٔ ہے اور فیٔ کے مدات میں صرف کیا جائے۔ ان کے متروکہ کا نہ تو کوئی مسلمان وارث ہوسکتا ہے اور نہ غیر مسلم۔ اگر مرتدین دارالحرب میں بھاگ جائیں تو ان کا مال جو دارالاسلام میں رہ گیا ہو ان پر وقف ہوگا۔ اگر وہ اسلام کی جانب لوٹ آئیں تو ان کا مال واپس کر دیا جائے گا اور اگر دارالحرب میں بحالت ارتداد مر جائیں تو ان کا مال فیٔ محسوب ہوگا۔ [۴۴]

اس اقتباس سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ماوردی کا بیان نہایت مفصل ہے جبکہ ابو یعلیٰ کے ہاں اتنی تفصیل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ابو یعلیٰ، امام احمد بن حنبل کے مسلک کی تفصیل پر اکتفاء کرتا ہے اور اس سلسلہ میں ان سے جتنی روایتیں جس جس طریقۂ روایت سے مروی ہیں انہیں بالاستیعاب بیان کر دیتا ہے۔ اور دیگر ائمۂ مجتہدین کی آراء کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتا اور نہ ان کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے برعکس ماوردی ائمۂ مجتہدین میں سے امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ القاضی اور امام شافعی کے اقوال نقل کر کے کسی ایک مسئلہ کے بارے میں مختلف فقہی مکاتب کے افکار و آراء کو یکجا کر دیتا ہے۔ اس حیثیت سے ماوردی کی کتاب زیادہ مکمل اور زیادہ مفید ہے اور کسی مسئلہ سے متعلق اس کا بیان اپنے ہمعصر کے بیان کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہے۔

دونوں کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماوردی اور ابویعلیٰ میں سے کسی ایک نے اپنی کتاب پہلے تحریر کی اور دوسرے نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت اسے پیش نظر رکھا۔ اس خیال کی توثیق کی غرض سے ان کتابوں کے متن کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

ماوردی

(۱) اما الا رفاقُ فهوا رفاقُ الناسِ بمقاعدِ الاسواقِ وافنيةِ الشوارعِ وحريمِ الا مصارِ ومنازلِ الاسفارِ فيقسمُ ثلاثةَ اقسامٍ:

قسم يختصُ الارتفاق فيه بالصحارىٰ والفلواتِ وقسم يختصُ الارتفاقُ فيه بافنيةِ الا ملاكِ وقسم يختصُ بالشوارعِ والطرق.[۴۵]

(۲) واما امارةُ الاستيلاءِ التى تعقد عن اضطرارٍ فهى ان يستولى الاميرُ بالقوةِ علىٰ بلادٍ يقلده الخليفةُ امارتها ويفوض اليه تدبيرها وسياسَتها فيكونُ الامرُ باستيلائه مستبدً ابا سياستهِ والتدبيرِ. والخليفةُ باذنه منفذ الاحكامِ الدينِ ليخرج من الفسادِ الىٰ الصحته ومن الخطرالى الاباحةِ. وهذا وإن خرجَ من عرف التقليدالمطلقِ فى شروطه واحكامه ففيه من حفظِ القوانينِ الشرعيةِ و حراسةِ الاحكام الدينية مالا يُجوزُ أن يتركَ مختلا مدخولا ولا فاصرا معلولا. فجاز مع الا ستيلاء والاضطرار ما امتنع فى تقليد الاستكفاء والاختيار لوقوعِ الفرقِ بين شروط المسكنةِ والعجزِ. [۴۶]

ابو یعلیٰ

(۱) اما الا رفاقُ فهومن ارتفاقِ الناسِ بمقاعدِ الاسواقِ وافنيةِ الشوارعِ وحريم الا مصارِ و منازلِ الا سفارِ فتنقسمُ ثلاثةُ اقسام:

قسم يختص الارتفاق فيه بالصحارىٰ والفلوات وقسم يختصُ الارتفاق فيه بافنية الاملاکِ وقسم يختصُ بالشوارعِ والطرقاتِ. [۴۷]

(۲) اما امارة الاستيلاءِ التی تعقد علیٰ اضطرار فهی ان يستولی الاميرُ بالقوةِ علیٰ بلادِ يقلدهُ الخليفةُ امارتها ويفوض اليه تدبيرها وسياستها. فيكون الاميرُ باستيلائه مُستبداًبالخليفةِ فی تدبير السياسة وتنفيذِ الاحكامِ الدينيةِ ليخرجَ عن الفسادِ الی الصحةِ ومن الخطرالی الا باحةِ. وهذا وإن خرجُ من عرفِ التقليدِ المطلق. ففيه من حفظِ القوانين الشرعية مالا يجوزُ اَن يترکِ فاسداً. فجازفيه مع الاستيلاءِ والاضطرارِ ما امتنع فی تقليد الاستكفاءِ ولاختيارِ. [۴۸]

ہم نے بخوفِ طوالت صرف دو اقتباسوں پر اکتفاء کی ہے۔ ورنہ اس قسم کے توارد کی مثالوں سے یہ کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جب یہ امر متحقق ہوگیا کہ دونوں میں سے کوئی ایک کتاب نقل ہے تو اس بات کا پتا چلانا چنداں دشوار نہیں رہ جاتا کہ اصل کون سی کتاب ہے، اور نقل کون سی۔ اگرچہ ان کتابوں کے سنین تالیف معلوم نہیں ہیں مگر قرینۂ غالب یہی ہے کہ ابوالحسن ماوردی نے اپنی کتاب پہلے لکھی اور اس کے بعد ابو یعلیٰ فراء نے۔ ابو یعلیٰ کے پیش نظر یہ کوشش ہے کہ ماوردی کی کتاب میں امام احمد بن حنبلؒ کے اقوال درج نہیں ہیں جس سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ان کے اپنے افکار سیاسیہ نہ تھے۔ اس لیے انہیں اصول کو پیش نظر رکھ کر ان سے متعلق امام احمد کے اقوال کو بالتفصیل بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ ماوردی کے اصول کہیں بعینہٖ اور کہیں تلخیص کے ساتھ اس نے نقل کر کے ان کے ضمن میں امام احمد کے اقوال کی تفصیل دی ہے اور دوسرے ائمہ کے اقوال سے بحث نہیں کی ہے۔ علمی دیانت کا یہ اقتضاء تھا کہ ابو یعلیٰ اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر دیتا مگر اس عہد میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں جبکہ لوگوں نے پوری کی پوری کتاب نقل کر کے اپنے نام سے موسوم کر لی اور اصل کا کوئی ذکر نہ کیا۔ (بلکہ آج بھی یہ روش نادر الوقوع نہیں)۔

حواشی

[۱] دسواں عباسی خلیفہ اپنے بھائی واثق باللہ کی وفات کے بعد مسند خلافت پر ذی الحجہ ۲۳۲ھ میں متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں ترک غلاموں کی طاقت میں بڑا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے ان کا زور توڑنے کی غرض سے ان کے کئی سرداروں کو قتل کرادیا اور عربوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا مگر اس کے منصوبے کی تکمیل سے قبل ہی ترکوں نے اس کے بیٹے منتصر سے سازش کر کے اسے شوال ۲۴۷ھ میں رات کے وقت دھوکے سے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کے بعد خلافت ترکوں کے ہاتھ میں بازیچۂ اطفال بن گئی اور اس کا وقار جاتا رہا۔ (ابو الفداء، مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۵ھ، ج ۲، ص ۳۷۔۴۱)

[۲] متوکل کے بعد ترک غلاموں نے مرکز خلافت کی تباہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان میں طاہریوں کے خاتمہ کے ساتھ صفاری، سامانی، غزنوی، غوری اور خوارزمی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ آل بویہ اور سلاجقہ کی حکومت بغداد تک وسیع ہوگئی۔ اسی طرح مغرب میں اخشیدی مصر میں، زنگی شام میں اور حمدانی جزیرہ میں خود مختار ہوگئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کی کتاب خلافت و سلطنت مطبوعہ جمعیت الفلاح کراچی ۱۹۶۳ء)

[۳] نظام الملک طوسی۔ سیاست نامہ۔ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۱ء، ص ۳۔

[۴] ابوالحسن الماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ مطبوعہ مصطفیٰ بابی الحلبی مصر ۱۳۸۰ھ، ص ۳۳۔

[۵] ۳۶۰ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ سبکتگین کے بعد ۳۸۷ھ میں سلطنت غزنویہ کا حکمران ہوا۔ اس کے عہد میں اس کی سلطنت میں بہت وسعت ہوئی۔ خراسان اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو اس نے مسخر کیا۔ خلیفہ عباسی قادر باللہ نے اسے خلعت اور خطاب یمین الدولہ سے سرفراز کیا ۴۲۱ھ میں وفات پائی۔ ابن الاثیر، الکامل، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۹۶۷ء، ج ۷، ص ۳۴۶۔

[۶] سلجوق کا پوتا اور میکائیل کا بیٹا تھا۔ سلطنت سلاجقہ کا بانی یہی ہے۔ محمود غزنوی کی وفات کے بعد اس نے خراسان اور ایران کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا اور اپنے خاندان کی مستقل حکومت قائم کرلی۔ عباسی خلیفہ قائم بامراللہ نے حسن خدمات کے عوض اس کو سلطان کا خطاب دیا۔ اس نے بغداد سے آل بویہہ کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ طغرل نے ۴۵۵ھ میں وفات پائی۔ ابن الاثیر، الکامل، ج ۸، ص ۹۴ و ۹۵۔

[۷] تکش کا بیٹا اور اپنے عہد کا نہایت جلیل القدر بادشاہ تھا۔ اس نے ۲۱ سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ سرحد عراق سے ترکستان تک اور غزنہ سے سرحد ہند تک اس کے قلم رو کی وسعت تھی۔ تاتاریوں سے اس کی آویزشوں میں اسے راہ فرار اختیار کرنی پڑی اور اس نے مازندران کے قریب ایک جزیرے میں نمونیا میں مبتلا ہو کر ۶۱۷ھ میں انتقال کیا۔ اس کا عہد حکومت خانوادۂ خوارزمیہ کے عروج و زوال کا مرقع ہے۔ اس نے ۶۱۴ھ میں ہمدان سے بغداد کا قصد کیا تاکہ خلافت عباسی کا خاتمہ کردے۔ مگر اس کی فوج کردستان کی پہاڑیوں میں طوفان ابر و برف باری سے تباہ ہوگئی اور اسے خیوا واپس جانا پڑا (ابوالفداء۔ المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۳ ص ۱۱۸ و ۱۲۷)

[۸] چونتیسواں عباسی خلیفہ الناصر لدین اللہ ۵۷۵ھ میں مسند خلافت پر فائز ہوا۔ ۴۷ سال حکومت کر کے ۶۲۲ھ میں وفات پائی۔ وہ نہایت باتدبیر اور لائق حکمراں تھا۔ مگر ظالم بھی تھا۔ اس کے تعلقات خوارزم شاہ سے عموماً خراب رہے اور یہ ناخوشی عراق عجم کے قبضے کے سلسلے میں تھی۔ (ابوالفداء۔ ج ۳، ص ۱۳۵ و ۱۳۶)

[۹] ڈاکٹر امیر حسن صدیقی۔ خلافت و سلطنت۔ ص ۱۵۵ و ۱۵۶۔

[۱۰] طوس کا دہقان زادہ ابوعلی حسن بن علی ۴۰۹ھ میں پیدا ہوا۔ علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد حاکم بلخ کا کاتب (سکریٹری) ہوا۔ اس کے بعد طغرل بیگ سلجوقی کے بھائی جغری بیگ کی سرکار میں ملازم ہوا۔ بعد ازاں ولی عہد سلطنت الپ ارسلاں کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس کی تخت نشینی حسن کے حسن تدبیر کی رہین منت ہے اسی کے صلے میں اسے منصب وزارت تفویض ہوا جس پر وہ تیس سال تک فائز رہ کر ملک شاہ کے آخری عہد میں ۴۸۵ھ میں معزول کیا گیا اور جلد ہی اسے

نامعلوم قاتلوں نے قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ باطنی فدائی تھے۔ وہ اپنے عہد وزارت میں ملک کے سیاہ سپید کا مالک تھا۔ اس سے سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء دونوں ہی خوش تھے اس کا دربار اہل علم سے بھرا رہتا تھا۔ علم کی اشاعت کا کام اس سے زیادہ شاید ہی کسی مسلمان امیر یا وزیر نے کیا ہو۔ اس نے بغداد میں اپنا شہرۂ آفاق مدرسۂ نظامیہ قائم کیا۔ یہ مدارس سلجوقی حکومت کے متعدد اہم شہروں میں قائم کیے گئے تھے۔ جن کے اساتذہ اس عہد کے سرآمد روزگار علماء تھے۔ اس کی کتاب سیاست نامہ عملی سیاست پر نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات اور سادہ و پرکار نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ابن الاثیر، الکامل، ج ۸، ص ۱۶۱۔۱۶۳۔

[۱۱] امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن سکندر بن امیر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر، خاندان زیاریہ کا چشم و چراغ تھا جس نے ۳۱۶ھ سے ۴۳۴ھ تک طبرستان پر خود مختارانہ حکومت کی۔ اس کے بعد اس خاندان کی حیثیت ایک باجگزار حکمراں کی رہی۔ علم دوستی اور اہل علم کی قدردانی کے لیے یہ خانوادہ ممتاز تھا۔ بیرونی اور ابن سینا جیسے نابغۂ روزگار اسی خاندان کے متوسلین میں تھے خود امیر قابوس فارسی اور عربی ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتا تھا اور عربی کا بہت عمدہ شاعر تھا۔ کیکاؤس کی شہرت اس کی کتاب قابوس نامہ کی وجہ سے ہے۔ اس کتاب کو قدیم فارسی نثر نگاری کا نادر نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ فضائل اخلاق اور امور جہاں بانی کے ساتھ ساتھ بہت سے تاریخی واقعات اس میں نہایت صحت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے فرانسیسی، عربی اور انگریزی میں کیے گئے ہیں، فارسی ادب کے محقق براؤن نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں اس پر بارہ صفحات صرف کیے ہیں کیکاؤس نے ۴۷۵ھ میں وفات پائی۔

(E.G. Browne- A Literary History of Persia- Vol-II, PP-276-287. Cambridge University Press-1951. Sir Percy Sykes- A History of Persia- Vol-II. PP-23-24. London 1930) -

[۱۲] ابو یعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۳۵۶ھ (مقدمۂ کتاب) ص ۲۹۔۳۱۔

[۱۳] ابو یعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ (مقدمہ کتاب) ص ۳۳۔

[۱۴] ابن حجر عسقلانی: شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دنیائے اسلام کے طویل سفر کیے اور حدیث، سیر، فقہ، تاریخ، ادب ولغت اپنے عہد کے نامور علماء سے سیکھے۔ وہ اشرف برسبائی مشہور مملوک سلطان مصر وشام کے عہد میں مصر کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ انہوں نے حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ و سیر میں گراں قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری، الاصابہ فی تمییز الصحابہؓ، تہذیب الکمال، نخبتہ الفکر اور تقریب التہذیب، ابن حجر جیسا جامع کمال متاخرین علمائے اسلام میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ انہوں نے ۸۵۲ھ میں وفات پائی۔ (جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغتہ العربیہ، مطبوعہ دارالبلال مصر ۱۹۵۸ء، ج ۳، ص ۱۷۹۔۱۸۲)

[۱۵] ابوطاہر مجدالدین محمد بن یعقوب شیرازی فیروز آبادی ۷۲۹ھ میں شیراز کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ سفر میں گزارا۔ وہ مشہور ترکی سلطان بیازید سے ملے اور اس نے ان کی بڑی عزت کی۔ امیر تیمور سے بھی وہ ملے۔ تیمور نے ان کی بڑی قدردانی کی اور پانچ ہزار دینار بطور ہدیہ ان کی خدمت میں پیش کیے۔ اخیر عمر میں انہوں نے یمن کے مقام زبید میں توطن اختیار کرلیا تھا اور منصب قضا پر فائز تھے۔ فیروز آبادی نے ۸۱۷ھ میں زبید میں انتقال کیا۔ علمی دنیا میں ان کی شہرت ان کی مشہور کتاب لغت القاموس المحیط کی وجہ سے ہے۔ اس کتاب کی جانب بعد کے ادوار میں بہت توجہ کی گئی اور ایک درجن سے زیادہ ضخیم شرحیں لکھی گئیں۔ ان شروح میں مرتضٰی زبیدی کی شرح تاج العروس من جواہر القاموس دس جلدوں پر محیط ہے۔ اس کتاب کا اردو، ترکی اور فارسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اپنے اختصار، معیار اور حسن ترتیب کے لیے یہ مشہور ہے۔ اس میں کم وبیش ساٹھ ہزار الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ فیروز آبادی کی جلالت شان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابن حجر جیسا عالم بھی ان کا شاگرد ہے۔ (جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغتہ العربیہ، ج ۳، ص ۱۵۷)

[۱۶] شمس الدین محمد بن احمد ذہبی دمشقی (۶۷۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ اور ۷۴۸ھ میں دمشق میں

وفات پائی۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے محدث، مورخ اور ماہر اسمائے رجال تھے۔ ان کی تصانیف میں تاریخ اسلام اور العبر فی خبر من غبر بہت مشہور ہیں اور متعدد بار چھپ چکی ہیں (تاریخ ابوالفدا، ج ۴، ص ۱۵۰، ذیل ابن الوردی)

[۱۷] ابن قیم جوزیہ: شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر دمشقی حنبلی ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۵۱ھ میں وفات پائی۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید تھے۔ انہوں نے جدلیات اور رد مذاہب میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابیں اعلام الموقعین، شفاء الغلیل، زاد المعاد اور الدر رالکامنۃ ہیں (جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۳، ص ۲۶۴)۔

[۱۸] تقی الدین احمد بن عبدالحلیم حران میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں دمشق آ گئے اور یہیں انہوں نے دو سو سے زیادہ شیوخ و علماء سے تحصیل علم کیا۔ حنبلی فقہاء میں انہیں امتیاز حاصل ہے۔ انہوں نے علمی دنیا کے باہر عملی دنیا سے بھی دل چسپی لی اور اس عہد کی سیاست سے براہ راست تعلق قائم رکھا۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف اس عہد کے شامی اور مصری امراء کو متحد کیا اور انہیں کی کوششوں سے تاتاریوں کو ۶۹۹ھ کی جنگ میں زبردست شکست ہوئی۔ ان کی تصانیف میں فتاویٰ ابن تیمیہ منتقی الاخبار، منہاج السنۃ اور سیاست الٰہیہ مشہور ہیں۔ انہوں نے ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ (جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۳، ص ۲۶۱-۲۶۳)

[۱۹] قاضی ابوالحسین بن قاضی کبیر ابویعلیٰ حنبلی ۴۵۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر سات سال تھی۔ اسے اس کے گھر میں نامعلوم قاتلوں نے شب عاشورہ ۵۲۶ھ میں قتل کر دیا۔ اس کی تصانیف میں ایضاح الادلہ اور طبقات حنابلہ مشہور ہیں۔ (ابن الجوزی۔ کتاب المنتظم، دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۵۸ھ، ج ۱۰، ص ۲۹)

[۲۰] حافظ ابوبکر احمد بن علی معروف بہ خطیب بغدادی۔ ۳۹۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی نشوونما بغداد میں ہوئی۔ ان کا شمار مشاہیر حفاظ میں ہوتا ہے۔ ساٹھ سے زائد اور بروایت دیگر سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے ۷۲ سال کی عمر پائی۔ قاضی ابویعلیٰ سے انہوں نے روایت حدیث کی ہے۔ خطیب کی زندگی تصنیف و تالیف کے لیے وقف تھی۔ مدرسہ نظامیہ کے پڑوس میں ایک حجرے میں

زاہدانہ زندگی گزارتے تھے اور یہیں ۳۶۳ھ میں وفات پائی (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ، مطبوعہ سعادت مصر (بار اول)، ج ۱۲، ص ۱۰۱-۱۰۳)

[۲۱] ۷۲۷ھ میں نابلس (فلسطین) میں پیدا ہوا اور وہیں ۷۹۷ھ میں وفات پائی۔ حنبلی فقہا میں اسے امتیاز حاصل ہے۔ ابن قیم جوزیہ کا شاگرد رشید تھا۔ شرح الوجیز اور مختصر طبقات الحنابلہ اس کی تالیفات ہیں (مختصر طبقات الحنابلہ، مطبوعہ الاعتدال، دمشق ۱۳۵۰ھ مقدمہ ص ۱۱ (یا) و ۱۲ (یب)

[۲۲] حافظ عماد الدین بو الفدا اسماعیل بن عمر بن کثیر قرشی دمشق میں ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علوم قرآن حدیث وفقہ کی تحصیل کی اور شافعی فقہاء میں امتیاز پایا۔ ۷۴۸ھ میں مسجد امام صالح اور بعد ازاں مدرسۂ اشرفیہ دمشق میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ان کی تصانیف میں البدایہ والنہایہ، فن تاریخ میں جامع المسانید، حدیث میں الاجتہاد فی طلب جہاد فقہ میں اور تفسیر ابن کثیر مشہور ہیں۔ ابن کثیر نے ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ (جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ ج ۳، ص ۲۰۸ و ۲۰۹)

[۲۳] ابو الفرج عبدالرحمن بن علی ابن الجوزی الحنبلی الصدیقی اپنے وقت کے امام حدیث و وعظ تھے۔ ان کی شخصیت بڑی جامع صفات ہے انہوں نے سو سے زیادہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، طب، تاریخ، سیر وتراجم، جغرافیہ وعظ، تصوف اور لغت میں تالیف کیں۔ ان میں سے مشہور المنتظم تاریخ میں، صفوۃ الصفوۃ تذکرہ صوفیاء میں اور تلبیس ابلیس عقائد میں ہیں۔ ابن الجوزی نے بغداد میں ۵۹۷ھ میں وفات پائی (جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۳، ص ۹۹-۱۰۲)

[۲۴] ابو القاسم عبداللہ بن محمد بن حسین قاضی ابو یعلیٰ کے بیٹے تھے۔ ۴۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ اور دوسرے ائمہ عصر سے حدیث، تفسیر وفقہ کا درس لیا۔ طلب علم کے سلسلے میں واسط، بصرہ، کوفہ، موصل کا سفر کیا۔ جب ۴۶۹ھ میں بغداد میں بدعت کا زور ہوا تو یہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ مکہ ہجرت کر گئے اثنائے سفر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (مختصر طبقات حنابلہ، ص ۳۹۱ و ۳۹۲)

[۲۵] امام احمد بن محمد بن حنبل شیبانی اہل سنت کے چوتھے امام ہیں۔ وہ بہت بڑے محدث تھے

امام شافعی اور امام ابو یوسف کے شاگرد تھے۔ ۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ احادیث کا مجموعہ مسند احمد ان کی یادگار ہے۔ انہوں نے فتنہ خلق قرآن میں مامون، معتصم اور واثق کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائیں مگر اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۳۲۵ و ۳۲۶)

[۲۶] ابوالقاسم عبیداللہ بن محمد معروف بہ ابن حبابہ بغداد میں ۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ محدث بغوی اور قاضی ابن ابوداؤد سے سماعت حدیث کی وہ ثقہ اور مامون تھے۔ انہوں نے ۳۸۹ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ (ابن جوزی۔ المنتظم۔ ج ۷، ص ۲۰۷)

[۲۷] ابو القاسم موسیٰ بن عیسیٰ السراج ۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۸۷ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ابن ابی داؤد وغیرہ سے حدیث روایت کی وہ نہایت ثقہ تھے۔ (ابن جوزی۔ المنتظم۔ ج ۷، ص ۲۰۱)

[۲۸] ابوعبداللہ حسین بن محمد اپنے عہد کے شاہد عادل تھے۔ انہوں نے متعدد محدثین سے سماعت حدیث کی وہ حنفی المذہب تھے۔ شعبان ۳۹۰ھ میں وفات پائی (ابن جوزی۔ المنتظم۔ ج ۷، ص ۲۱۰)

[۲۹] ابوعبداللہ، حسین بن علی عجلی معروف بہ ابن ماکولا ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں بصرے کے قاضی ہوئے۔ بعد ازاں ۴۲۰ھ میں بغداد کے قاضی القضات ہوئے اور اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔ وہ شافعی المذہب تھے۔ (ابن جوزی، المنتظم، ج ۸، ص ۱۶۷)

[۳۰] ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن امام احمد بن حنبل حافظ حدیث، ثقہ اور معتبر تھے۔ انہوں نے امام احمد سے تفسیر و حدیث روایت کی۔ ان کے باپ کا مذہب انہیں سے پھیلا۔ مسند احمد انہیں نے ترتیب دی۔ ۲۷۷ھ میں وفات پائی (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۱، ص ۹۶ و ۹۷)

[۳۱] تفصیل کے لیے ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کی ''خلافت و سلطنت'' کے ابواب ہشتم و دہم ملاحظہ فرمائیں۔ ص ۸۳ تا ۱۰۶ و ۱۱۷ تا ۱۴۸۔

[۳۲] ابن کثیر دمشقی۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳، ص ۸۰۔

[۳۳] ابن کثیر دمشقی۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۲، ص ۹۴ و ۹۵۔

[۳۴] ماوردی۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۵۴۔۶۴۔

[۳۵] ابویعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۳۶، ۳۸ تا ۴۴۔

[۳۶] ابویعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۳۔

[۳۷] ابویعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۱۳۹۔

[۳۸] نعمان ثابت تیمی کی کنیت ابوحنیفہ اور لقب الامام الاعظم ہے وہ کوفہ میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حماد بن ابی سلیمان اور عامر شعبی سے روایت حدیث کی۔ مشہور صحابی حضرت انس بن مالک کی رویت سے مشرف ہوئے۔ یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے سات صحابہ سے روایت حدیث کی ہے۔ منصور نے انہیں بغداد میں قید کردیا تھا جہاں بحالت اسیری ۱۵۰ھ میں انہوں نے وفات پائی وہ فقیہِ عراق اور اہل سنت کے چار اماموں میں سے سب سے پہلے امام ہیں۔ بقول امام شافعی لوگ فقہ میں ان کے ''عیال'' ہیں۔ (البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۱۰۷)

[۳۹] مالک بن انس ۹۳ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ۱۷۹ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ وہ اہل سنت کے دوسرے امام ہیں۔ انہوں نے متعدد تابعین سے روایت حدیث کی۔ امام شافعی اور امام محمد وغیرہ نے ان سے حدیث روایت کی۔ ''موطا'' حدیث وفقہ کی مستند ترین کتاب ان سے یادگار ہے۔ بقول امام شافعی لوگ حدیث میں ان کے ''عیال'' ہیں۔ (البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۱۷۴)

[۴۰] محمد بن ادریس شافعی مُطّلبی قریشی ۱۵۰ھ میں غزہ (فلسطین) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں مکہ چلے آئے اور یہیں تحصیل علم کی۔ پھر مدینہ جاکر امام مالک سے حدیث حاصل کی۔ بعد میں بغداد جاکر امام محمد سے مذہبِ اہلِ عراق کا درس لیا۔ ان کے شاگردوں میں امام احمد بن حنبل اور سلیمان بن ربیع بہت مشہور ہیں۔ وہ اہل سنت کے تیسرے امام اور اصول فقہ کے مرتب ہیں۔ ان کا رسالۂ اصولیہ اور کتاب الام ان کی تصانیف میں خاص شہرت کی مالک ہیں۔ انہوں نے مصر میں ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱۰، ص ۲۵۱-۲۵۴)

[۴۱] ماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۱۴۴۔

[۴۲] ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے حدیث الاعمش سے، مغازی محمد بن اسحاق سے اور فقہ امام ابو حنیفہ سے سیکھے۔ امام ابو حنیفہ کے سب سے ممتاز شاگرد یہی تھے۔ ان کے تلامذہ میں امام محمد بن حسن اور امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں۔ وہ ہادی کے عہد خلافت میں قاضیٔ بغداد مقرر ہوئے اور ہارون کے دور میں دنیائے اسلام کے پہلے قاضی القضاۃ ہوئے۔ کتاب الخراج ان کی سب سے اہم تالیف ہے۔ (البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۱۸۰)

[۴۳] ماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۵۵ و ۵۶۔

[۴۴] ابو یعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۳۶۔

[۴۵] ماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۱۸۷۔

[۴۶] ابو یعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۲۰۸۔

[۴۷] ماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۳۳۔

[۴۸] ابو یعلیٰ۔ الاحکام السلطانیہ۔ ص ۲۱۔

(ماہنامہ ''نگار'' پاکستان، کراچی ۱۹۶۸ء)

ooo

نظام الملک طوسی کے سیاسی نظریات

خلافت عباسیہ کے قیام میں خراسانیوں کی حمایت کو بڑا دخل ہے۔ ابومسلم اور دیگر عباسی داعیوں نے ان خراسانیوں کو عربوں کے خلاف متحد کر کے بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ کیا اور آل عباس کی خلافت کی بنیادیں استوار کیں [ا]۔ اہل خراسان اس خانوادۂ خلافت کے کم و بیش سو سال تک بڑے پُرخلوص وفادار رہے اور انہیں کی جاں سپاریوں اور جان باریوں کی وجہ سے عباسی خلفاء کی عظمت کے محل سربلند اور پُروقار رہے۔ لیکن مامون کے دور سے ان کی وفاداریوں پر شک کیا جانے لگا۔ خلافت کو ایک نئے بازوئے شمشیر زن کی جستجو ہوئی اور اپنی حکومت کے آخری سال مامون نے ترک غلاموں کا ایک دستۂ فوج تیار کیا۔ اس کے جانشین معتصم نے نہایت کثرت سے ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا اور ان کی پاسداری یہاں تک کی کہ ان کے لیے ایک نیا شہر سامرہ آباد کیا اور سریر خلافت وہیں منتقل کر دیا۔ واثق کے عہد خلافت میں ترک امراء اور جند کے اختیارات میں اس حد تک اضافہ ہو گیا کہ وہ امور مملکت کے سیاہ و سپید کے مالک بن گئے۔ اس کے بھائی اور جانشین متوکل نے ترکوں کا زور توڑنے کی کوشش کی ان کے بعض سرداروں کو قتل کرا دیا، بارہ ہزار کے قریب عرب سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کیا اور سامرہ سے دمشق کو مرکز خلافت منتقل کر دینا چاہا۔ مگر ان منصوبوں کی تکمیل سے قبل ہی ترک امراء نے محلاتی سازش کے ذریعے اس کا خاتمہ کر دیا۔ پھر خلافت بازیچۂ اطفال بن گئی اور خلفاء کی مدت حکومت (مھما اراد الاتراک) ترکوں کی منشاء و مرضی قرار پائی [۲]۔ اس ترک گردی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت عباسیہ کے مشرقی و مغربی

صوبوں میں متعدد امارتیں قائم ہوگئیں، ان امراء اور عباسی خلفاء کے تعلقات باہمی کی نوعیت نہ صرف یہ کہ سیاسی کشمکش کا باعث ہوئی بلکہ نظریاتی اختلافات کی بھی موجب ہوئی۔ بعض مسلمان سیاسی مفکرین نے خلافت ہی کو مقصود و مطلوب قرار دیا اور بعض نے سلطنت کو ہی حقیقی قوتِ حاکمہ سمجھا۔ مفکرین اسلام کے اس دوسرے طبقہ سے نظام الملک طوسی کا بھی تعلق ہے جس کے سیاسی افکار کا ایک خاکہ ہم سطور ذیل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ابو علی حسن بن علی بن اسحاق طوسی ۴۰۹ھ میں طوس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بیستی کا زمیندار اور جاگیردار تھا۔ اس نے فقہ، حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی تحصیل کی اور اس کے بعد ابو علی بن شاذان حاکم بلخ کا سکریٹری مقرر ہوا۔ مگر ابو علی انعام کے بجائے طوسی پر جرمانے زیادہ کرتا تھا۔ اس لیے وہاں سے بھاگ کر طغرل سلجوقی کے بھائی داؤد چغری بیگ کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اس نے طوسی کو اپنے بیٹے اور سلجوقی ولی عہد سلطان الپ ارسلاں کے سپرد کیا اور کہا کہ حسن طوسی کو مثل باپ کے سمجھنا اور اس کی رائے سے اختلاف نہ کرنا۔ حسن، الپ ارسلاں کی خدمت میں اس کے سکریٹری کی حیثیت سے رہا۔ جب طغرل نے وفات پائی تو متعدد سلجوقی دعوے دار اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسن کی حسنِ تدبیر سے ان مدعیانِ حکومت کے مقابلے میں الپ ارسلاں کو کامیابی ہوئی اور وہ سلطان ہوا۔ حسن کو منصبِ وزارت تفویض ہوا۔ دس سال تک اس نے اس خدمت کو انجام دیا۔ ۴۶۵ھ میں الپ ارسلاں کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا یہاں بھی طوسی کی مساعیٔ جمیلہ سے ملک شاہ کے مخالفین کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں اور اسے سلطنت سلجوقیہ کا حکمراں تسلیم کرلیا گیا۔ طوسی بیس سال تک ملک شاہ کا وزیر اعظم رہا۔ اس نے نہاوند میں ۴۸۵ھ میں ۷۶ سال کی عمر میں ایک باطنی کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا۔ اخیر میں اس کے تعلقات ملک شاہ سے خراب ہوگئے تھے۔ اور ملک شاہ نے اسے اعزہ پروری اور خودسرانہ اختیارات کے استعمال پر ملامت کی تو اس نے قاصد سے کہا کہ ملک شاہ سے جا کر کہہ دو کہ تاج شاہی کی بقاء ہمارے قلمدانِ وزارت کی رہینِ منت ہے اگر وزارت نہ رہے گی تو سلطنت بھی نہ

رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد ہی سلاجقۂ اعظم کا زوال شروع ہوا۔ طوسی کی عظمت صرف اس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد کی سب سے طاقت ور سلطنت کا سب سے بااختیار وزیر اعظم تھا اور اس منصب جلیلہ پر تیس سال تک فائز رہا۔ بلکہ اس کی عظمت کا راز اس کی علماء نوازی، علم دوستی اور ادب پروری میں پنہاں ہے۔ اس کے دابستگانِ دولت میں امام ابو القاسم قشیری، ابو المعالی جوینی ''امام الحرمین'' اور امام غزالی بھی ہیں۔ اس نے مدارس، مساجد و کارواں سرائے تعمیر کیں اور ان پر جائدادیں وقف کیں۔ نیشاپور اور بغداد میں عظیم درسگاہیں قائم کیں جو اس کے نام کے انتساب سے ''نظامیہ'' کہلائیں۔ وزراء کی فہرست میں طوسی جیسا جامع الصفات انسان مشکل ہی سے نظر آئے گا۔[۳]

ملک شاہ نے ۴۸۴ھ میں اپنے دربار کے امراء سے یہ خواہش کی کہ رسوم شاہانِ گزشتہ اور آئین جہاں بانی کو مرتب کر کے پیش کریں تا کہ وہ ہماری مملکت کے رہنما اصول قرار پائیں اور ان پر عمل کر کے فلاح دنیوی اور نجات دینی حاصل ہو۔ ان تمام لوگوں نے ملک شاہ کے حسب الحکم کتابیں تحریر کیں اور خدمت شاہی میں پیش کیں مگر طوسی کی کتاب کو سند قبولیت ملی اور بادشاہ نے اسے اتنا پسند کیا کہ اسے اپنی حکومت کا دستورِ اساسی بنایا۔ اس کا نام ''سیاست نامہ'' قرار پایا۔ یہ کتاب پچاس فصلوں پر مشتمل ہے[۴]۔ اور قدیم فارسی نثر نگاری کا نادر نمونہ شمار کی جاتی ہے۔ اس کی زبان سادہ، صاف اور نہایت دلکش ہے۔ اس نے اصول کے ضمن میں متعدد تاریخی واقعات بطور استشہاد سپرد قلم کیے ہیں اور اس حیثیت سے یہ کتاب ایک اہم تاریخی ماخذ بھی ہے[۵]۔ اس کتاب میں بیان کیے ہوئے مباحث میں سے اہم یہ ہیں:

ا۔ سلطان

(ا) ضرورتِ سلطان : اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں دنیا میں قیام امن و امان اور بقائے نظم و نسق کی غرض سے اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیتا ہے اور یہی سلطان ہے۔ اس کی اطاعت عوام پر واجب ہے۔ اگر لوگ نیکوکار رہتے ہیں تو اللہ ان پر نیک اور عادل سلطان

مقرر کرتا ہے اور اگر لوگ برے ہوتے ہیں تو ان پر ظالم وسفاک بادشاہ مسلط کر دیا جاتا ہے۔
اگر ایسا نہ ہو تو فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جائے اور لوگوں کی زندگی دشوار ہو جائے۔[۶]

(۲) اوصاف سلطان: نظام الملک نے سلطان کے اوصاف کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جو درج ذیل ہے:

۱۔ سلطان کو عادل ہونا چاہیے۔ کیونکہ ملک کی بقاء کا انحصار ہی عدل پر ہے۔ کفر کے ساتھ تو ملک باقی رہتا ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتا (الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم)[۷]

۲۔ سلطان کو شجاع بھی ہونا چاہیئے تا کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کر سکے۔

۳۔ نہ صرف یہ کہ سلطان امور مذہبی کا پیرو ہو بلکہ راسخ العقیدہ اور قوی الایمان بھی ہو۔ وہ یہی نہیں کہ احکام شرعیہ کا پابند ہو بلکہ شعائر اسلامیہ کا احیاء بھی کرنے والا ہو۔

۴۔ سلطان کو سخی بھی ہونا چاہیئے تا کہ اس کی داد و دہش سے علماء اور فضلاء بہرہ اندوز ہوں۔

۵۔ حسن صورت بھی سلطان کے لیے ضروری ہے۔

۶۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہنا بھی سلطان کے لیے ضروری ہے۔

۷۔ سلطان کو زیور علم سے بھی آراستہ ہونا چاہیئے۔ علماء اور فضلاء کی ہم نشینی اور ان سے علمی مسائل پر اسے گفتگو بھی کرنی چاہیئے۔

۸۔ سلطان کو قوت حافظہ اور ذکاوت و ذہانت میں بھی ممتاز ہونا چاہیئے تا کہ اس میں معاملوں کی تہہ تک پہنچنے، انہیں یاد رکھنے اور صحیح فیصلہ صادر کرنے کی صلاحیت آئے۔[۸]

(۳) فرائض سلطان: فرائض سلطانی میں سے اہم فرائض جن کی نشاندہی طوسی نے کی ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حمایت دین اور دشمنوں کے حملوں سے اس کی صیانت۔[۹]

۲۔ قیام عدل وانصاف۔[۱۰]

۳۔ مردانِ کار کا انتخاب اور ان سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لینا۔[۱۱]

۴۔ عمال وولاۃ کو تاکید کرنا کہ وہ عوام کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔[۱۲]

۵۔ محاصل کی وصولیابی میں یہ احتیاط رکھے کہ ناجائز طریقے استعمال نہ کیے جائیں۔ اور صرف وہی محصول لیے جائیں جو ازروئے قانون واجب الاداء ہیں۔[۱۳]

۶۔ عمال کا نہایت شدت سے محاسبہ کرنا اور انہیں ظلم و زیادتی کی اجازت نہ دینا۔[۱۴]

(۴) اختیاراتِ سلطان: طوسی نے سلطان کے اختیارات یہ بتائے ہیں:

ا۔ وہ اپنی صواب دید سے احکامات جاری کرے۔ اور اجراء سے پہلے ان کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرے اور اگر ضرورت ہو تو اہل الرائے سے مشورہ بھی کرے۔

۲۔ مگر جب یہ احکام جاری کر دیئے جائیں تو ان پر سختی سے عمل کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں سے کسی حالت میں بھی درگزر نہ کیا جائے۔

۳۔ اگر کوئی احکام سلطانی کی عیب گیری کرے یا ان کی توہین کرے تو اسے سخت سزا دی جائے۔[۱۵]

۴۔ گو سلطان کے اختیارات وسیع ہیں مگر قرآن، حدیث و فقہ کے علاوہ ارباب عقل و عمل سے بھی اسے مشورہ کرنا چاہئے۔[۱۶]

۵۔ عوام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ سلطان کے اختیارات پر رائے زنی یا ان سے اختلاف کریں۔[۱۷]

(۵) ملازمینِ سلطان: سلطان خواہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو لیکن اس کے ملازمین اگر نالائق ہوں تو حکومت کے کام ابتر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر عمال حکومت لائق ہوں تو سلطان کی نالائقی سے بھی چنداں نقصان نہیں پہنچتا۔ لائق عہدہ داروں کے انتخاب کے اصول مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ سلطان اپنے اعزہ میں سے کسی کو اعلیٰ عہدہ پر فائز نہ کرے کہ بصورت دیگر ان کے بغاوت کرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۲۔ کسی ایک شخص کو ایک سے زائد عہدہ پر فائز نہ کیا جائے۔ اس سے سرکشی کی روک تھام ہوتی ہے۔

۳۔ کفار اور ملاحدہ میں سے کسی کو کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ کیونکہ ان کے دلوں میں عوام کے لیے رحمدلی کا جذبہ نہیں ہوسکتا۔[۱۸]

۴۔ سلطان اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنا مصاحب نہ بنائے کیونکہ اس سے ان کے دلوں سے اس کا ڈر نکل جائے گا۔[۱۹]

نظریۂ سلطان پر تنقید:

طوسی کے ان نظریات کا جن کا تعلق سلطان سے ہے، ایک اجمالی جائزہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مثالی حکمراں ایک مطلق العنان سلطان ہے۔ اس کی حکومت ایک آمر کا خواب ہے اور اس حکومت میں عوام کی حیثیت ایک بے دست و پا تماشائی کی ہے۔ انہیں کاروبارِ مملکت میں دخل انداز ہونے کا حق نہیں۔ سلطان کی اطاعت کرنا، اس کے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کرنا اور اس کے احکام کی بجا آوری اُن کے فرائض کا جزو ہیں۔ انہیں اس کے عزل و نصب کا کوئی اختیار نہیں۔ اس کی نافرمانی نہ صرف دنیا میں محرومی کا باعث ہے بلکہ آخرت میں بھی خسران کا سبب ہے۔ اس کے احکام سے انحراف حکم الٰہی سے انحراف کے مترادف ہے۔ اسی طرح انہیں اس کی شکایت کا بھی حق نہیں پہنچتا کیونکہ ظالم سلطان کا تسلط خود ان کے اپنے اعمالِ سیئہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سلطان اور اس کے عمال پر عوام کو کسی قسم کی دست رس حاصل نہیں ہے مگر ان لوگوں کو عوام پر ہر قسم کی دست رس حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلطان پر عدل و انصاف کی پابندی، احکام شرعیہ کی بجا آوری اور محاصل کی جائز وصولیابی کی شرائط عائد کر کے اس آمریت میں یک گونہ اعتدال قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب۔ وزیر

نظام الملک نے وزارت کو نہایت خطرناک عہدہ بتایا ہے۔ اور دستور الوزراء میں نہایت تفصیل سے ان خطرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس نے وزیر کو مشورہ دیا ہے کہ اسے روزانہ کے کاموں کی انجام دہی میں بڑا محتاط رویہ رکھنا چاہئے۔ اسے اس بات کا بھی خیال

رکھنا چاہئے کہ کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ لوگ بلا کسی دقت کے اس کے پاس عرض مطلب کے لیے آ سکیں۔

(۱) وزارت کے خطرات: وزارت کے خطرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وزیر کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس سے ظلم سرزد ہو۔[۲۰]

۲۔ معاملات کے تصفیہ اور مقدمات کے فیصلہ میں اکثر امراء وزیر سے ناراض ہو جاتے ہیں، ان کے شر سے محفوظ رہنا وزیر کے لیے بڑا مشکل کام ہے۔[۲۱]

۳۔ وزیر ہر وقت بادشاہ کے سامنے حاضر رہتا ہے اگر اس سے ذرا سی بے احتیاطی بھی ہو جائے تو اس کی جانفشانیوں پر پانی پھر جائے۔[۲۲]

(۲) وزیر کے اوصاف: وزیر کے اوصاف درج ذیل ہیں:

۱۔ صفت عقل و فہم سے متصف ہو۔

۲۔ بلند کردار ہو اور اس میں خلوص و صداقت ہو۔[۲۳]

۳۔ اسے تاریخ کا عالم ہونا چاہئے کیونکہ اس سے واقعات کے علل و اسباب کا اسے علم ہوگا اور اگر وہ اقوام گزشتہ کی غلطیوں پر نظر رکھے گا تو اس سے وہ غلطیاں سرزد نہ ہوں گی۔[۲۴]

(۳) وزیر کے فرائض: وزیر کے فرائض میں سے اہم فریضے یہ ہیں[۲۵]

۱۔ حفاظت دین

۲۔ اطاعتِ الٰہی کے بعد اطاعتِ سلطان۔

۳۔ عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا۔

۴۔ سلطان کے دوستوں کی دل جوئی کرنا۔

۵۔ اصحاب سیف کی خاطر ملحوظ رکھنا کہ ان کے بغیر حکومت پائدار نہیں ہو سکتی۔[۲۶]

۶۔ ارباب قلم کی ہمت افزائی کہ ان کے بدون وزیر کی کامیابی مشتبہ ہے۔[۲۷]

(۴) وزیر کے اختیارات:[۲۸]

۱۔ ہر چھوٹے اور بڑے معاملہ میں سلطان کو چاہئے کہ وزیر سے مشورہ کرے اور اس

کی رائے پر عمل کرے۔

۲۔ وزیر حکومت میں یک گونہ سلطان کا سہیم و شریک ہوتا ہے۔

۳۔ سلطان کے اختیارات وزیر آزادانہ استعمال کرتا ہے۔

نظریۂ وزارت پر تنقید:

وزارت سے متعلق طوسی کے نظریات نظری سے زیادہ عملی ہیں اس نے تیس سال تک اس فریضہ کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ وزارت کے خطرات اور وزیر کے فرائض کی نشاندہی کرتے وقت اس نے بیشتر اپنے تجربات کو مشعل راہ بنایا ہے۔ اس نے انہیں کی روشنی میں چند اصول موضوع متعین کیے ہیں جو ایک مطلق العنان سلطان کے وزیر کے لئے لازمی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصول کی روشنی میں ہمیں طوسی ایک ایسا مدبر نظر آتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کا عظیم مدبر تھا بلکہ ہر دور کا ایک لائق اور تجربہ کار مدبر ہے اور اس کے تجربے ہر اس شخص کے لیے رہنما ہیں جو خارزارِ وزارت سے گزرنا چاہے۔

ج۔ سلطان کا ذاتی عملہ

ا۔ دربار: دربار شاہی کے جشنوں اور شان و شوکت کو قائم رکھنے پر طوسی بہت زور دیتا ہے۔ وہ سلطان کو مشورہ دیتا ہے کہ دربار میں لائق لوگوں کو جگہ ملے اور مسخروں اور بھانڈوں کو دربار میں بار نہ ملے۔ دربار عام کے بارے میں اس کی یہ رائے ہے کہ اس میں اول خاندان شاہی کے افراد کو، پھر ارکان سلطنت اور سرداران عسکر کو حسب منصب جگہ دی جائے۔ جب دربار کا آغاز ہو جائے تو پھر اذنِ عام ہو اور کسی شخص کو اندر آنے سے نہ روکا جائے۔ دربار عام اکثر منعقد ہونے چاہئیں کیونکہ ان کے عدم انعقاد سے کاروبار سلطنت میں خلل واقع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ دربار عام میں عوام و خواص کی باریابی کے دن الگ الگ ہونے چاہئیں تاکہ یہ لوگ باہم خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ دربار خاص کے متعلق طوسی کا یہ خیال ہے کہ اس میں صرف خاصانِ سلطانی شریک کیے جائیں۔ آلات بادہ و جام خود سرکار سلطانی سے فراہم کیے جائیں اور اس محفل میں صرف ندماء شریک ہوں۔ غلاموں،

عاملوں اور سرداران فوج کو شرکت کی اجازت نہ دی جائے۔ دربارِ خاص میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھا جائے۔[۲۹]

۲۔ وکیل خاص: جس امیر کے سپرد دربار شاہی کے انعقاد کے انتظامات، مطبخ سلطانی، اصطبل، محل سرائے اور شاہزادوں کی نگرانی کے امور ہیں اسے وکیل خاص کہتے ہیں۔ یہ عہدہ نہایت اہم ہے اور اس پر صرف اعتماد کے آدمیوں کو مقرر کرنا چاہیۓ اور اس کی عزت و احترام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیۓ۔ وکیل خاص کا یہ فرض ہے کہ ہر روز دربار میں حاضر ہو کر سلطان کو تمام امور کی اطلاع دے۔[۳۰]

۳۔ ندیم و مصاحب: عمال کو ندیم و مصاحب کی خدمات نہ تفویض کی جائیں کیونکہ یہ لوگ سلطان سے بے تکلف ہوتے ہیں اور اگر عمال بے تکلف ہو گئے تو حکومت کے فرائض کی انجام دہی میں کوشش نہ کریں گے۔ اسی طرح مصاحب وندیم کو سرکاری عہدے نہ دیئے جائیں کیونکہ یہ لوگ بے خوف ۔ خط خلق اللہ کو ستائیں گے اور جبر و تشدد کا ارتکاب کریں گے[۳۱]۔ ندیموں کی بذلہ سنجیوں سے صرف اسی حد تک سروکار رکھنا چاہیۓ کہ امور ملکی کے انصرام میں کسی قسم کا خلل نہ واقع ہو۔ ندیم کو شریف، فاضل اور سیر و تاریخ سے آگاہ ہونا چاہیۓ۔ اس کا فرض ہے کہ محفل عیش و طرب اور شکار و چوگاں بازی کے انتظامات کرے۔ ندیموں میں ایسے افراد کو بھی شامل کرنا چاہیۓ جو کہن سال، منجم، طبیب اور عامل ہوں ان میں جذبۂ جاں نثاری ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اگر کبھی سلطان کی جان کو خطرہ ہو تو یہ لوگ اس کی حفاظت کر سکیں۔[۳۲]

۴۔ خدمت گار اور غلام: تربیت و تعلیم کے لحاظ سے غلاموں کے منصب میں بتدریج اضافہ ہونا چاہیۓ۔ اگر ان سے غلطی سرزد ہو تو اس پر معمولی فہمائش کافی ہونی چاہیۓ[۳۳] وفادار غلام بیٹوں سے بہتر ہوتے ہیں[۳۴]۔ حکم شاہی کے بغیر غلاموں کو کسی سفر پر نہ بھیجا جائے۔ کیونکہ ایسا اکثر ہوا ہے کہ غلاموں نے حالت سفر میں رعایا پر مظالم کیے ہیں۔[۳۵]

۵۔ امیر حرس: ''امیر حرس'' کا عہدہ بہت اہم ہوتا ہے۔ امراء اس کی سیاست سے

خائف رہتے ہیں۔ وہ صاحب نقارہ ونشان ہوتا ہے۔ اس کا تعلق اجرائے حدود سے ہوتا ہے اور جب سلطان کسی کو قتل، قید یا کوئی دوسری سزا دینے کا قصد کرتا ہے تو ان سے متعلق احکام کی تعمیل امیر حرس ہی کرتا ہے۔[۳۶]

۶۔ چوب دار: کم از کم پچاس چوبداروں کو بارگاہ سلطانی میں ہر وقت حاضر رہنا چاہئے جن میں سے بیس چوبداروں کے عصا نقرئی، بیس کے عصا طلائی اور دس کے عصا بہت شاندار ہوں۔[۳۷]

د۔ نظارت

طوسی کے نزدیک اس محکمہ کا کام یہ ہے کہ سلطان کو امور دربار سے واقف رکھے اور ملک کے گوشے گوشے کی خبریں اس تک پہنچائے۔ اس محکمہ کے عہدہ دار حسب ذیل ہیں:

ا۔ ناظر و مشرف: اس عہدہ پر اعتماد کے لوگ مقرر کیے جائیں۔ تاکہ وہ دربار کے واقعات حسب موقع ومحل سلطان سے بیان کریں۔ ان کو یہ اختیار بھی ہونا چاہئے کہ اطراف وجوانب میں اپنے نائب خود مقرر کر کے بھیجیں۔ مگر یہ نائب صاحب رائے وتدبیر اور متدین افراد ہوں۔ ان کی تنخواہیں وقت مقررہ پر پابندی کے ساتھ خزانۂ شاہی سے ادا کی جائیں تاکہ عوام پر ان کا بار نہ پڑے[۳۸]۔ ناظر کو پاسبانوں، دربانوں اور نوبت نوازوں کی کڑی نگرانی کرنی چاہئے تاکہ ان میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہو جائے جس کا تعلق ملازمان سلطان سے نہ ہو اور رات کی ڈیوٹی پر جو پاسبان، دربان یا نوبت نواز ہوں ان کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر لینی چاہئے کہ ان میں کوئی غیر شخص تو شامل نہیں ہو گیا ہے۔[۳۹]

ہ۔ جاسوسی

جاسوسوں، وقائع نگاروں اور ہرکاروں کے تقرر پر نظام الملک بہت زور دیتا ہے۔ کامیاب حکمراں کے لیے ملک کے چپے چپے سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ ملک میں کسی قسم کی بدنظمی پیدا نہ ہونے پائے اور بغاوت کا شروع ہی سے قلع قمع کر دیا جائے۔

۱۔ جاسوس: طوسی نے یہ تجویز کیا ہے کہ تاجروں، سیاحوں، صوفیوں اور دوا فروشوں کے بھیس میں جاسوس تمام ممالک محروسہ و نیز ہمسایہ ممالک میں پھرتے رہیں اور سلطان کو وہاں کے حالات سے باخبر کرتے رہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہر محکمہ اور ہر بااختیار حاکم کے لیے ایک جاسوس مقرر کیا جائے جس کی اطلاع اس محکمہ یا حاکم کو کسی صورت سے نہ ہو اور یہ جاسوس اس کے حالات سے سلطان کو آگاہ کرتا رہے۔[۴۰]

۲۔ وقائع نگار: رعایا اور فوج کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے سلطان کو چاہئے کہ وقائع نگار اور پرچہ نویس بھی مقرر کرے۔ ان لوگوں کا تقرر حکمراں کی بیدار مغزی کی دلیل اور ملک کی خوش حالی و امن و امان کا باعث ہے۔[۴۱]

۳۔ ہرکارہ اور نامہ بر کبوتر: اہم مقامات پر ہرکارے بھی رکھے جائیں۔ یہ لوگ شب و روز میں پچاس میل کا دھاوا کریں اور سلطان کو خبریں پہنچائیں۔ تیز رو نامہ بری کے لیے خاص خاص مقامات پر نامہ بر کبوتر بھی رکھے جائیں۔[۴۲]

و۔ سفارت

سفارت کے متعلق طوسی کے نظریات دور جدید کے نظریات سے ہم آہنگ ہیں اس کے خیال میں سفیروں کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ اپنی حکومت کا پیغام دوسری حکومت تک پہنچادیں، بلکہ جہاں متعین ہوں اس ملک کے تمام جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی اور انتظامی امور سے متعلق معلومات بھی حاصل کریں۔ اس ملک کی شاہراہوں، دروں اور دریاؤں کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائیں اور ان کے فوجی افسروں کے استعمال کے امکانات کا بھی جائزہ لیں۔ سفیر کو اس ملک کے سلطان، وزیر اور دیگر امراء کے بارے میں بھی علم ہونا چاہئے۔ اس ملک کی فوجی طاقت، اضلاع کی آبادی اور بوقت جنگ کام آنے والی دوسری عام اطلاعوں کا بھی اسے پتا لگانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ طوسی سفیروں کے احترام، آرام اور ان کی عزت کرنے کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ خواہ سفراء ایام جنگ ہی میں کیوں نہ آئیں۔[۴۳]

ز۔ محکمۂ مذہبی

طوسی محکمہ مذہبی کے قیام کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ جس میں خطیب، محتسب اور ان کے ماتحت عملہ کے لوگ شامل ہیں۔

۱۔ خطیب: ہر جامع مسجد میں خطیب مقرر کیا جائے۔ یہ خطیب زہد و علم کے معیار پر پورے اتریں۔ کیونکہ مقتدیوں کی نمازوں کا اماموں کے ورع و علم سے گہرا تعلق ہے۔ اگر امام و خطیب کی اخلاقی حالت بہتر نہ ہو تو اس کی اقتداء کرنے والوں پر بھی اس کا برا اثر پڑے گا۔[۴۴]

۲۔ محتسب: ہر شہر میں محتسب مقرر کیا جائے۔ یہ لوگ بازار کے نرخ، ان کی جانچ اور لین دین کی نگرانی کریں۔ محتسب یہ بھی دیکھیں کہ اشیاء خوردنی میں آمیزش نہ کی جائے۔ اسے مجمع یا بازاروں میں مناہی شرعیہ کا ارتکاب کرنے والوں پر بھی سختی کرنی چاہئے۔ محتسب کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ لوگ جانوروں پر زیادہ بوجھ نہ لادیں اور کشتی پر مقررہ تعداد سے زیادہ افراد نہ سوار ہوں۔ اسے مخدوش عمارتوں کے انہدام کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔ نانبائیوں کی دکانوں پر فروخت ہونے والی روٹیوں کے صحیح وزن کی جانچ پڑتال بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ طلبہ پر معلمین کی ناروا سختی کی روک تھام بھی اسے کرنی چاہئے۔ محتسب کے فرائض کے پیش نظر طوسی اس کے اختیارات میں اضافہ کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ اس کی رائے میں اس منصب پر بادشاہ کے کسی بوڑھے معتمد علیہ خادم کو مقرر کرنا چاہئے تا کہ اسے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دشواری نہ پیش آئے اور لوگ اس کے احکام پر بے چون و چرا عمل کریں۔ محتسب کو چاہئے کہ ہر روز شہر کی جامع مسجد میں اجلاس کرے اور اپنے نائبوں کی رپورٹوں کو سن کر ان پر فیصلے دے۔[۴۵]

ح۔ محکمۂ قضاء

آئین مملکت کے بارے میں طوسی کے نظریات نہایت واضح ہیں۔ وہ احکام شرعیہ کی سختی سے پابندی کو ضروری خیال کرتا ہے۔ وہ صرف انہیں مسائل میں سربراہ کو آئین سازی کا حق دیتا ہے جن میں شرع خاموش ہے اور سلطان تشریع کے بعد ان کا اجراء ماہرین

کے مشورے کے بغیر نہ کرے۔ طوسی سلطان کو یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ وہ فقہاء کو اپنا ہم نشین بنائے اور انہیں ضروریات زندگی کی فراہمی کی جانب سے بے فکر کردے تاکہ وہ سکون قلب اور اطمینان خاطر کے ساتھ امور تشریعیہ کی جانب توجہ دے سکیں۔ قاضی کے فرائض کے پیش نظر طوسی یہ مشورہ دیتا ہے کہ ان کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جائے۔ اور صرف ایسے لوگ مقرر کیے جائیں جو متقی، متدین اور باکردار ہوں۔ فصلِ خصومات میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے تاکہ کسی قسم کی غلطی نہ سرزد ہو۔ کسی شخص کے ساتھ زیادتی یا اس کی حق تلفی نہ ہونی چاہیے۔ ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اہل معاملہ کو اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کا حق ہونا چاہیے۔ طوسی کا کہنا ہے کہ کبھی وقت کی کمی کے باعث، کبھی رشوت کے سبب اور کبھی جنبہ داری کی وجہ سے فصلِ خصومات میں انصاف نہیں ہو پاتا۔ اس لیے حقِ اپیل دیا جانا ضروری ہے۔ چونکہ طوسی ایک شخص کو ایک سے زیادہ عہدہ دینے کے خلاف ہے اس لیے گمان ہوتا ہے کہ وہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھنا چاہتا ہے، مگر اس کو اس بات کا بھی علم ہے کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے تعاون کی شدید ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان دونوں محکموں میں وہ ربط و تعاون قائم رکھنے پر بھی زور دیتا ہے۔ وہ سلطان کو یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ اگر انتظامیہ کا کوئی عہدہ دار عدلیہ کی توہین کرے یا اس کا حکم نہ مانے تو اسے سخت ترین سزائیں دی جائیں۔ وہ قاضیوں کو رشوت اور بدعنوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ان کی تنخواہیں ان کے منصب اور عہدے کے مطابق مقرر کی جائیں تاکہ ان کو رشوت سے محفوظ رکھا جاسکے۔ [۴۶]

ط۔ محکمۂ مال

ٹیکس کے متعلق طوسی کا یہ خیال ہے کہ اس کا بار عوام پر بہت کم پڑنا چاہیے۔ اس کی شرح متعین ہونی چاہیے تاکہ زیادہ وصول نہ کیا جاسکے۔ ٹیکس کے نفاذ میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ کسی قسم کا غیر شرعی ٹیکس نہ عائد کیا جائے۔ محصلین اور متاجرین پر کڑی نگاہ رکھی جائے تاکہ وہ کسانوں اور محصول ادا کرنے والوں پر ظلم نہ کرسکیں۔ ان کے

خلاف شکایت کرنے والوں کی باتیں سلطان کو بڑی پابندی سے سننی چاہیئے۔ اور اگر محکمۂ مال کے عمال عوام کی بہبود اور خیر خواہی کے خلاف کوئی کام کریں تو انہیں برطرف کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ ان عمال کو تین سال سے زیادہ عرصہ تک ایک مقام پر نہ رہنے دیا جائے۔ محاصل کی وصولیابی میں اصول وقوانین کی پابندی کرنی چاہیئے اور انصاف سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ آمدنی کی کمی بیشی کی صورت میں عمال سے باز پرس کی جائے۔ [۴۷]

آمد و خرچ کے حسابات کے سلسلہ میں طوسی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ملک کی تمام آمدنی اور اخراجات کو باقاعدگی کے ساتھ قلمبند کیا جائے۔ خرچ کی رقوم کو بغور دیکھا جائے اور جو رقم خلاف ضابطہ ہو اُسے قلم زد کر دیا جائے اور اس کی مجرائی نہ دی جائے [۴۸]۔ خزانہ دو قسم کا ہونا چاہیئے۔ ایک خزانۂ اصلی یعنی دوامی اور دوسرا خزانۂ خرچ۔ ملک کا خراج اور دیگر آمدنیاں زیادہ تر خزانۂ دوامی میں جمع کی جائیں اور کمتر خزانۂ خرچ میں اور اگر اس میں سے کچھ لیا جائے تو اسے جلد ہی واپس کر دیا جائے اور جن رقوم کو جن مداتِ خرچ کے لیے مختص کر دیا گیا ہے انہیں ان کے علاوہ کسی اور مد میں صرف نہ کیا جائے۔ [۴۹]

ی۔ محکمۂ فوج

فوج کے بغیر نظام حکومت ناممکن ہے۔ مگر اہل فوج کی بغاوتوں کے سدباب کی یہ صورت ہے کہ مختلف رنگ ونسل کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ بغاوت کا خطرہ باقی نہ رہے گا بلکہ اس سے اس کی کارکردگی پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ اہل فوج کی تنخواہیں بھی معقول ہونی چاہئیں اور ان کی ادائیگی بھی وقت مقررہ پر ہونی چاہیئے تاکہ فوج میں بے اطمینانی نہ پھیلنے پائے [۵۰]۔ طوسی عام فوج کے علاوہ فوج خاصہ اور شاہی باڈی گارڈ کے قیام کا بھی مشورہ دیتا ہے۔ اس کی رائے میں باڈی گارڈ کو ہر وقت سلطان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ان کے لباس مرصع، ان کے جسم تنومند اور ان کے قد بلند ہوں تاکہ ان کی وجہ سے کوکبہ سلطانی کا رعب قائم ہو [۵۱]۔ فوجیوں کو جو تنخواہ دی جائے وہ نقد ہو۔ اور ان کی تقسیم خود سلطان کرے۔ خزانے سے یک مشت رقم تنخواہ کی مد میں

جاگیرداروں یا سرداروں کو نہ دی جائے۔ اس سے سپاہیوں کے دل میں سلطان کی محبت پیدا ہوگی فوج کی تنخواہ ماہانہ یا سالانہ کے بجائے سہ ماہی اداء کی جائے [۵۲]۔ سلطان کے جاگیردار بھی بوقت ضروری اپنی اپنی فوجیں لے کر لشکر شاہی میں شامل ہوں۔ [۵۳]

قولِ فیصل

نظام الملک طوسی کے سیاسی افکار کے چند نقوش سطور بالا میں پیش کیے گئے۔ اس کے سامنے اس عہد کے سیاسی نظریے کے دو مدرسۂ فکر تھے۔ ایک اسلامی اور دوسرا ایرانی۔ اسلامی مدرسۂ فکر جس کے نمائندہ کی حیثیت سے ماوردی نے بڑا نام پایا۔ خلافت کو جائز طرز حکومت سمجھتا ہے اور سلطنت کو اس کے کارکن کی حیثیت سے قبول کرتا ہے [۵۴] اس کے برعکس ایرانی نظریۂ اقتدار اعلیٰ کو خلافت سے کوئی سروکار نہیں وہاں سلطان کی حیثیت ایک مستقل بالذات حکمراں کی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظریۂ فکر کی رو سے خلافت ایک ایسی حکومت ہے جس کی اساس مذہب پر ہے مگر ایرانی نظریۂ حکومت میں مذہب کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ خلافت اور مذہب دو چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں مگر سلطنت و مذہب دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ طوسی نے ان دونوں نظریات میں یک گونہ امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایرانی طرز فکر کی اتباع میں سلطنت کو مذہب کا جزو نہیں تسلیم کرتا۔ مگر اسلامی طرز فکر کی رعایت سے سلطنت کے ممد و معاون کی حیثیت سے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ خالص ترک ایرانی ہے۔ اسے ''جدید ساسانی'' کہنا زیادہ مناسب ہے اس کے مطابق اگرچہ سلاطین کا عزل و نصب مشیت الٰہی سے ہوتا ہے اور بندوں کے اچھے یا برے اعمال اس پر اثر انداز ہوتے ہیں مگر خود بندوں کو ان حکمرانوں کے عزل و نصب کا اختیار نہیں ہے۔ اس طور سے اس نظام میں بندے خاموش تماشائی سے زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نظریۂ خلافت میں خلیفہ اللہ اور عوام دونوں ہی کے سامنے جواب دہ ہے اور بصورت نااہلی اسے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔ طوسی کے خیال میں طاقت کا اصل سرچشمہ سلطان ہے دوسرے ملازمین اس

کے عطاء کردہ اختیارات کو اپنے حدود میں رہ کر استعمال کرتے ہیں۔ سلطان کا یہ فرض ہے کہ وہ نظام عمرانی کو عدل و انصاف کے ساتھ قائم رکھے اور اس میں خلل نہ واقع ہونے دے۔ وہ جس حدتک اس کوشش میں کامیاب ہوگا اسی قدر اسے کامیاب حکمراں سمجھا جائے گا۔ یہ نظریۂ سلطانی دراصل ایرانی افکار کا رہین منت ہے اسی لیے طوسی اس نظریہ کی وضاحت کی غرض سے جتنی مثالیں پیش کرتا ہے وہ بھی عموماً ساسانیوں یا ان کے مقلد خانوادہ ہائے حکومت سے متعلق ہوتی ہیں۔[۵۵]

خلافت عباسیہ کے انحطاط اور مشرق میں خودمختار امارتوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس عہد کے مفکرین نے امارت وسلطنت کے مابین یہ نظریاتی ہم آہنگی پیدا کی کہ استحقاق حکومت صرف خلیفہ کو حاصل ہے اور خلافت ہی صحیح طرزِ حکومت ہے۔ امارت و سلطنت کا حقِ حکمرانی اسی وقت قابلِ قبول ہوگا جب وہ خلافت کو اپنا بالا دست ادارہ تسلیم کرے اور خلیفہ اس کی حکومت پر مہر جواز ثبت کردے[۵٦]۔ مگر طوسی نے اپنے افکار سیاسی میں خلیفہ کی کوئی واضح حیثیت متعین نہیں کی ہے۔ اس نے دینی اور دنیوی دونوں ہی امور کو فریضۂ سلطانی شمار کیا ہے۔ اس طور سے اس نے اقتدار حکومت میں اس مفاہمت کو قبول نہیں کیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وجوب خلافت کے جو دلائل ماوردی نے پیش کیے ہیں بعینہ طوسی نے وہی دلائل وجوب سلطانی کے حق میں قلمبند کیے ہیں[۵۷]۔ اسی طرح جن امور مذہبی کی انجام دہی غزالی نے خلیفہ کے فرائض میں محسوب کی ہیں انہیں طوسی سلطان کی ذمہ داریوں میں گنتا ہے۔[۵۸]

سیاست نامہ کا دوسرا نام سیر الملوک ہے جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے یہ کتاب سیاست نظری سے زیادہ سیاست عملی سے تعلق رکھتی ہے۔ تصنیف کتاب کا منشاء بھی سلطنت سلجوقیہ کے لیے ایک ضابطہ حکومت وضع کرنا ہے۔ طوسی کا تعلق مفکرین کے بجائے منتظمین کے گروہ سے ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ طوسی کی کتاب نظم مملکت سے متعلق ہے اور اس کا موضوع انتظام حکومت کے واضح اور صحیح خطوط کی تعیین ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اس کی کتاب میں اس کے افکار سیاسیہ مربوط اور یکجا نہیں ملتے۔ بلکہ بے ربط اور بکھرے ہوئے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت، اس کے سلطنت سے تعلقات اور حکومت سے متعلق اسلامی نظریات سے بھی براہ راست کوئی بحث نہیں کرتا۔ اس لیے ہم بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ طوسی مفکر سے زیادہ منتظم حکومت ہے۔ اور اس حیثیت سے اسے اور اس کی کتاب کو ہر دور میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ وہ اپنے بیانات کی تائید میں جو مثالیں پیش کرتا ہے وہ عموماً تاریخی ہیں اس لیے اس کے اندازِ بیان کو تاریخی کہا جا سکتا ہے۔

بہر کیف جس طرح نظام الملک کو مربیٔ اہل علم اور مروج تعلیم ہونے کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کی علمی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے، جس طرح اپنے عہد کی سب سے بڑی اور طاقت ور سلطنت کے سب سے طاقت ور وزیر کی حیثیت سے اسے نمایاں مقام حاصل ہے اور جس طرح ایک ماہر انشاء پرداز ہونے کے باعث اسے فارسی ادب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اسی طرح اسے نہ صرف اپنے عہد کا بلکہ ہر عہد کا عظیم منتظم اور دبیر کامل ہونے کا بھی شرف حاصل ہے اور اس کتاب کی حیثیت ایک ایسے ضابطۂ حکومت کی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہر دور میں ایک کامیاب اور منظم مرکزی نظام حکومت قائم کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

[۱] ابن اثیر، الکامل، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۳۸۷ھ، ج ۴، ص ۲۹۹ و بعد ۳۲۳ و بعد، حسن ابراہیم حسن، تاریخ الاسلام السیاسی، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت ۶۵۔ ۱۹۶۴ء، ج ۳، ص ۱۴ و بعد۔

[۲] ابن اثیر، ج ۵، ص ۳۰۱ تا ۳۰۴، ابن طقطقیٰ، الفخری، مطبوعہ رحمانیہ، مصر ۱۹۲۷ء، ص ۱۸۱، تاریخ الاسلام السیاسی، ج ۳، ص ۴ و بعد، آر۔ اے نکلسن، تاریخ ادبیات عرب (انگریزی) مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۵۳ء، ص ۲۶۳۔

[۳] ابن الجوزی۔ المنتظم، مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد (دکن) ۱۳۵۹ھ، ج ۹، ص ۶۴-۶۸۔

[۴] طوسی۔ سیاست نامہ۔ مطبوعہ رام نرائن پریس۔ الہ آباد ۱۹۳۱ء، ص ۱-۶۔

[۵] ای۔ جی براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۵۱ء، ج ۲، ص ۲۱۳۔

[۶] سیاست نامہ، ص ۳۔

[۷] سیاست نامہ، ص ۶ و ۷۔

[۸] ایضاً، ص ۴ و ۵۔

[۹] ایضاً، ص ۵۲ و ۵۳۔

[۱۰] ایضاً، ص ۷۔

[۱۱] ایضاً، ص ۳ و ۴۔

[۱۲] سیاست نامہ، ص ۱۵۔

[۱۳] سیاست نامہ، ص ۲۶۔

[۱۴] سیاست نامہ، ص ۱۵۔

[۱۵] ایضاً، ص ۶۴۔

[۱۶] ایضاً، ص ۵۳۔

[۱۷] ایضاً، ص ۳ و ۴۔

[۱۸] ایضاً، ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔

[۱۹] ایضاً، ص ۸۱۔

[۲۰] دستور الوزراء بحوالہ ''نظام الملک طوسیؒ عبدالرزاق کانپوری۔ مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۹۱۲ء، ص ۳۴۰۔

[۲۱] ایضاً، ص ۳۴۲ و ۳۴۷۔

[۲۲] ایضاً، ص ۳۵۵۔

[۲۳] سیاست نامہ، ص ۱۶۔

[۲۴] دستوالوزراء، ص ۳۸۵۔

[۲۵] ایضاً، ص ۳۶۳۔

[۲۶] دستورالوزراء، ص ۴۰۷۔

[۲۷] دستورالوزراء، ص ۴۱۱۔

[۲۸] سیاست نامہ، ص ۱۶ و ۱۷۔

[۲۹] سیاست نامہ، ص ۱۰۹۔

[۳۰] سیاست نامہ، ص ۸۱۔

[۳۱] سیاست نامہ، ص ۸۱۔

[۳۲] ایضاً، ص ۸۲ و ۸۳۔

[۳۳] ایضاً، ص ۹۵۔

[۳۴] ایضاً، ص ۱۰۸۔

[۳۵] ایضاً، ص ۶۶۔

[۳۶] ایضاً، ص ۱۲۲۔

[۳۷] ایضاً، ص ۱۲۲۔

[۳۸] ایضاً، ص ۵۵۔

[۳۹] ص ۱۱۵۔

[۴۰] سیاست نامہ، ص ۶۷۔ [۴۱] ایضاً، ص ۵۶۔

[۴۲] ایضاً، ص ۸۰۔ [۴۳] ایضاً، ص ۸۷ و ۸۸۔

[۴۴] ایضاً، ص ۳۸۔ [۴۵] سیاست نامہ، ص ۳۹ و ۴۰۔

[۴۶] ایضاً، ص ۳۶ و ۳۸۔ [۴۷] ایضاً، ص ۲۶۔

[۴۸] سیاست نامہ، ص ۲۱۰ و ۲۱۱۔ [۴۹] ایضاً، ص ۲۰۶ و ۲۰۷۔

[۵۰] ایضاً، ص ۹۱ و ۹۲۔ [۵۱] ایضاً، ص ۸۵۔

[۵۲] ایضاً، ص ۹۱۔ [۵۳] ایضاً، ص ۹۲۔

[۵۴] الماوردی۔ الاحکام السلطانیہ۔ مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی ۱۳۸۰ھ۔ الباب الاول فی عقد الامامت۔ص ۵ و مابعد۔

[۵۵] سیاست نامہ میں ایسی کثیر التعداد مثالیں موجود ہیں اور ہر بحث کے ضمن میں ایسے شواہد ملتے ہیں مثلاً فصل چہارم میں قباد کا واقعہ۔ [۵۶] الاحکام السلطانیہ۔ص ۳۳ و ۳۴۔

[۵۷] الاحکام السلطانیہ۔ص ۵ و ۶ و سیاست نامہ، ص ۳ و ۴۔

[۵۸] الغزالی۔ الاقتصاد فی الاعتقاد، مطبوعہ مصر، ص ۱۰۶ و سیاست نامہ، ص ۷ و مابعد۔

(ماہنامہ ''نگار'' پاکستان، کراچی ۱۹۶۸ء)

○○○

فلسطین بعہد اسلامی

(از آغاز تا جنگ ہائے صلیبی، ۱ھ تا ۴۹۲ھ)

جناب رسول اکرم ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد ۶۲۲ء میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ یہ ریاست اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ اندرونِ عرب جہاں مدینہ اور خیبر کے یہود مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے، وہاں قریشِ مکہ اور نجد و حجاز کے قیسی قبائل انہیں برباد کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ بیرونِ عرب شام کی عیسائی رومی سلطنت اور ایران و عراق کی مجوسی شہنشاہی اس نوزائیدہ ریاست کو اپنے عہد طفولت ہی میں موت کی نیند سلا دینا چاہتی تھیں۔ جناب سرور کائنات ﷺ کو ان داخلی و خارجی خطرات کا انسداد کرنا اور اسلامی ریاست کو ان تمام دشمنوں سے محفوظ و مصون رکھنا تھا۔

رومۃ الکبریٰ کی عظیم سلطنت کا مشرقی حصہ جس کا مرکزی شہر قسطنطنیہ تھا چوتھی صدی عیسوی تک نہ صرف یہ کہ عیسائیت قبول کر چکا تھا، بلکہ اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا پرجوش حامی و نقیب بھی بن گیا تھا۔ اس نئے مذہبی جوش کے ساتھ جب شام بالخصوص اس کے جنوبی حصہ فلسطین پر اس کا تسلط ہوا، تو اس نے یہودیوں سے بھرپور انتقام لیا اور ان کے مقدس شہر یوروشیلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سارے شہر کو آگ لگا دی گئی، یہودیوں کو قتل کیا گیا۔ ان کی عبادت گاہوں، بالخصوص معبد صخرہ'' کو برباد کر کے ''غلاظت کدہ'' بنا دیا گیا[۱]۔ یوں فلسطین نہ یہود کی مذہبی عبادت گاہوں کا شہر رہا اور نہ وطن یہود۔ اس کے بعد

رومی حکمرانوں نے یروشیلم میں عیسائیت کی مذہبی یادگاریں، کنیسا اور سرائیں تعمیر کیں۔ جس جگہ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا وہاں ''کنیسۂ قمامہ'' ازسرِنو تعمیر کیا گیا اور ''صلیب مقدس'' کو وہاں نصب کیا گیا۔ یوں یہ شہر عالمی عیسائیت کا مذہبی مرکز قرار پایا[۲]۔

رومیوں نے عیسائیت کی تبلیغ اور شام پر اپنے تسلط کو مستحکم کرنے کی غرض سے جزیرۂ عرب سے متصل شامی سرحدات (مشارف شام) پر اپنا سیاسی و مذہبی اثر بڑھانا شروع کیا اور بُصریٰ کے مقام پر عرب قبیلہ بنو غسان کی نیم خود مختار سلطنت قائم کر دی۔ بنو غسان اندرون عرب رومی اثر و نفوذ قائم کرنے میں سرگرم رہتے تھے اور ان کی وجہ سے وہ عرب قبائل جو نقل وطن کر کے شام میں آباد ہونے لگے تھے، نہایت سرعت سے عیسائی ہونے لگے[۳]۔ عیسائیت کی ترویج و تبلیغ کو روز افزوں فروغ ہوا اور یمن و حجاز کے سرحدی قصبہ نجران میں عیسائیت کا ایک قومی مرکز قائم ہو گیا۔ عیسائیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لیے یمن کے یہودی حکمران بنوحمیر کے تُبّع آگے آئے اور انہوں نے نجران پر قبضہ کر کے عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نجران کے عیسائیوں کی مدد کے لیے رومیوں نے حبشہ کے اکسومی عیسائی حکمرانوں کو حکم دیا اور انہوں نے فوجی پیش قدمی کر کے یمن پر قبضہ کر کے یہودیوں کو عبرت ناک سزائیں دیں[۴]۔ اکسومی قابضین نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ عربوں کی مرکزیت ختم کرنے کی غرض سے انہوں نے مکہ پر حملہ کر کے خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کی نیت سے فوج کشی کی۔ مکہ اس تباہی سے ایک تائید غیبی کی وجہ سے بچ گیا[۵]، مگر سرحدات عرب اور اندرونِ ملک رومی عیسائیت کے غلبہ کے لیے برابر کوشاں رہے اور عربوں کو اپنی رعایا سے زیادہ نہ سمجھتے رہے۔[۶]

ہجرت نبویؐ کے بعد مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو رومی اپنے سیاسی و مذہبی اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور مشارف شام کے عیسائی عرب قبائل اس نئی اسلامی قوت سے نبرد آزما ہونے اور اسے پراگندہ کرنے کی کسی فرصت کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتے تھے۔ اس لیے ۵ھ سے مسلمان اس خطرہ کے سد باب کے لیے کوشاں رہے۔ اسی زمانہ میں سرحد

شام سے متصل دومۃ الجندل کے حاکم اُکیدر نے مدینہ کے کاروانوں کو رومیوں کے اشارہ پر روکنا شروع کیا اور جناب رسول اکرم ﷺ کو دومۃ الجندل پر فوج کشی کرنی پڑی، مگر اس موقع پر کوئی جنگ نہ ہوئی اور مسلمانوں کو وہاں سے جلد واپس ہونا پڑا اور دومۃ الجندل کا حاکم اُکیدر بھی مسلمانوں سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا[۷]۔ ۶ھ یا ۷ھ میں جناب رسول اللہ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کے نام اسلام کے پیغام بھیجے، انہیں میں ایک مکتوب بُصریٰ کے عیسائی حکمران کے نام روانہ کیا گیا۔ اسے حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی لے کر گئے۔ ان کو شام کے مقام بلقاء میں ایک عیسائی عرب سردار شرحبیل بن عمرو نے شہید کر دیا۔ اس خونِ ناحق کے انتقام کی غرض سے جناب رسول کریم ﷺ نے ۸ھ میں تین ہزار مسلمانوں کا لشکر حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں سرحد شام کی جانب روانہ کیا۔ اس دستۂ فوج کا مقابلہ موتہ کے مقام پر عیسائی عربوں اور ان کے رومی حامیوں سے ہوا، جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقابلہ بے جوڑ تھا، چنانچہ اسلامی لشکر اپنے تین سپہ سالاروں حضرات زیدؓ بن حارثہؓ، جعفرؓ بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کی اعلیٰ حربی قیادت کی وجہ سے بسلامت مدینہ لوٹ آیا اور انہیں بارگاہ رسالت سے ''سیف اللہ'' (اللہ کی تلوار) کا خطاب ملا[۸]۔ اس واقعہ کے متعلق مشہور مورخ فلپ خوری حِطی اپنی کتاب ''History of The Arabs'' میں لکھتا ہے:

''قریب قریب اسی زمانے میں جب ہرقل ''صلیب مقدس'' یروشلم میں دوبارہ نصب کر رہا تھا، شرق اردن کی فوجوں نے یہ خبر بھیجی کہ ایک عرب دستے نے حملہ کیا، جسے آسانی سے پسپا کر دیا گیا۔ رومیوں نے اس واقعہ کو ایسا ہی چھاپہ خیال کیا، جیسے کہ سرحدی بستیوں پر اکثر پڑتے رہتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی اس طویل جدوجہد کا پہلا تیر تھا جو بالآخر مغرور قیصر کے دارالسلطنت کے سقوط (۱۴۵۳ء) ہی پر ختم ہونے والی تھی جبکہ اسلام کے تازہ دم سپاہی میدان میں آئے اور دنیائے مسیحیت کے سب سے شاندار کلیسا ایا صوفیہ کے در و دیوار پر حضرت مسیح کے بجائے پیغمبر اسلام (ﷺ) کا نام نامی تحریر ہوا''۔[۹]

بصریٰ کے یہ غسانی امراء مدینہ پر فوج کشی کی تیاریاں کر رہے تھے اور روز بروز خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، چنانچہ جناب رسالت مآب ﷺ ۹ھ میں تیس ہزار مسلمانوں کے ہمراہ شام کے سرحدی شہر تبوک تک گئے۔ مگر عیسائی مقابلہ پر نہ آئے اور آپ ﷺ اردگرد کے عیسائی سرداروں سے فوجی تعاون کے معاہدے کر کے اور دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر کو مطیع فرمان کر کے، مدینہ واپس آئے، مگر رومیوں اور ان کے پٹھو عیسائی عربوں کے حملہ کا خطرہ بدستور موجود تھا، اس لیے آپ ﷺ ان کی جانب سے غافل نہ رہے اور ان کے سد باب میں مشغول رہے۔[۱۰]

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد ۱۱ھ کے اوائل میں نبی کریم ﷺ نے غسانیوں کی سرکوبی اور حضرت زید بن حارثہؓ کی شہادت کے انتقام کی نیت سے ان کے صاحب زادہ حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں ایک فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ مدینہ کے باہر ''جُرف'' میں مسلمان جمع ہونا شروع ہوئے، مگر اس فوج کی لام بندی سے قبل آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیعت خلافت کے بعد جو پہلا کام کیا، وہ یہی تھا کہ ''جیش اسامہ'' کو تمام تر داخلی و خارجی رکاوٹوں کے باوجود سرحداتِ شام کی جانب روانہ فرمایا۔ اس مرتبہ بھی کوئی جنگ نہ ہوئی اور دو ماہ بعد اس جیش کے لوگ مدینہ واپس آئے اور فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے میں دوسری اسلامی افواج کے ساتھ مصروف عمل ہو گئے۔[۱۱]

مگر مسلمان شامی سرحدوں کی نزاکت سے واقف تھے۔ چنانچہ جنگ ہائے ارتداد (حروب ردہ) کے دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مختلف امراء کی کمان میں جو جیوش روانہ کئے، اور جن کی تعداد (۱۱) بتائی جاتی ہے، ہر چند کہ ارباب سیر انہیں مرتدین کے خلاف جانے والے دستوں میں شمار کرتے ہیں، مگر ان میں دو دستے جو حضرات عمرو بن عاص اور خالد بن سعیدؓ کی کمان میں بالترتیب سرحداتِ شام میں آباد قضاعہ، ودیعہ اور حارث کے قبائل کے خلاف مشارفِ شام میں واقع الحمقتان کے سرکش قبائل کے خلاف تیما کی جانب روانہ کیے گئے، دراصل رومیوں اور ان کے پٹھو عربوں کے متوقع حملوں کی روک تھام

کے لیے تعینات کئے گئے تھے، اور ان کا براہِ راست مرتدین عرب کے خلاف منظم کی جانے والی مہمات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان دو دستوں میں سے جو دستہ حضرت خالدؓ بن سعید کی کمان میں تھا، اسے یہ حکم دیا گیا تھا کہ سرحدی شہر تیماء میں رک کر شام سے مدینہ جانے والی شاہراہ کی حفاظت کرے اور رومیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے تا کہ کسی حملہ کا بروقت تدارک کیا جاسکے۔[۱۲]

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مرتدین کی شورشوں اور ایرانیوں کی چیرہ دستیوں سے فارغ ہوتے ہی ۱۳ھ کے آغاز میں شام پر قابض رومی اور ان کے حامی عیسائی عربوں کے خطرات کے سدباب کی جانب توجہ دی۔ چنانچہ آپ نے رومیوں کے خلاف جہاد کی غرض سے تمام عرب کے مسلمانوں کو مدینہ میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت پر قبائل عرب نے لبیک کہا اور مدینہ کے باہر جُرف میں لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ اس دعوت پر قریش مکہ نے بالخصوص لبیک کہا اور وہ بڑی تعداد میں جہادِ شام میں شمولیت اور نو مفتوحہ ملک میں مستقل آباد ہونے کے ارادہ سے مکہ سے نکل کر جُرف میں اکٹھا ہوگئے۔ جب کافی لوگ جمع ہوگئے، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شام پر یلغار کی غرض سے چار سرداروں کی کمان میں چار لشکر ترتیب دیئے۔ ان میں سے ہر لشکر کی تعداد ابتداء میں تین تین ہزار تھی۔ لیکن لوگوں کے جوق در جوق آنے کی وجہ سے روانگی سے پہلے ہر لشکر کی نفری ساڑھے سات ہزار ہوگئی۔ ان لشکروں کی قیادت اور یلغار کی سمت کا تعین یوں کیا گیا۔ (۱) حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کو بلقاء کے راستہ سے حمص کی جانب آگے بڑھنا تھا۔ (۲) حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو دمشق پر تبوک کے راستہ سے پیش قدمی کرنی تھی۔ (۳) حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو اردن کی تسخیر پر مامور کیا گیا اور انہیں تبوک کی راہ سے محاذ پر جانا تھا۔ (۴) حضرت عمرو بن عاصؓ کو فلسطین پر براہ ایلہ پیش قدمی کرنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ دشمن کی بھاری تعداد کی صورت میں ان سپہ سالاروں کو متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے[۱۳]۔ ان چاروں سالاروں میں سے حضرت عمروؓ بن عاص کو رومی افواج کی مزاحمت اور پیش قدمی کا

سب سے پہلے سامنا کرنا پڑا اور انہیں کے ہاتھوں شام کے علاقہ فلسطین کے قصبات پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ مورخ البلاذری کے بیان کے مطابق سب سے پہلا معرکہ فلسطین کے علاقہ غزّہ کی جس بستی میں ہوا اس کا نام داثن تھا۔ دوسرا معرکہ فلسطین کے مقام عربہ میں ہوا، یہاں حضرات عمرو بن عاص اور یزید بن ابی سفیان کی مشترکہ کمان کا چھ (۶) رومی افسروں سے مقابلہ ہوا اور دشمن نے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی۔ مسلمان فوجوں نے ان بھگوڑوں کا تعاقب کر کے انہیں رابیہ کے مقام پر گھیر لیا اور سخت ہزیمت سے دوچار کیا[۱۴]۔ ان پے در پے شکستوں سے رومی سخت پریشان ہوئے چنانچہ ہرقل نے ایک لاکھ سپاہ سے مقام اجنادین میں مسلمانوں کی مشترکہ کمان سے مصاف کیا مگر رومیوں کو اس معرکہ میں بھی پسپا ہونا پڑا۔ اسلامی افواج کی کمان حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کے ہاتھ میں تھی[۱۵]۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں شامی محاذ پر رومیوں سے آخری جنگ واقوصہ میں لڑی گئی جس میں رومیوں نے شکست کھائی[۱۶]۔ اس سے اگلی جنگ اردن کے مقام فحل میں ہوئی[۱۷] جو عہد فاروقی کی پہلی جنگ تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں یرموک کی فیصلہ کن لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور شام کے مرکزی شہر دمشق پر ان کا قبضہ ہو گیا[۱۸]۔ شام کے محاذ پر معرکہ آرائیوں کے دوران میں ۱۵ھ میں اسلامی افواج نے فلسطین کے مرکزی شہر بیت المقدس، یروشلم، ایلیاء یا القدس کا محاصرہ کیا۔ محصورین ارباب کلیسا اور رومی اسقف نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی کہ خود امیر المؤمنین آ کر پروانۂ امن پر دستخط کریں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کی اطلاع پر حضرت عمر فاروقؓ مدینہ سے بیت المقدس تشریف لائے، اور عیسائیوں سے معاہدۂ امن تحریر کیا گیا۔ یوں یہ مقدس شہر جو تین (۳) عظیم سامی مذاہب کا مقدس مرکز ہے، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ یہ معاہدہ بلکہ فرمان شام کے تمام مفتوحہ اضلاع کے باشندوں کے لیے بھی تھا۔ ہم اسے طبری سے نقل کرنا مناسب خیال کرتے ہیں:[۱۹]

"یہ وہ امان ہے، جسے اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر عمر نے ایلیاء کے

لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام ہم مذہبوں کے لیے ہے۔ اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی، نہ وہ منہدم کیے جائیں گے اور نہ ان کو اور ان کے احاطوں کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیاء (بیت المقدس) میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے۔ ایلیاء والوں پر یہ فرض ہے کہ وہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور رومیوں اور چوروں کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان رومیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان و مال کو امان ہے، تا آنکہ وہ اپنے مقام امن میں پہنچ جائے اور ان میں سے جو ایلیاء ہی میں رہنا چاہے اسے بھی امان ہے اور اسے جزیہ دینا ہوگا۔ ایلیاء والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور اپنا مال لے کر رومیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ایسوں کو اور ان کے گرجاؤں کو اور صلیبوں کو امان ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر اللہ کے رسول، اللہ کے خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے، بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عبدالرحمان بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان''۔

فلسطین کے مقامات تبنیٰ، سمطیہ، بیت جبرین، یافا، لد، نابلس اور عمواس کے باشندوں کو انہیں شرائط پر امان دی گئی [۲۰]۔ سب سے اخیر میں فلسطین کا ساحلی شہر قیساریہ ۱۹ھ میں حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ [۲۱]

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے القدس سے واپسی کے وقت الصخرہ کے قریب جہاں نماز ادا کی تھی، وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ چنانچہ وہاں ایک سادہ سی مسجد بن گئی، جسے بعد میں بڑی ترقی دی گئی اور یہی مسجد الاقصیٰ، مسجد صخرہ یا مسجد عمر کہلائی [۲۲]۔ ہم عہد اموی میں اس کی توسیع و تحسین کا مزید ذکر کریں گے۔

عراق، شام و مصر کی تسخیر کی تکمیل کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے جو فوجی

چھاؤنیاں (اجناد) قائم کیں، جہاں داخلی امن و امان اور خارجی حملوں کے سدباب کے لیے فوجیں رکھی گئیں، ان کی تعداد آٹھ (۸) تھی۔ ان آٹھ اجناد میں سے چار کا تعلق شام سے تھا۔ یہ شامی اجناد (جند) حمص، دمشق، اردن اور فلسطین میں تھیں۔ فلسطین کی جند میں مقاتلہ کے ساتھ عربوں کے قبائل کو آباد کیا گیا اور کبار صحابہ کو ان لوگوں کی دینی تعلیم کی غرض سے مقرر کیا گیا[۲۳]۔ یوں جلد ہی فلسطین امن و امان کا گہوارا اور اسلامی علوم کا مرکز بن گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت اور ان کے بعد حضرت معاویہؓ کے زمانہ تک فلسطین ایک اہم اسلامی مرکز کے بطور رہا۔

۴۱ھ میں خلافت بنی امیہ کے آغاز سے ۱۳۲ھ میں اس خانوادہ کے زوال تک دیگر شامی مراکز کی طرح فلسطین کے شہر رملہ، قیساریہ، لُد، طبریہ، صور اور عسقلان اہم اسلامی مراکز اور فوجی معسکر رہے۔ شام کے انہیں اجناد کے مقاتلہ نے مرکز میں اموی خلافت کو مستحکم کیا، عراق کی بغاوتوں کو فرو کیا، خوارج کی شورشوں کو کچلا اور مصر سے آگے المغرب (شمالی افریقہ) کی تسخیر میں نمایاں کردار ادا کیا اور اندلس تک اسلام کی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا۔ انہیں سپاہ نے مشرقی رومی سلطنت (بازنطینیہ) سے آرمینیہ اور ایشیائے کوچک میں لگاتار معرکہ آرائیاں کیں اور دشمن کو اتنا کمزور کر دیا کہ ترکانِ عثمانی کے ہاتھوں ان کی بساط سیاست ہمیشہ کے لیے لپیٹ دی گئی۔ بری محاذ کے علاوہ ان مقاتلہ نے بحر روم میں دشمن کی بالادستی کو یکسر ختم کر کے نہ صرف شام کی ساحلی بستیوں کو رومیوں کی غارت گری سے محفوظ و مامون کیا، بلکہ ان کے نمایاں ساحلی مراکز مثلاً روڈس، اسکندریہ، اقریطش (کریٹ) اور قبرص (سائپرس) کو ان سے چھین کر بحر متوسط کو بحر روم کے بجائے بحر عرب کا ایک حصہ بنا دیا[۲۴]۔ یوں شام بالعموم اور فلسطین بالخصوص، بنی امیہ کے دور میں سلطنت اسلامیہ کی قوت کا مرکز، اسلامی ثقافت کا مخزن اور امن و امان کا مہد بن گیا، جہاں مسلمان، عیسائی، یہودی اور سامرہ مذہبی و شہری آزادی سے یکساں بہرہ ور تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی بیعتِ خلافت جنگ صفین کے بعد ۳۷ھ کے اخیر میں بیت المقدس ہی میں ہوئی، کیونکہ مکہ اور

مدینہ حضرت علیؓ کے قبضہ میں تھے اور حرمین کے بعد اس شہر کو واقعۂ اسراء و معراج اور مسلمانوں کے قبلۂ اول ہونے کی وجہ سے مذہبی تقدس حاصل تھا[۲۵]۔ فتح اسلامی کے بعد یہاں صحابۂ کرام اور عرب مقاتلہ کی آباد کاری کی وجہ سے اسلام کی اشاعت کا کام تیز تر ہونے لگا اور یہاں پہلے سے آباد عیسائی عربوں اور دوسری قوموں نے بکثرت اسلام قبول کیا[۲۶]۔ ۶۴ھ میں یزید اول کے انتقال کے بعد دنیائے اسلام میں سیاسی انتشار پھیلا۔ یہ لاقانونیت اور خانہ جنگی ۷۳ھ تک کوئی نو (۹) سال رہی۔ حجاز اور عراق کے وسیع علاقہ پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ قابض تھے، کوفہ میں شیعان علیؓ اور مختار ثقفی کا زور تھا اور بصرہ میں خوارج کی شورہ پشتی کی وجہ سے انتشار تھا اس زمانہ میں صرف شام و مصر پر بنو امیہ کا قبضہ تھا، مگر انہیں بھی ابنِ زبیرؓ اور شیعان علیؓ سے نبرد آزمائی کے باعث شام و فلسطین کے معاملات کی جانب توجہ مبذول کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس زمانۂ انتشار میں رومیوں نے شام و فلسطین کے ساحلی شہروں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے فلسطین کے ساحلی شہر عسقلان کو لوٹ کر برباد کر دیا، اسی طرح دوسرے ساحلی مقام قیساریہ پر حملہ کر کے وہاں کی مسجد کو شہید اور باشندوں کو جلا وطن کر دیا۔ اس دوران میں صور اور عکا کے شہروں کو بھی رومی بحریہ نے برباد کر دیا۔ جب اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے انتشار اور خانہ جنگی ختم کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کی، تو اس نے ان برباد شہروں کو دوبارہ بسایا، انہیں فوجی نقطۂ نظر سے مستحکم کیا اور جلاء وطن ہو جانے والوں کو آباد کیا[۲۷]۔ حضرت عمرؓ نے جو مختصر سی مسجد القدس میں بنوائی تھی اسے عبدالملک نے نہایت وسعت دی اور اس کی آرائش و زیبائش پر خاصی توجہ دی۔ ''صخرہ'' پر اس نے ایک بلند و خوبصورت ''قبہ'' بنوایا جسے ''قبۃ الصخرہ'' کے نام سے شہرت ہوئی۔ بیت المقدس اور فلسطین کے دوسرے شہروں میں عبدالملک اور اس کے جانشین ولید اول نے متعدد مساجد بنوائیں۔ ولید اور عمر بن عبدالعزیز نے مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کی تحسین و تحصین کا بڑا اہتمام کیا اور ان کے عہد تک فلسطین کا سارا علاقہ اسلامی ثقافت کا آئینہ دار ہو گیا[۲۸]۔ ولید ہی نے اپنے بھائی اور جانشین سلیمان بن

عبدالملک کو فلسطین کا والی مقرر کیا۔ اس نے یہاں رملہ کا شہر آباد کیا، جامع مسجد بنوائی اور شہر میں پانی کے کئی تالاب بنوائے۔ جب خود سلیمان خلیفہ ہوا تو اس نے اس شہر کی توسیع کی۔ اس کے دور خلافت میں فلسطین کو دو انتظامی حصوں میں تقسیم کر کے ایک کا دارالحکومت بیت المقدس اور دوسرے کا دارالسلطنت رملہ کو بنایا گیا۔[۲۹]

۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں بنوامیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوا اور بنو عباس کی خلافت قائم ہوئی۔ عباسیوں کی خلافت کا مرکز بغداد تھا، اس بناء پر اس عہد میں شام کی اہمیت پہلے جیسی نہ رہی، لیکن فلسطین کی اہمیت اس لیے باقی رہی کہ مصر اور شمالی افریقہ کا راستہ فلسطین ہی سے ہو کر جاتا تھا اور نیز اس وجہ سے بھی کہ اس خطہ میں بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ واقع تھے جو اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے نزدیک مذہبی تقدس کے حامل تھے۔ دوسرا عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور اپنے عہد خلافت میں دو بار بیت المقدس آیا۔ ایک بار ۱۴۰ھ میں مسند نشین خلافت ہونے کے بعد اور دوسری بار ۱۵۴ھ میں۔ اس نے مسجد اقصیٰ میں توسیع کرائی اور بعض پرانی عمارتوں کی مرمت بھی کروائی۔ بعد کے خلفاء ان عمارات کی توسیع و آرائش میں دلچسپی لیتے رہے[۳۰]۔ مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے فلسطین پر خصوصی توجہ دی۔ عیسائی زائرین کے لیے اس نے بہت سی سہولتیں مہیا کیں اور مقامات مقدسہ کے ان زائرین کی تعداد اس زمانہ میں خاصی بڑھ گئی۔ ان امور کا نگراں مشہور عباسی سپہ سالار ہرثمہ بن اعین تھا جو ۱۷۰ھ میں فلسطین کا والی مقرر ہو کر آیا تھا[۳۱]۔ ۲۲۷ھ میں خلیفہ معتصم باللہ کے دور میں مُبرقع کی بغاوت کے سوا یہاں بالعموم امن وسکون رہا اور یہاں کے لوگ عموماً خوش حال رہے[۳۲]۔ مشہور جغرافیہ داں الاصطخری کے بیان کے مطابق فلسطین شام کے زرخیز ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا دوسرے جغرافیہ نویس المقدیسی کے بقول زیتون، انجیر اور منقیٰ یہاں کی خاص پیداوار تھیں۔ پارچہ بافی اور صابون سازی کی صنعت فروغ پر تھی۔ مورخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ فلسطین کا مالیہ تین لاکھ دس ہزار دینار سالانہ تھا[۳۳]۔ ۲۴۷ھ میں المتوکل کے بعد خلافت عباسیہ انحطاط کا شکار ہوئی تو خلافت

کے مختلف صوبے مرکز سے الگ ہوتے گئے، چنانچہ مصر و شام کے طاقت ور امیر احمد بن طولون نے ۲۶۴ھ میں فلسطین پر قبضہ کرلیا[۳۴]۔ اس کے بعد سے یہاں سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی کا دور شروع ہوا، چنانچہ کتاب الخراج کے مطابق یہاں کا سالانہ مالیہ ایک لاکھ پچانوے ہزار دینار رہ گیا[۳۵]، مگر بحیثیت مجموعی بیت المقدس کا شہر امن و سلامتی کا گہوارہ رہا اور مختلف علاقوں سے علماء و فضلاء یہاں آ کر قیام کرتے رہے، چنانچہ امام غزالیؒ اپنے دس سالہ زمانۂ ترک تعلقات میں یہیں تزکیہ و تصفیہ باطن میں مصروف رہے[۳۶]۔ ۲۶۴ھ سے ۳۵۸ھ تک قریب قریب ایک سو سال تک شام و فلسطین پر طولونی خاندان کے امراء، عباسیوں کے متوسلین اور قرامطہ کے غارت گر وقفہ وقفہ سے قبضہ کر کے انتشار اور بدامنی کو ہوا دیتے رہے اور یہاں کے باشندے سیاسی، معاشی اور مذہبی ابتلاء و استحصال کے صیدِ زبوں رہے۔ اس زمانے کے محاربات اور غارت گریوں کا ذکر محض تطویل لاطائل ہے، ہاں چوتھی صدی ہجری میں شام و فلسطین کے مخدوش حالات کا ان سے ضرور پتا چلتا ہے۔ ان کے بیان کے لیے تفصیل چاہئے، جس کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابن الاثیر کی تاریخ الکامل کے مطالعہ سے اس عہد کے ابتلاء اور دنیائے اسلام کی زبوں حالی کا حال معلوم ہوگا۔

۳۵۸ھ میں بنو فاطمہ کے چوتھے حکمران المعز نے مصر فتح کرنے کے بعد شام پر فوج کشی کی اور مسلمانوں کے قتل عام کے بعد دمشق اور رملہ پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ مگر بنو فاطمہ کے دور میں حکومت نے مخالف عرب امراء اور قرامطہ سے جنگ کرنے، عوام کو قتل کرنے اور لوگوں سے خراج کی وصولی کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہ دیا۔ ۳۶۰ھ میں قرامطہ نے رملہ پر قبضہ کر کے فاطمی افواج کو یافا میں گھیر لیا اور مصری بحریہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ ۳۶۴ھ میں فاطمی خلیفہ العزیز نے فلسطین پر ایک بڑا حملہ کیا اور گھمسان کی لڑائی اور ہزاروں باشندوں کے قتل کے بعد اسے اس خطہ پر بالادستی حاصل ہوئی[۳۷]۔ قصہ مختصر یہ یک صد سالہ دور انتشار اور بربادی کے سوا کسی قابل ذکر کارکردگی کے لیے شہرت نہیں رکھتا۔ ہاں ایک بات یہ ضرور ہوئی کہ ۳۹۸ھ میں مصری خلیفہ الحاکم نے القدس کے کنیسۂ قمامہ کو منہدم کرادیا جو

دنیائے مسیحیت کی ایک مقدس زیارت گاہ تھی اور یہاں عیسائی زائرین کی آمد اور ان کی مذہبی رسومات کی ادائیگی پر پابندی لگادی۔[۳۸]

فلسطین کی مخدوش سیاسی حالت اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر مشہور سلجوقی سلطان ملک شاہ کے بھائی تاج الدولہ بن الپ ارسلان نے اس خطہ پر قبضہ کرلیا۔ ۴۸۵ھ میں ملک شاہ کی وفات کے بعد اس نے خود مختارانہ فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک کے بعض علاقوں پر اپنی بادشاہی کا آغاز کیا[۳۹]۔ یوں اس حکومت کا آغاز ہوا جسے شام کی ''دولت بوریہ'' کے نام سے شہرت ملی اور جو سلاجقہ کی ایک شاخ تھی۔[۴۰]

ملک شاہ کی وفات کے ساتھ ہی دولت سلاجقۂ بزرگ کی عسکری طاقت رو بہ زوال ہوگئی۔ سلجوقی شاہزادے اور امراء حصول اقتدار کی کشمکش میں الجھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ہم نسل سلاجقۂ روم (ایشیائے کوچک) بھی تفرق وتشتت کا شکار ہوگئے[۴۱]۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیائے اسلام کا مغربی حصہ، بشمول صلقیہ، اندلس، المغرب و مصر ضعف و انحطاط کا صید زبوں ہوگیا۔ ان حالات میں دشمنوں کے لیے مسلمانوں سے نبرد آزمائی کرنا اور ان کے مقبوضات پر قبضہ جمانا آسان ہوگیا۔ اسی زمانہ میں شام، ایشیائے کوچک اور مصر میں داخلی امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے سبب بیت المقدس آنے والے عیسائی زائرین کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ترک حکام کی سخت حکمت عملی کی وجہ سے بھی ان زائرین کے لیے بیت المقدس کا سفر آسان نہ رہا۔ یورپ میں پاپائے روم نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر یہ تحریک چلائی، کہ عیسائی مقامات مقدسہ پر قبضہ کرکے وہاں سے مسلمانوں کا قبضہ ختم کردینا چاہیے۔ یہ تحریک جسے ہم تاریخ میں ''حروبِ صلیبیہ'' کے نام سے جانتے ہیں اور جو قریب قریب دوسو سال تک جاری رہیں، شام خصوصاً اس کے جنوبی حصہ یعنی فلسطین کے لیے نہایت ہولناک اور تباہ کن ثابت ہوئیں۔ عیسائی حملہ آوروں کی وحشت اور بربریت کی ایسی داستان رقم کی گئی جو تاریخ معلوم میں انسان دشمنی، تہذیب بیزاری اور درندگی کے لیے یادرکھی جائے گی۔ ان جنگوں کا مجمل

ذکر بھی ایک سفینہ چاہتا ہے جس کا بیان ہمارے موضوع سے خارج ہے

بہرکیف پہلی صلیبی جنگ کا آغاز سلاجقۂ روم کے دارالحکومت قونیہ کے محاصرہ اور سلجوقی حاکم قلیج ارسلان کی شکست سے ۴۹۰ھ میں ہوا۔ صلیبی جنگ آزما آگ اور خون کا کھیل کھیلتے ہوئے ۴۹۱ھ میں انطاکیہ پہنچے یہاں کے سلجوقی حاکم باغیسیاں کو شکست دے کر انہوں نے ساری مسلم آبادی کو تہہ تیغ کر دیا۔ یہاں سے پیش قدمی کر کے رجب ۴۹۲ھ میں انہوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا اور بیالیس (۴۲) دن کے محاصرہ کے بعد شعبان ۴۹۲ھ (جولائی ۱۰۹۹ء) میں شہر مقدس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ شہر میں ستر ہزار مسلمان شہید کیے گئے، مسجد اقصیٰ کا تمام نقرئی اور طلائی بیش قیمت سامان لوٹ لیا گیا[۴۲]۔ اس فتح کا صلیبیوں نے پوپ کو ان الفاظ میں مژدہ سنایا:

''جب ہمارے سپاہی (معبد سلیمان)، مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا''۔[۴۳]

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

حواشی

[۱] پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، مطبوعہ ۱۹۷۸ء، جلد ۱۶ (اول) صفحہ ۲۳۳-۲۳۵۔

[۲] ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت ۱۹۶۷ء، جلد اول، صفحہ ۱۸۹۔

[۳] ابن قتیبہ، المعارف، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۷۸-۲۸۰۔

[۴] ابن الاثیر، جلد اول، صفحہ ۲۵۰، ڈاکٹر حمید اللہ رسول اکرم کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت کراچی ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۸۸-۱۹۴۔

[۵] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، لاہور ۱۹۸۴ء، جلد دوم، صفحہ ۱۶۹-۱۷۶۔

[۶] رسول اکرم کی سیاسی زندگی، صفحہ ۱۸۸۔

[۷] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ملتان ۱۹۷۷ء، جلد دوم، صفحہ ۱۸۷۔

[۸] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت ۱۹۵۷ء، جلد دوم، صفحہ ۱۲۸-۱۳۰۔

[۹] فلپ خوری حطی / ہاشمی فرید آبادی، تاریخ ملت عربی، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۲۴۔

[۱۰] ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۳۱۶ و ۳۱۷۔

[۱۱] ابن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف، مصر ۱۹۶۲ء، جلد سوم، صفحہ ۲۲۳-۲۲۷۔

[۱۲] ابن جریر طبری، جلد سوم، صفحہ ۲۴۸ و ۲۴۹۔

[۱۳] احمد بن یحییٰ البلاذری، فتوح البلدان، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۱۵-۱۱۷،
ابن الاثیر، جلد دوم، صفحہ ۲۷۸۔

[۱۴] البلاذری، صفحہ ۱۴۴۔

[۱۵] البلاذری، صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱۔

[۱۶] البلاذری، صفحہ ۱۲۱۔

[۱۷] البلاذری، صفحہ ۱۲۲۔

[۱۸] البلاذری، صفحہ ۱۴۰-۱۴۳۔

[۱۹] ابن جریر طبری، جلد سوم، صفحہ ۶۰۷-۶۱۰۔

[۲۰] البلاذری، صفحہ ۱۴۴-۱۴۷۔

[۲۱] البلاذری، صفحہ ۱۴۷۔

[۲۲] البلاذری، صفحہ ۱۴۴-۱۴۸۔

[۲۳] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱۹۷۵ء، جلد ۱۵، صفحہ ۲۶۵-۲۶۶۔

[۲۴] البلاذری، صفحہ ۱۹۷، ۲۲۱، ۲۲۷۔

[۲۵] البلاذری، صفحہ ۱۴۴-۱۴۸، طبری، جلد پنجم، صفحہ ۳۲۴۔

[۲۶] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۶ (اول)، صفحہ ۲۹۸-۲۹۹۔

[۲۷] البلاذری، صفحہ ۱۴۸ و ۱۴۹۔

[۲۸] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۶ (اول) صفحہ ۲۹۹۔

[۲۹] البلاذری، صفحہ ۱۴۹۔

[۳۰] ابن کثیر، جلد دہم، صفحہ ۷۵، ۱۱۱، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۶ (اول) صفحہ ۲۹۹۔

[۳۱] ابن کثیر، جلد دہم، صفحہ ۱۷۱۔

[۳۲] ابن کثیر، جلد دہم، صفحہ ۲۹۵۔

[۳۳] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۵، صفحہ ۴۶۵ و ۴۶۶۔

[۳۴] ابن الاثیر، جلد ششم، صفحہ ۱۸۔

[۳۵] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۵، صفحہ ۴۶۵ و ۴۶۶۔

[۳۶] ابن کثیر، جلد ۱۲، صفحہ ۱۷۴۔

[۳۷] ابن الاثیر، جلد ہفتم، صفحہ ۹۴ و ۹۵۔

[۳۸] ابن الاثیر، جلد ہفتم، صفحہ ۲۴۰۔

[۳۹] ابن الاثیر، جلد ہشتم، صفحہ ۱۶۶ و ۱۶۷۔

[۴۰] شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء، جلد چہارم، صفحہ ۱۰۵، ابن کثیر، ۱۲: ۱۵۰۔

[۴۱] ابن الاثیر، جلد ہشتم، صفحہ ۱۶۰۔

[۴۲] ابن کثیر، جلد ۱۲، صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶، تاریخ اسلام، حصہ چہارم، صفحہ ۱۵۵ تا ۱۶۱۔

[۴۳] تاریخ اسلام، حصہ چہارم، صفحہ ۱۶۰ بحوالہ تاریخ یورپ از اے۔ جے گرانٹ صفحہ ۳۵۷۔

(دنیا زاد، کراچی ۲۰۰۲ء)

○○○

زوال خلافت عباسیہ کی ایک اہم دستاویز

خلافت عباسیہ ایک مربوط، منظم اور فعال تحریک کی تیس سالہ محتاط جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آئی اور ۱۳۲ھ میں اس کا پہلا حکمران ابوالعباس عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم مسند آرائے خلافت ہوا۔ خلافت عباسیہ کی تنظیمی اساس میں نظریۂ وراثت اور مذہبی سربراہی کے تصور کی کارفرمائی تھی اور اسی مذہبی بنیاد نے اس کی تشکیل، تاسیس، ترقی و دوام کو استحکام بخشا۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم نے انہی بنیادوں پر خلافت عباسیہ کی بلند و بالا عمارت تعمیر کی جو ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک اپنی قوت اور کارگزاری کے لئے دنیا میں مشہور اور قوی تر عالمی سیاسی قوت رہی اس کے بعد انحطاط، ضعف اور بے اقتداری کے چار سو سال تک جھونکے، جھکڑ اور طوفان آتے رہے لیکن یہ عمارت اپنی کمزوری کے باوصف مضبوط بنیاد کے سہارے یہ سب جھیل گئی اور ۲۴۸ھ سے ۶۵۶ھ تک کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ رہی۔ کمزور ہوتے ہوئے بھی شہزوروں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی رہی، بے اقتداری کے باوصف لوگوں کو اقتدار کے پروانے دیتی رہی اور قوت کا آخری سرچشمہ وہی رہی۔

ماوراء النہر کے قوی تر سامانی امراء اسی عباسی خلافت کے عطاء کردہ پروانۂ حکومت کے بل پر حکومت کرتے رہے، محمود غزنوی جیسا عظیم فاتح انہی کمزور عباسی خلفاء کے بخشے ہوئے القابات یمین الدولہ اور امین الملت، ولیٔ امیر المومنین کو اپنے لئے وجہ فخر و

مباہات سمجھتا رہا اور عظیم سلجوقی حکمران طغرل، الپ ارسلان و ملک شاہ، ہر چند کہ کشور کشا تھے، بڑے دبدبے کے سلطان تھے اور عظیم عسکری قوت کے مالک تھے، عباسی خلفاء کے آستانۂ اقبال پر جبین نیاز خم کرتے رہے، کیونکہ امت مسلمہ کے نزدیک حکمرانی کا حق صرف خلفائے عباس کو حاصل تھا۔ دین کی حفاظت، اسلام کی صیانت اور ملت کی قیادت انہی کا حق تھی اور ان کی اجازت کے بغیر قوی دست حکمران بھی دنیائے اسلام پر حکومت کرنے کے جائز حقدار نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن مسلمان سلاطین نے عباسی خلفاء کی اطاعت سے انحراف کیا انہیں مسلمانوں نے اچھی نظروں سے نہ دیکھا اور ان کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ مشہور صفاری طالع آزما یعقوب بن لیث صفار عباسیوں کی مخالفت کے سبب شکست کھا کر ناکام مرا، اس کا بھائی عمرو بن لیث عظیم فوجی قوت کے باوجود بلخ کی جنگ میں اسماعیل سامانی کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوا، ملک شاہ کو عباسیوں کی مخالفت مہنگی پڑی اور اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور جلال الدین خوارزم شاہ کو عباسیوں کے خلاف لشکر کشی کی سزا قدرت کی جانب سے یہ ملی کہ ہمدان کے مقام پر اس کا سارے کا سارا لشکر طوفان ابر و باراں کی نذر ہو گیا۔ جہاں عباسیوں کو اپنے کمزور اقتدار کو برقرار رکھنے میں ان کی مذہبی سربراہی اور عامۃ المسلمین کی ان سے خوش عقیدگی کو دخل رہا وہاں قدرت نے بھی ان کی ہر موقع پر مدد کی اور یوں وہ بے اختیاری اور کمزوری کے باوجود اپنی خلافت کو مزید چار سو سال تک باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے اور ان کا اقتدار جو واقعی ۲۴۷ھ میں المتوکل کی وفات کے بعد عملاً ختم ہو گیا تھا۔ ۶۵۶ھ تک برے بھلے باقی رہا اور دنیائے اسلام کے سیاسی اتحاد کی علامت کے بطور اور امت مسلمہ کے مذہبی سربراہ کی حیثیت سے انھیں مرکزی حیثیت و اہمیت حاصل رہی۔

مگر ۶۵۶ھ میں منگول فاتح ہلاکو نے بغداد کو فتح کر کے آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ اور آل عباس کو تہہ تیغ کر دیا اور یہ خلافت، یہ اسلامی مرکزیت کی علامت اور سیاسی اتحاد کا یہ نشان مٹ گیا۔ یوں عباسی خلافت کا سقوط نہ صرف ایک خاندان کی بربادی

کا حادثہ تھا بلکہ دنیائے اسلام کے سیاسی اتحاد کا خاتمہ بھی تھا۔ اسی لئے اسے اسلام اور مسلمانوں کا نقصان سمجھا گیا۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازی نے اس کا ان الفاظ میں مرثیہ لکھا:

آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں
اے محمد! گر قیامت سر برون آری زخاک
سر بردں آرو قیامت در میانِ خلق بیں

اس بربادی کی ذمہ داری کن افراد اور کن جماعتوں پر عائد ہوتی ہے، یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے مگر فوری بربادی میں جن دو شخصوں کا سب سے بڑا حصہ ہے وہ المستعصم کا وزیر ابن العلقمی اور مشہور فلسفی و عالم خواجہ نصیر الدین طوسی ہیں۔ ہلاکو نے بغداد فتح کرنے کے بعد عباسی خاندان کو برباد کرنے اور عباسی خلیفہ کو شہید کرنے کی اس وقت تک ہمت نہ کی جب تک کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اس کی ہمت نہ بندھائی اور یہ نہ فرمایا کہ مستعصم باللہ شرف میں حضرت یحییٰ بن زکریا یا حضرت حسین بن علی کی گرد کو نہیں پہنچتا اور ان دونوں کے دشمنوں کے ہاتھوں مقتول ہونے کے باوجود دنیا کا کاروبار درہم برہم نہ ہوا، اور قیامت نہ ٹوٹی، تو اس مستعصم کے قتل سے کیا ہوگا؟

بہر کیف ہلاکو نے وزیر محمد بن احمد علقمی اور خواجہ نصیر الدین طوسی کے مشورے اور سازش سے عباسی خلافت کو ختم، بغداد کو برباد اور اہل بغداد کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا اور بقول شیعی مورخ ابن الطقطقی جو عباسیوں کا مخالف، ابن العلقمی و طوسی کا مداح اور منگولوں کا حاشیہ بردار ہے:

وتقحم العسكر السلطانی هجوماً و دخولاً، فجری من القتل الذریع والنهب العظیم والتمثیل البلیغ ما یعظم سماعه جملةً، فما الظن بتفاصیله (الفخری ص ۲۴۷)

"(شہر میں) ہلاکو کی فوج کا ریلا بڑے زور شور سے آیا جس سے خوفناک مار

دھاڑ اور بھاری لوٹ مار اور عبرت ناک ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کرنے کے ہولناک واقعات پیش آئے جن کا اجمالی ذکر بھی عظیم ابتلاء اور مصیبت ہے چہ جائیکہ ان کو پوری تفصیلات کے ساتھ بیان کیا جائے۔"

سقوط بغداد اور انقراض خلافت عباسیہ کے اس ذمہ دار خواجہ نصیر الدین طوسی کی ایک تحریر جو، جہاں گشائی جوینی کی تیسری جلد کے ضمیمے کے بطور لائیڈن کے نسخہ مطبوعہ ۱۹۳۷ء میں شامل ہے، سطور آئندہ میں فارسی سے اردو میں منتقل کی گئی ہے اور بے کم وکاست قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے تا کہ خواجہ کے تبحر علمی کے باوجود ان کی عباسی دشمنی اور منگولی تملق کا حال الم نشرح ہو سکے اور اسلام کی تاریخ کے اس عظیم المیہ کے کردار کا علم عام قاری کو بھی ہو سکے کہ ان کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں پر کیا قیامت ٹوٹی۔ فھل من مذکر۔

"ترجمۂ متن"

جنگ بغداد کی کیفیت تحریر کردہ مرحوم افضل العالم استاد البشر نصیر الحق والدین محمد طوسی رحمتہ اللہ[۱]

جس زمانے میں بادشاہ جہاں، اصل امن دامان ہلاکو خان [۲] نے ملاحدہ[۳] کے استیصال کی نیت سے ان کے علاقے میں داخل ہونے کا عزم کیا، خلیفہ کے پاس ایلچی بھیجا کہ تمہارا کہنا یہ ہے کہ تم ہمارے مطیع ہو، سو اس ماتحتی اور زیردستی کی علامت یہ ہے کہ ہم سرکش (ملاحدہ) پر فوج کشی کریں (ماچوں بیاغی برنشیم) تو لشکر سے ہمیں کمک پہنچاؤ۔ خلیفہ نے اپنے وزیروں اور نائبوں سے مشورہ کیا کہ قرین مصلحت یہ ہوگا کہ تھوڑے سے سپاہی بھیج دیئے جائیں۔ امراء اور گروہ لشکر نے اس پر یہ کہا کہ ہلاکو یہ چاہتا ہے کہ اس طرح بہانے سے بغداد اور خلیفہ کا ملک سپاہیوں سے خالی ہو جائے تا کہ جب بھی اس کا جی چاہے کسی مزاحمت کے بغیر وہ اس ملک پر متصرف وقابض ہو جائے۔ اس مشورے کی وجہ سے خلیفہ نے لشکر کی ترسیل ملتوی کر دی۔[۴]

جب بادشاہ (ہلاکو) ملاحدہ کے ملک (کی تسخیر) سے فارغ ہوکر ہمدان کی جانب روانہ ہوا تو اس نے خیفہ سے سخت باز پرس کی کہ فوج کیوں نہ بھیجی، خلیفہ اس سے خائف ہوا، اور اس نے اپنے وزیر سے [۵] مشورہ کیا وزیر نے یہ صلاح دی کہ زرنقد، جواہرات، مرصعات، زرکار پارچہ جات، نفیس ملبوسات، عمدہ سواریاں، گھوڑے، سادہ رو غلام، باندیاں خچر اور اونٹ کی قسم [۶] کے بہت سارے مال ترتیب دے کر ہلاکو کی خدمت میں روانہ کر کے لشکر نہ بھیجنے کی معذرت کرنی چاہیئے ۔ یہ مشورہ خلیفہ کو پسند آیا اور اس نے حکم دیا کہ تحریر تیار کریں (نسخہ کنند) اور ان اشیاء کو ترتیب دیں۔ اس نے اپنے خاص امرا میں سے دو تین آدمیوں کو نامزد کیا کہ ہلاکو کی خدمت میں جا کر یہ تحائف پیش کر کے عذرخواہی کریں۔

دوات دار کوچک (صغیر) [۷] اور دوسرے اکابر دربار نے اس پر یہ کہا کہ وزیر نے یہ رائے اس لئے دی ہے کہ ہلاکو سے اپنا کام بنا لے اور ہمیں، لشکریوں اور اکابر کو ترکوں [۸] (منگولوں) کے حوالے کر دے کہ وہ ہم سب کو جان سے مار ڈالیں۔ اس لئے ہم خود اس پر نظر رکھیں گے کہ مال و اسباب لے کر یہ لوگ جب شہر سے باہر جائیں تو قاصدوں کو پکڑ لیں اور مال اور تحائف کو ہلاکو کی خدمت میں اپنے آدمیوں کے ہاتھ روانہ کریں، یوں اپنا کام بنالیں اور اپنے مخالف (وزیر کے حامی) امراء کو مبتلائے بلاء و عذاب کر دیں (وایشاں رادر بلاء نہیم) جب خلیفہ کو اس کا پتا چلا تو اس نے مال و اسباب کی ترسیل اور قاصدوں کی روانگی ملتوی کر دی اور اس کے بجائے تھوڑا سا نہایت معمولی تحفہ بھیج دیا۔ ہلاکو کو اس پر غصہ آیا اور حکم دیا کہ خلیفہ خود آئے اور اگر خود نہ آسکے تو تین آدمیوں، وزیر، دوات دار کوچک (صغیر) یا سلیمان شاہ [۹] میں سے کسی ایک کو بھیجے۔ خلیفہ نے اس میں سے کسی بات پر عمل نہ کیا اور معذرت چاہی اس سے بادشاہ ہلاکو کا غصہ اور بڑھ گیا اور اس نے بغداد کی سمت پیش قدمی و لشکر کشی کے بارے میں سوچا (اندیشۂ حرکت بجانب بغداد کرد) (اس دوران میں) چند بار، (سفراء کی آمدورفت رہی [۱۰] اور ایک بار محی الدین

کے صاحب زادہ ابن الجوزی [۱۱] کو قاصد بنا کر ہلاکو کی خدمت میں بھیجا گیا، مگر ان سب سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

بادشاہ (ہلاکو) نے ہمدان کے علاقے سے شوال ۶۵۵ھ میں پیش قدمی شروع کی۔ فوج کے میمنہ پر سوغونجاق نویں [۱۲] (نویاں دس ہزار سپاہ کا کھانا) اور بایجو نویں (نویان) [۱۳] شہرزوز اور دقوق کے کوہستانی راستے سے اربل جانے والی شاہراہ پر مقدمتہ الجیش کے بطور روانہ ہوئے اور میسرہ پر کیت بوقا نویں [۱۴] (نویان) اور وانکیا نوین [۱۵] (نویان) کریت اور بیات کے راستے سے آگے روانہ ہوئے اور قلب فوج میں خود بادشاہ (ہلاکو) موجود تھا۔ اس نے کرمان شاہان وحلوان کی راستے سے کوچ کیا۔ بغداد سے دوات دار کوچک (صغیر) فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور بعقوبہ [۱۶] وباجسرئ [۱۷] کے درمیان نہر دیالی [۱۸] کے کنارہ پڑاؤ کیا۔

بادشاہ (ہلاکو) نے بایجو کو حکم دیا تھا کہ دریائے دجلہ سے پار اتر کر مغربی سمت سے بغداد میں داخل ہو۔ بادشاہ نے حلوان پہنچ کر سازوسامان وہیں چھوڑ دیا (نبہ آنجا رہا کرد) اور وہاں سے سواروں کے ساتھ جریدہ روانہ ہوا۔ اس اثنا میں منگولوں کے یزک (ہراول) نے (خلیفہ کے ایک امیر) ایبک حلبی کو گرفتار کر کے (ہلاکو کے) سامنے پیش کیا۔ اس نے سچ سچ بتانے کا اقرار کیا، اس لئے اسے امان دے کر ہراول دستے میں شامل کر لیا گیا۔ (وہ منگولوں کی فوج کا رہنما بن گیا اور لشکر کے آگے آگے رہنمائی کرتا ہوا چلا)۔[۱۹]

خوارزم شاہیوں کی نسل کا ایک شاہزادہ (جوق سلطان) بھی منگولوں کے یزک (ہراول دستہ) میں موجود تھا اس نے خلیفہ کے لشکریوں کو خط لکھا کہ "ہم اور تم ایک ہی جنس سے ہیں، میں نے منگولوں کی اطاعت قبول کر کے ان کی ماتحتی اختیار کر لی ہے۔ یہ لوگ میرے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ تم لوگ بھی اپنی جانوں پر رحم کھاؤ، ان کے مطیع ہو جاؤ، تاکہ (ان کے مظالم سے) نجات پا جاؤ"۔ اس نے یہ خط قراسنقور (نامی بغدادی

امیر)[۲۰] کے نام لکھا تھا۔ وہاں سے اس کا جواب آیا کہ ''ہلا کو کیا مال ہے (ہلا کو را چہ محل باشد) کہ بنو عباس کے ساتھ جنگ کی نیت سے پیش قدمی کرے، کیونکہ اس دولت (حکومت و خلافت) نے اس جیسے بہتیرے دیکھے ہیں۔ اگر وہ صلح کا خواہاں ہوتا تو یہاں تک دھاوے مارتا نہ آتا اور خلیفہ کی مملکت کو تہس نہس نہ کرتا اب بھی اگر وہ ہمدان لوٹ جائے اور غدر خواہی کرے تو میں دوات دار کو چک (صغیر) سے سفارش کر سکتا ہوں کہ وہ خلیفہ کو صلح پر راضی کر دے'' جب یہ خط بادشاہ ہلاکو کے پاس پہنچا تو وہ ہنسا اور کہا کہ ''اللہ ہی کا حکم ہے اور جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہوگا''۔

جب سوغونجاق اور بایجو نے دریائے دجلہ پار کر لیا تو اہل بغداد کو اس کا پتا چلا۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ لشکر ہلاکو بادشاہ کا ہے جو اصل راستے سے ہٹ کر اس طرف مڑ گیا ہے چنانچہ دوات دار (صغیر) نے بعقوبہ سے لشکر کا پڑاؤ اٹھا لیا، دجلہ پار کر کے بغداد آیا اور وہاں سے دجلہ کو مغربی سمت میں کاٹ کر انبار پہنچ گیا۔ جہاں اس کا مقابلہ سوغونجاق سے ہوا جو منگولوں کی فوج کا مقدمہ تھا۔ دوات دار نے سوغونجاق کے لشکر کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ بھگوڑے منگول بایجونوین کی فوج کے قریب پہنچے تو اس نے پلٹ کر دوات دار (صغیر) پر حملہ کیا، اسے شکست دے دی اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو مار ڈالا۔ یہ شکست خوردہ سپاہ بغداد لوٹ آئی۔ (اسی دوران میں) بادشاہ ہلاکو نہر دیالی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہاں بغدادیوں نے کوئی کشتی نہ چھوڑی تھی، سو اس نے پانی میں گھوڑے ڈال دیئے، اور بغداد کے دروازے پر آ کر رکا۔ یہاں سے اس نے بوقا تیمور کو بغداد کی مغربی سمت کی جانب روانہ کیا، بادشاہ نے منتصف (پندرہ) محرم ۶۵۶ھ کو بغداد کے دروازے پر پڑاؤ کیا، اس نے حکم دیا کے بغداد کے گرداگرد دیوار تعمیر کریں جسے ان کی اصطلاح میں چپر[۲۱] کہتے ہیں۔ ایک رات دن میں اس جانب (جانب شرقی) سے ہلاکو کے لشکر نے اور بوقا تیمور، سوغونجاق و بایجونوین نے مغربی جانب سے ایک بلند دیوار تعمیر کر دی اور شہر کی جانب سے اندرونی دیوار میں ایک بڑی خندق بنا کر انھوں نے اس میں منجنیق

(قلعہ شکن سنگی آلات) نصب کیں اور جنگ کا ڈول ڈالا۔

خلیفہ نے صاحب دیوان (فخر الدین ابو طالب احمد بن دامغانی)[۲۲] اور ابن درنوس (نجم الدین الخاص عبدالغنی)[۲۳] کو تھوڑا سا تحفہ دے کر ہلاکو کے پاس روانہ کیا، کیونکہ اسے اس کے امراء نے یہ پٹی پڑھائی تھی کہ اگر بڑا تحفہ بھیجا گیا تو منگول یہ کہیں گے کہ یہ لوگ نہایت خوف زدہ ہیں، اس لئے تھوڑے سے تحفہ پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔ (جب یہ سفارت پہنچی تو) بادشاہ نے فرمایا کہ دوات دار (صغیر) اور سلیمان شاہ کیوں نہ آئے؟ خلیفہ نے جواب بھیجا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا کہ وزیر، دوات دار یا سلیمان شاہ میں سے کوئی ایک باہر آ کر اس کی خدمت میں باریاب ہو، سو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور وزیر[۲۴] کو جو ان میں سب سے بڑا تھا، بادشاہ کے ہاں بھیج دیا۔ اب بادشاہ کو بھی چاہیئے کہ اپنی بات پر قائم رہے اور ان دونوں (دوات دار اور سلیمان شاہ) کو طلب نہ کرے۔ بادشاہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ باتیں میں نے اس وقت کہی تھیں جب میں ہمدان میں تھا اب میں بغداد کے دروازہ پر مقیم ہوں اور یہ سارے واقعات گزر چکے ہیں، میں صرف ایک پر کیسے اکتفا کروں ان تینوں کو روانہ کرنا ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ جب لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بادشاہ (ہلاکو) خود شہر کی مشرقی سمت میں برج عجم[۲۵] کے مقابل پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، کیت بوقا کا لشکر اس جگہ قوس (تیر و کمان) سے جنگ کر رہا تھا۔ (دلشکر کیت بوقا آنجا بقوس جنگ می کردند) بلغائی و سجاتی شہر کے دائیں جانب تھے۔ بوقا تیمور نے مغربی سمت میں جہاں باغ بقل ہے اور سوغونجاق دبا بچونوین نے اس جانب سے جہاں سے بیمارستان عضدی[۲۶] ہے جنگ کا آغاز کیا۔ ۲۲ محرم ۶۵۶ھ سے چھ رات دن سخت لڑائی ہوئی (اس موقع پر) بادشاہ (ہلاکو) کے حکم سے یہ فرمان لکھ کر کہ ''سادات، دانش مندوں اور نصاریٰ کے علماء و عوام، مشائخ اور ان لوگوں کو جو ہمارے ساتھ جنگ نہ کریں ہماری جانب سے امان دی جاتی ہے'' تیروں میں لپٹ کر شہر میں چھ سمتوں سے پھینکوا دیا گیا۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں نے رات دن گھمسان کی

لڑائی لڑی۔ یہاں تک کہ ۲۸ رمحرم ۶۵۶ھ کو پو پھٹتے ہی (منگولوں کا) لشکر (شہر پناہ کی) دیوار تک جا پہنچا۔ سب سے پہلے منگولوں نے برج عجم پر حلّہ بولا اور اس جانب سے شہر پناہ پر چڑھ گئے۔ انہوں نے مدافعین کو پیچھے دھکیلتے ہوئے نماز پیشین (نماز ظہر) تک اس فصیل کو بغدادیوں سے چھین لیا۔ (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ) محاصرہ کے دوران میں بغداد کے مشرقی ومغربی (سمتوں میں دیوار تعمیر کرتے وقت بادشاہ (ہلاکو) نے حکم دیا تھا کہ بغداد کے نشیبی و بالائی حصوں کی کشتیوں کو پکڑ کر تمام پلوں کو بند کر دیا جائے اور منجنیق ونفطہ (آتش زنی) آلات سے مسلح دیدبان ان پر مقرر کر دیئے جائیں جب لڑائی کا زور بڑھا تو دوات دار نے چاہا تھا کہ کشتی پر بیٹھ کر نشیبی جانب بھاگ جائے منگولوں کو اس بات کا پتا چل گیا تھا۔ (این سخن بمغلولاں رسیدہ بود) انھوں نے منجنیق اور تیر چلائے تھے جس سے دوات دار (صغیر) بھاگ کر بغداد چلا گیا تھا۔ منگولوں نے اس کی تین کشتیاں چھین لی تھیں، ان میں سوار آدمیوں کو مار ڈالا تھا اور ان کے ہتھیار (ہلاکو) کی خدمت میں پیش کیے تھے (اس دارو گیر میں) علویوں کا نقیب بھی مارا گیا تھا جب (منگولوں نے) فصیل پر قبضہ کر لیا تو بادشاہ (ہلاکو) نے حکم دیا کہ اہل شہر اس کو مسمار کر دیں (اس کے بعد) قاصدوں کی آمدورفت شروع ہوئی بادشاہ نے حکم دیا کہ دوات دار (صغیر) اور سلیمان شاہ شہر سے باہر آئیں۔ خلیفہ چاہے تو باہر آئے اور نہ چاہے تو نہ آئے۔ خلیفہ نے اپنے منجھلے بیٹے [۲۷] کو دوات دار (صغیر) اور سلیمان شاہ کے ہمراہ باہر (ہلاکو کی خدمت میں) بھیجا۔ (ہلاکو کے حکم سے) دوات دار (صغیر) واپس بغداد گیا اور (ہلاکو) نے سلیمان شاہ سے کہا کہ (بغداد کے) بہت سارے سپاہی ہمارے ساتھ آملے ہیں، تم شہر میں واپس جا کر اپنے آدمیوں کو باہر لاؤ۔ (جب یہ شہر سے نکل کر ہلاکو کے معسکر میں آگئے تو) دوسرے دن ان کا کام تمام کر دیا گیا (اس دوران میں) شہر کے باشندوں نے شرف الدین مراغی [۲۸] اور شہاب الدین زنگانی [۲۹] کو ہلاکو کی خدمت میں بھیج کر امان چاہی اس کے بعد جب خلیفہ نے یہ دیکھا کہ بات بگڑ گئی ہے اور کچھ بھی باقی نہ رہا تو (ہلاکو سے) شہر سے باہر آنے کی اجازت

مانگی۔ وہ (خلیفہ) ۴ رصفر ۶۵۶ھ کو اپنے بیٹے اور خواص ائمہ وسادات ومشائخ کے ہمراہ شہر سے باہر آیا اور بادشاہ (ہلاکو) سے ملاقات کی۔ اسے منگولوں نے کلواذی [۳۰] کے دروازے (کے قریب) ٹھہرایا۔ اس کے بعد (ہلاکو) کے حکم سے شہر کو لوٹا گیا۔ بادشاہ (ہلاکو) خلیفہ کے مطالعہ خانہ میں گیا۔ ہر سمت گھوم پھر کر اس کا معائینہ کیا۔ پھر (اس کے حکم سے) خلیفہ کو حاضر کیا گیا۔ خلیفہ نے نذرانے پیش کئے۔ جو کچھ لایا گیا بادشاہ نے اسی وقت اپنے خواص، امراء، لشکریوں اور حاضرین میں تقسیم کر دیا۔ اور سونے سے بھرا ہوا ایک طباق خلیفہ کے سامنے رکھا کہ اسے کھاؤ خلیفہ نے کہا اسے کیسے کھایا جا سکتا ہے؟ اس پر ہلاکو بولا کہ ''پھر تو نے اسے کیوں حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا، اسے لشکریوں کو کیوں نہ دے دیا، اور جو یہ لوہے کے دروازے ہیں ان کے پیکان کیوں نہ بنوائے اور دریائے جیحون کے کنارے آ کر (میرا راستہ کیوں نہ روکا) تاکہ میں اس کے پار نہ اتر سکتا''؟ خلیفہ نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا کی تقدیر (حکم) یہی تھی۔ ہلاکو نے کہا کہ جو کچھ تجھ پر گزرے گی وہ بھی تقدیر الٰہی (خدا کا حکم) ہی ہوگی۔ رات کے وقت (ہلاکو) یہاں سے واپس (اپنے معسکر میں بیرون شہر) چلا گیا اور خلیفہ کو حکم دیا کہ وہ عورتیں جو اسکے اور اسکے بیٹوں کے ساتھ وابستہ ہیں (پیوستہ اند) انہیں (اس کے معسکر) میں لایا جائے۔ لوگ (منگول) خلیفہ کے محل سرا میں گھس گئے (وہاں) سات سو عورتیں اور تیرہ سو خدام تھے (انھیں پکڑ لیا گیا) اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو متفرق و منتشر کر دیا گیا۔ جب منگول شہر کو ایک ہفتے تک جی بھر کر لوٹ چکے تو (باقی ماندہ) شہریوں کو امان دی گئی [۳۱]۔ ۱۴ رصفر (۶۵۶ھ) کو بادشاہ (ہلاکو) نے شہر کے دروازے سے کوچ کیا اور خلیفہ کو بلوا بھیجا (منگول خلیفہ کو بغداد کے قریب ایک گاؤں میں [۳۲] ہلاکو کے پاس لائے) بعد ازاں اس کے منجھلے بیٹے کو پانچ، چھ خادموں کے ساتھ وہاں لائے۔

اُس دن اُسی (گاؤں) میں (خلیفہ کا) اس منجھلے بیٹے کے ساتھ کام تمام کر دیا گیا۔ ... ے دن اس کے بڑے بیٹے اور اس کے ساتھ کے لوگوں کا کلواذیٰ کے دروازے

پر خاتمہ کر دیا گیا[۳۳] اور (حرم سرائے خلیفہ کی) عورتوں اور خادموں کو آپس میں بانٹ لیا گیا۔

بادشاہ (ہلاکو) نے اس جگہ سے دوسرے دن کوچ کیا اور وزیر، صاحب دیوان اور ابن درنوس کو واپس روانہ کر دیا۔ اس نے وزیر کو منصب وزارت پر، صاحب دیوان کو اس کے عہدۂ صاحب دیوانی پر ابن درنوس کو اوزان [۳۴] کی سربراہی پر اور استو بہادر [۳۵] کو شہر کی کوتوالی (شحنگی) پر مامور کیا۔ اس نے روانگی کے وقت یہ حکم دیا کہ بغداد کو (پھر سے) آباد کریں۔ کشتوں کی لاشوں اور مردہ چوپایوں کے ڈھانچوں کو اٹھوا کر پھینکوائیں۔ اور بازاروں کو بسائیں۔ یہاں سے بادشاہ کامیاب و فتح مند سیاہ کوہ [۳۶] کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہوا (بادشاہ بمبارکی مظفر و منصور بہ سیاہ کوہ آمد) اور بوقا تیمور کو حلہ و واسط کا گورنر نامزد کیا۔ حِلہ والے پہلے ہی ہلاکو کے مطیع ہو چکے تھے[۳۷] جب بوقا تیمور وہاں پہنچا تو اس کی جانچ کی۔ (اہل حِلہ کی اطاعت شعاری کا عملی مظاہرہ دیکھا) پھر وہ وہاں سے واسط آیا[۳۸]۔ یہاں وہ ایک ہفتہ تک قتل و غارت گری کرتا رہا۔ پھر وہ (واسط سے) لوٹ کر ششتر آیا وہ اہل شہر کی اطاعت پذیری کے خیال سے شرف الدین ابن الجوزی کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ (مگر ششتر کے باشندوں نے اطاعت قبول نہ کی اور منگولوں سے ان کا مقابلہ ہوا) اور (یہاں کے) فوجی کچھ تو بھاگ گئے کچھ مارے گئے اور جو زندہ بچے وہ منگولوں کے مطیع ہو گئے [۳۹] کوفہ اور بصرہ پر چڑھائی کی غرض سے کوئی لشکر نہ گیا، کیونکہ بے لڑے بھڑے وہاں کے لوگ (منگولوں کے) مطیع ہو گئے تھے۔[۴۰ و ۴۱]

''حواشی''

[۱] اس ذیل کے عنوانات مختلف مخطوطات میں مختلف ہیں، میں نے نسخہ کتابخانہ ملی پیریس و نسخہ انڈیا آفس لندن کے عنوان کو سرنامہ قرار دیا ہے کہ وہ بایں عنوان ہے'' کیفیت واقعہ بغداد از نسخہ

مرحوم افضل العالم استاد البشر نصیر الحق والدین محمد بن محمد الطوسی رحمۃ اللہ'' مگر نسخہ ملکیتی آ قائی محمد بن عبدالوہاب قزوینی میں اس ذیل کا عنوان یوں ہے'' کیفیت فتح بغداد و واقعہ مستعصم خلیفہ وقتل ونہب آنجا منقول از نسخہ مرحوم سعید مفخر الحکماء استاد البشر خواجہ نصیر المللت والحق والدین محمد بن محمد الطوسی علیہ الرحمتہ'' یہ عنوان نیکپی بن مسعود بن محمد بن مسعود کی تاریخ میں جس کا قلمی نسخہ کتابخانہ ملی میں موجود ہے یوں ہے'' درذکر توجہ ہلاکو خان ووقائع کہ بر خلیفہ مستعصم واتباع اد واہل بغداد واقع گشت منقول از ترجمہ جہاں گشائی منقولہ از نسخہ ملک الحکماء خواجہ نصیر الدین محمد بن محمد الطوسی نور قبرہ''۔

[۲] ہلاکو خان منگول حکمران تولوی خان کا چوتھا بیٹا تھا اور یہ تولوی خان چنگیز خان کا پسر چہارم تھا۔ ۶۱۵ ھ میں پیدا ہوا۔ ۶۵۰ ھ میں اس کے بھائی منگوقا آن نے اسے بلاد غربیہ یعنی ایران، عراق، شام، مصر، روم وآرمینیہ کی حکومت عطاء کی اور اس خطے کے غیر مفتوح علاقوں کی تسخیر کا کام اس کے سپرد کیا، اس نے مراغہ کو اپنا مستقر بنایا، ملاحدۂ اسماعیلیہ کے قلعوں کو فتح کر کے ۶۵۴ ھ میں ان کے امام رکن الدین خورشاہ کو زیر کیا مگر امان دینے کے باوجود منگوقا آن کے حکم سے خورشاہ کو مع اہل خاندان قتل کر دیا گیا۔ ۶۵۶ ھ میں یہی حال بغداد کا ہوا، اور دار السلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس کے بعد ہلاکو خان کی سپاہ نے حلب وشام کے میدان مارے لیکن مصر میں پیش قدمی کے دوران میں مملوک سلطان قطز نے فلسطین میں عین جالوت کے مقام پر ۶۵۸ ھ میں اس کے سپہ سالار کیت بوقا کو عبرت ناک شکست دے کر مار ڈالا، ہزاروں منگول مارے گئے اور شام کے علاقے ان کے تصرف سے نکل گئے۔ اسی زمانے میں ہلاکو کو اپنے عمزاد برکائی خان سے کہ رئیس دشت قپچاق تھا پرخاش ہوئی اور وہ داخلی تنازعات میں الجھ گیا۔ ہلاکو کی بیوی دوقوز خاتون قوم کرایت سے تعلق رکھتی تھی اور مذہباً عیسائی تھی، اس کے اثر سے ہلاکو کے زمانے میں عیسائیوں کو بڑا عروج ہوا۔ تمام ممالک مفتوحہ میں نئے گرجا تعمیر کیے گئے، اور چونکہ یہ خاتون ہلاکو کو اس کے باپ تولوی خان سے ملی تھی اس لئے اور بھی مقتدر تھی نیز اس لئے کہ منگوقا آن نے ہلاکو کو اس سے ہر معاملہ میں مشورہ لینے کی تاکید کی تھی، حکومت کے اس امور میں اس کا بڑا عمل دخل تھا، ہلاکو ۴۸، سال کی عمر میں مراغہ کے قریب ۶۶۳ ھ میں ہلاک ہو گیا اور کوہ شاہو کے قریب دفن کیا گیا (مزید

مطالعہ کے لئے جہاں گشائی، جامع التواریخ اور وصاف وغیرہ سے رجوع کریں)۔

[۳] ملاحدہ سے اسماعیلیہ مشرق یا حسن بن صباح کے پیرو مراد ہیں، مشرق میں ان کی حکومت ۴۷۷ھ میں کہ لفظ الموت کے اعداد بھی یہی ہیں، شروع ہوئی اور ۶۵۴ھ میں ہلاکو کے ہاتھوں اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ ان کے حکمرانوں کی تعداد سات ہے جو الموت کے مرکز سے دنیائے اسلام میں ۱۷۷، سال تک قتل، غارت گری و انتشار کے بانی مبانی تھے۔ ملاحدہ پر ہلاکو کے حملوں اور ان کی تباہی میں خواجہ نصیر الدین طوسی کا بھی ہاتھ ہے کہ وہ شروع شروع انہیں کے دربار سے وابستہ تھے اور بغداد میں ہلاکو کے ناک کے بال بن گئے تھے۔ انھوں نے ملاحدہ کی تاراجی پر جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اسے جامع التوریخ سے نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا فرماتے ہیں:

سال عرب چو ششصد و پنجاہ و چار شد
یکشنبہ اول مہ ذی القعدہ بامداد
خور شاہ پادشاہ سماعیلیاں زتخت
برخاست پیش تخت ہلاکو بایستاد

(مزید مطالعہ کی غرض سے جہاں گشائی جوینی جلد سوم، جامع التوریخ رشید الدین جلد سوم، تاریخ وصاف اور دیگر قدیم مآخذ سے رجوع کریں)

[۴] خواجہ کے اس بیان کی تائید جامع التوریخ سے نہیں ہوتی کہ ہلاکو نے ملاحدہ پر حملہ کے وقت خلیفہ سے مدد طلب کی تھی۔ البتہ ملاحدہ کی بربادی کے بعد ہمدان سے طویل مراسلت کا سلسلہ فریقین میں ضرور شروع ہوا اور اپنے خطوط میں ہلاکو نے وزیر، دواتدار اور سلیمان شاہ کی حاضری کا اس غرض سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خلیفہ تک اس کی بات صحیح صحیح پہنچا دیں اور خلیفہ اس کا مطیع ہو جائے، خواجہ کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل بحث ان تین امراء میں سے کسی ایک کے ہمدان بھیجنے سے متعلق تھی، حالانکہ اصل مسئلہ خلیفہ کی اطاعت، بغداد کی فصیلوں کا انہدام اور سپاہ کا علیحدہ کر دینا تھا۔ (مزید تفصیل کے لئے جامع التوریخ جلد سوم صفحات ۳۹ بعد کا مطالعہ مفید ہوگا۔ خواجہ کی اختصار پسندی نے بعض واقعات میں الجھاؤ پیدا کر دیا ہے)۔

[۵] موید الدین ابو طالب محمد بن احمد علقمی ادب کتابت و مراسلہ نگاری میں ممتاز تھا، کتابوں کا شوقین تھا اور اس کا نجی کتب خانہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، وہ علماء کی سرپرستی کے لئے بھی شہرت رکھتا تھا، اور ابن ابی الحدید سے نہج البلاغۃ کی ضخیم شرح اُسی نے لکھوائی تھی۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ نے اپنے باپ کے وزیر نصر الدین احمد کے انتقال کے بعد اسے وزارت کے منصب پر فائز کیا اور وہ انتزاع خلافت عباسیہ تک اس عہدہ پر بنا رہا۔ خلیفہ کی شہادت اور اس کے خاندان کی تباہی کے بعد بھی ابن العلقمی ۲ ر جمادی الآخرہ ۶۵۶ھ یعنی سقوط خلافت کے چار ماہ بعد اپنی موت تک منگولوں کی جانب سے بغداد کا وزیر رہا۔ اس کی موت کے بعد یہ منصب اس کے بیٹے شرف الدین ابو القاسم کو عطاء کیا گیا۔ بغداد پر ہلاکو کے قبضے کے بعد جب شہر میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا وہی وزیر تھا، ابن العلقمی پر عباسی عہد کے مورخین غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ وہ در پردہ ہلاکو سے ملا ہوا تھا۔ اور خلیفہ کی باتوں سے اُسے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے بغداد کی سپاہ کو منتشر کرایا تھا۔ اپنے غلط مشوروں سے خلیفہ کو تاریکی میں رکھا۔ اور بغداد پر ہلاکو کو آسانی سے قابض کرا دیا، اس کے بعد اس نے اہل بغداد کے قتل عام میں حصہ لیا اور خلیفہ کو مروانے میں بھی اس کا مشورہ شامل تھا۔ ابن خلدون نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خلیفہ کی لاش پر بھی ابن العلقمی کو ترس نہ آیا اور اس نے اسے اپنے پاؤں سے روند کر دشمنی کی آگ بجھائی۔ ابن الطقطقی نے الفخری میں ابن العلقمی کے خلاف اس الزام کا ذکر کیا ہے، مگر اس کی صحت سے اس بناء پر انکار کیا ہے کہ اگر وہ غدار ہوتا تو ہلاکو جیسا شخص اس پر اعتماد کر کے اس کے درجات بلند نہ کرتا۔ ابن الطقطقی کی یہ دلیل عجیب ہے کہ جو بات الزام کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے اُسی سے وہ الزام کی تردید کرنا چاہتا ہے۔ یہ اعتماد جو ابن العلقمی پر ہلاکو کو تھا وہ اس کی وفاداری و خلافت کے خلاف سازش کا ثمرہ ہی تو تھا، منگولوں کے مورخ رشید الدین کو اس امر کا اقرار ہے کہ خواجہ طوسی نے ہلاکو کو خلیفہ کے قتل اور بنو عباس کی بربادی کا مشورہ دیا تھا۔ ابن الطقطقی نے بھی خواجہ کا نام لئے بغیر اس کا اعتراف کیا ہے، یہ بھی مسلم ہے کہ وزیر اور خواجہ میں گاڑھی چھنتی تھی اور دوران محاصرہ ان کی طویل ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ بغداد کے امراء بھی شہر کی تباہی سے کم از کم دو سال پہلے یعنی

۶۵۴ھ میں بھی ابن العلقمی پر ہلاکو سے ساز باز اور منگولوں کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام لگاتے تھے اور رشید الدین نے بھی اس کا جابجا ذکر کیا ہے۔ خواجہ بھی دبی زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں، اس لئے ابن العلقمی پر خلافت کی تباہی، بغداد کی بربادی اور مسلمانوں کے قتل عام کی سازش کا الزام درست معلوم ہوتا ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے الفخری ص ۱۰۲، ۲۴۹۔ جامع التواریخ ج ۳ :ص ۳۹، ۴۰، ۴۱۔ وبعد ابن خلدون بر موقع و وصاف وغیر ذلک)

[۶] ذیل کے تینوں نسخوں میں ''استران'' بمعنی خچر ہے۔ مگر ذیل کے عربی ترجمہ یعنی ابن العبری کی مختصر الدول میں اس کا ترجمہ ''البغال والجمال'' ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن العبری کے مطالعہ میں جو نسخہ ہوگا اس میں یہ لفظ بے نقطہ ہوگا یعنی ''اسراں'' اس لئے اس نے اس لفظ کو ''اشتران داستران یعنی الجمال والبغال یعنی اونٹ اور خچر سمجھا۔ میں نے بھی ترجمہ میں ابن العبری کی محتاط روش کی پیروی کی ہے۔

[۷] امیر الحاج، مقدم الجیوش مجاہد الدین ابوالمیامن ایبک المستنصری معروف بہ دوات دار صغیر یا کوچک ابتداء میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے خواص وابستگان میں تھا۔ مستعصم باللہ کے عہد خلافت میں ترقی کر کے اس کی خلافت کے اہم اشخاص اور ارکان دولت میں محسوب ہوا۔ ۶۳۲ھ میں موصل کے حکمران بدرالدین لولوء کی صاحبزادی اس کے حبالۂ عقد میں آئی۔ بغداد پر منگولوں کی چڑھائی کے دوران میں اس نے بڑی بہادری سے شہر کا دفاع کیا۔ اور ہلاکو کی دست و برد سے خلیفہ کو محفوظ رکھنے میں سردھڑ کی بازی لگادی، ۱۶ر صفر ۵۶ھ کو ہلاکو کے حکم سے شہید کر دیا گیا۔ اس کی یادگار ایک بیٹا جلال الدین نامی تھا جسے منگول اپنے ساتھ لے گئے اور انہیں کی نگرانی میں اس کی پرورش ہوئی مگر وہ ان وحشیوں کی قید سے بھاگنے کی گھات میں لگا رہا۔ آخر ۶۶۲ھ میں مشہد امام حسین کی زیارت کے بہانے اپنے متعلقین کے ساتھ بغداد سے نکلا اور بھاگ کر شام چلا گیا۔ جہاں ممالیک مصر کی عملداری تھی۔ (دوات دار صغیر کے حالات کے لئے جامع التواریخ طبقات ناصری وصاف، الفخری، تاریخ ابوالفداء اور سبکی کی طبقات الشافعیہ کا مطالعہ مزید معلومات کے لئے مفید ہوگا)۔

[۸]   خواجہ طوسی نے یہاں ''ترکان'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ترکوں سے مراد منگول ہیں کیونکہ شروع شروع لوگ منگولوں کو ترکوں ہی کا ایک گروہ سمجھتے تھے اور ان دو قوموں میں فرق انھیں معلوم نہ تھا۔ ابن العبری کی مختصر الدل مطبوعہ بیروت ۱۸۹۰ء میں فارسی عبارت کا جو ترجمہ ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وہاں منقول ہے کہ (وزیر تاتاریوں کے ساتھ اپنا کام بنا رہا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے سپرد کردے)

[۹]   شہاب الدین سلیمان شاہ ابن برجم ترکوں کے مشہور قبیلہ ایوہ کا سردار تھا۔ اس کا قبیلہ کردستان ولرستان کے علاقے میں اقامت پذیر تھا۔ سلیمان شاہ کردستان کا حاکم تھا اور اس کا مستقر قلعہ بہار یا وہار تھا۔ اسے اس خطے کی سیاست میں بڑا دخل رہا ہے اور ۶۱۰ھ تا ۶۵۲ھ کے اہم واقعات میں اس کا ذکر بار بار آتا ہے۔ سلطان جلال الدین منکبرنی سے بھی اُس کے تعلقات رہے ہیں اور سلطان سے ۶۲۱ھ میں اس کی بیٹی کا نکاح بھی ہوا خلیفہ المستنصر کے دور میں اس کی اہمیت بڑھی اور قرب اور جوار کے امراء و حکام کے ساتھ اس کے تعلقات مصاہرت مستحکم ہوئے اپنی عمر کے آخری بیس سالوں میں وہ بغداد ہی میں رہا اور وہاں کی سیاست میں اسے ایک اہم مقام حاصل رہا۔ خلیفہ المستعصم کے ارکان دولت میں اس کا مرتبہ نہایت بلند تھا اس لئے ہلاکو اسے گرفتار یا مطیع بنانے کی غرض سے اس کی حاضری کا بار بار مطالبہ کرتا رہا تاکہ اس کے ہٹتے ہی خلیفہ کی قوت ٹوٹ جائے۔ آخر بغداد کے سقوط کے بعد دوات دار صغیر کے ہمراہ حسب الطلب ہلاکو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور حکم دیا کہ شہر میں جا کر اپنے اہل و اعیال و متعلقین کو لے کر معسکر شاہی میں آئیں۔ یہ دونوں مطمئن ہو کر واپس بغداد گئے اور جب اپنے آدمیوں کے ہمراہ ہلاکو کے لشکر میں واپس آئے تو روز جمعہ ۱۶/ صفر ۶۵۶ھ کو انہیں شہید کر دیا گیا۔ سلیمان شاہ کے ساتھ اس کے تمام متعلقین کو مروا دیا گیا۔ سلیمان شاہ عالم فاضل اور فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ مزید حالات کے لئے دیکھئے۔ راوندی کی راحۃ الصدور، ابن اثیر کی تاریخ، نسوی کی سیرۃ جلال الدین منکبرنی، جوینی کی جہاں گشائی، منہاج کی طبقات ناصری، جامع التوریخ دو صاف)۔

[۱۰] درنکی، کا لفظ مختلف نسخوں میں مختلف املاء سے لکھا گیا ہے اور یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحیح لفظ کیا ہے۔

[۱۱] یہ صاحب مشہور محدث، مورخ، واعظ و مصنف شیخ جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ کے پوتے اور محی الدین ابو محمد یوسف مقتول ۶۵۶ھ کے بیٹے ہیں۔ان کے والد محی الدین خلیفہ المستعصم کے استاد دار یعنی خلیفہ کے ذاتی آمد و خرچ کے نگران اور اس کے حساب کتاب کے ذمہ دار یا عہد حاضر کی اصطلاح میں ناظر تھے اور ساتھ ہی ساتھ مدرسہ مستنصریہ میں فقہ حنبلی کی تدریس اور بغداد کے شعبۂ احتساب سے بھی وابستہ تھے۔ ۱۳/ذی القعدہ ۵۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد کے سقوط کے وقت اپنے اہل خاندان کے ساتھ ۶۵۶ھ کے اوائل میں شہید ہوئے ان کے بیٹے شرف الدین عبداللہ ابن الجوزی جن کا خواجہ طوسی کی تحریر میں ذکر ہے۔ مدرسہ بشیریہ میں مدرس اور بغداد میں منصب احتساب پر فائز تھے۔ ہلاکو کے ہاں خلیفہ کے سفیر کی حیثیت سے کئی بار گئے اور بغداد کے محاصرہ کے دوران میں منگول سردار بوقا تیمور کے ساتھ ششتر اور خوزستان بھیجے گئے تا کہ وہاں کے لوگوں سے منگولوں کے آگے ہتھیار ڈلوادیں وہ بغداد کے سقوط کے ایک ماہ بعد شہر میں واپس آئے مگر بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ بغداد کے قتل عام میں شہید ہوئے۔ بہر کیف خواجہ طوسی جو فتح بغداد کے وقت موجود اور واقعہ کے عینی شاہد ہیں ان کا بیان دوسروں سے زیادہ معتبر ہے انھیں شرف الدین عبداللہ ابن الجوزی کے ایک اور بھائی جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن بن محی الدین یوسف بن جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی الکبیر تھے۔ یہ بھی مدرسہ مستنصریہ بغداد کے مدرس، واعظ اور بغداد کے محتسب تھے واقعۂ بغداد میں یہ بھی شہید ہوئے مشہور فارسی شاعر و نثر نگار شیخ سعدی شیرازی کے استاد یہی ہیں نہ کہ ان کے جد امجد جو انھیں کے ہم نام، ہم کنیت و ہم لقب ہیں (مزید مطالعہ کی غرض سے الفخری، جامع التواریخ و مختصر طبقات حنابلہ سے رجوع کیجئے)۔

[۱۲] سوغونجاق، (سوقونجاق، سقنجاق) نوین سدون نویان کا بیٹا اور منگولوں کے قبیلے سدون سے تعلق رکھتا تھا۔ ہلاکو کے ہمراہ ۶۵۱ھ میں ایران آیا اور تمام جنگوں میں اس کے ساتھ رہا۔

ابا قاخان بن ہلاکو کے دور میں منصب نیابت خصوصاً بلاد فارس و بغداد کی امارت پر فائز رہا۔ عطا ملک جوینی اس کی نیابت میں بغداد کا حاکم تھا۔ ارغون بن ابا قاخان کے عہد حکومت میں فوت ہوا۔ (جہاں کشائی، جامع التواریخ، وصاف و مختصر الدول میں اس کا ذکر کسی قدر موجود ہے)۔

[۱۳] بایجو نوین منگولوں کے قبیلے یسوت سے تعلق رکھتا تھا اسے اوکتائی قاآن نے ۶۴۰ھ میں سلاجقہ روم کے خلاف مہم پر روانہ کیا اس نے سلطان غیاث الدین کیخسرو ثانی کو ۶۴۱ھ میں شکست دے کر ممالک روم پر قبضہ کرلیا۔ ۶۵۰ھ میں جب ہلاکو نے بلاد غربی (ایران، عراق و شام) کی جانب پیش قدمی کی تو منکوقاآن کے حکم سے بایجو اس کی کمک پر بھیجا گیا۔ مگر ہلاکو نے اسے پھر بلاد روم کی مکمل تسخیر اور شام کی مہم کا حکم دے کر وہاں سے روانہ کر دیا۔ وہ یہاں سے ۶۵۴ھ یا ۶۵۵ھ میں فارغ ہو کر بغداد کی تسخیر میں شریک ہوا، اس کے بعد تسخیر شام کی مہم پر ہلاکو کے ہمراہ گیا۔ مگر بعد میں ہلاکو نے اسے قتل کروادیا (مزید مطالعہ کی غرض سے ابن بی بی کا سلجوق نامہ، ابن العبری کی مختصر الدول اور رشید الدین کی جامع التواریخ سے رجوع کریں)

[۱۴] کیت بوقا نویان کا تعلق قوم قایمانؓ سے تھا۔ منگول بادشاہ منکوقاآن کے ہاں وہ منصب باورچی گری پر فائز تھا۔ جب ہلاکو کو بلاد غربی جیحوں کی تسخیر و انصرام کی غرض* سے روانہ کیا گیا۔ تو کیت بوقا کو اس کے مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر جمادی الآخرہ ۶۵۰ھ میں ملاحدہ کے خلاف بھیجا گیا ملاحدہ کی شکست اوران کے قلعوں کی پائمالی میں اسے نمایاں مقام حاصل ہوا، پھر بغداد کی فتح میں ہلاکو کے ساتھ رہا۔ بعد ازاں شام وحلب کے معرکوں میں شریک ہوا۔ ۶۵۸ھ میں مصر کے مملوک سلطان قطز کے خلاف معرکہ عین جالوت میں منگولوں کا قائد رہا اسی معرکہ میں اسے شکست ہوئی اور گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اس کی ہلاکت کا ہلاکو کو بڑا صدمہ ہوا۔ (مزید مطالعہ کی غرض کی جہاں کشائی و جامع التواریخ سے رجوع کیجئے)۔

[۱۵] الکیانوین۔ صحیح نام ایلکا نوین ہے۔ مشہور منگول سردار تھا۔ ہلاکو کے اس دربار میں یہ شریک تھا جس میں بغداد کی فتح کی تجویز طے ہوئی تھی اوراس کے ساتھ ہمدان سے بغداد جانے والی فوج میں یہ شامل تھا۔ کیت بوقا کی ہلاکت کے بعد اسے شام پر چڑھائی کے لئے بھیجا گیا مگر مصر

کے سلطان بیبرس بندوق داری کے مقابلہ سے کترا کر ایلکا دیار روم چلا گیا اور وہاں سے دیار بکر کی سمت مڑ گیا غرض اہم معرکوں میں شریک رہا۔ ہلاکو کی ہلاکت کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین اباقا خان کو رسم منگولی کے مطابق اسی نے آش وشراب پیش کی اور باپ کی ہلاکت کی تفصیل بتائی۔ (جہاں کشائی او۔ جامع التواریخ میں اس کے حالات جستہ جستہ برمواقع متعدد ملتے ہیں)

[۱۶] بعقوبہ ایک مشہور قصبہ ہے جو بغداد سے خانقین جانے والی شاہراہ پر شمال مغربی سمت میں دس فرسنگ کے فاصلے پر دریائے دیالی کے کنارے واقع ہے۔(معجم البلدان ،مما صدا الا طلاع و نزہتہ القلوب)

[۱۷] باجسری یا باجسرا ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کا اب پتا نہیں چلتا۔ یہ بغداد کے شمال مشرق میں نوفرسنگ کے فاصلہ پر بعقوبہ کے جنوب میں دریائے دیالی کے کنارے آباد تھا۔(مراجع مذکور الصدر)

[۱۸] دریائے دیالی یا دیالہ مشرقی دجلہ کی ایک مشہور شاخ ہے جو کردستان کے پہاڑوں سے نکل کر خانقین کے قریب سے گزرتی ہے اور بغداد کے مشرقی مضافات کو سیراب کرتی ہوئی اس کے جنوب میں ایک فرسنگ کے فاصلے پر دریائے دجلہ سے مل جاتی ہے۔ اس دریا کو نہر نامرا، نہر بعقوبہ اور آب نہروان بھی کہا گیا ہے۔(بحوالہ مراجع حاشیہ نمبری ۱۶، ۱۷)

[۱۹] عباسیوں کے طلایہ میں صرف ایک حلبی نہ تھا بلکہ ایک دوسرا امیر سیف الدین قلیج بھی تھا اور دونوں ہی گرفتار ہو کر ہلاکو کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر سیف الدین قلیج نے منگولوں کی اطاعت قبول نہ کی ۔(جامع التواریخ:۳:۵۳)۔

[۲۰] قراسنقور کا تعلق دشت قبچاق سے تھا۔ وہ فوج بغداد کا افسر طلایہ تھا۔ دوات دار صغیر اور بوقا تیمور کی جنگ میں قراسنقور بغدادی فوج کے ایک حصہ کا امیر تھا اور اس نے بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی۔(جامع التواریخ جلد۳،ص ۵۵)۔

[۲۱] چپر۔ مطلق دیوار یا ایسی دیوار جو لکڑی اور بھونسہ سے تیار کی جائے۔(برہان قاطع)

[۲۲] صاحب دیوان۔ فخر الدین ابو طالب احمد الدامعانی المستنصر اور المستعصم کے درباروں

میں بڑا رودار امیر تھا۔ ۶۲۶ ھ میں المستنصر کے ہاں سے سلطان جلال الدین منکبرنی کے پاس جو سفارت گئی تھی اس میں فخر الدین بھی شامل تھا وہ ۶۴۳ ھ میں المستعصم کا صاحب دیوان مقرر ہوا، اور حکومت کے مالی امور کا انصرام اسے تفویض ہوا۔ سقوط بغداد کے بعد ہلاکو نے اس کے منصب پر اسے برقرار رکھا بلکہ شہر میں قتل عام کے دوران میں اس کے گھر کو پناہ گاہ کی حیثیت حاصل رہی اور ہزاروں آدمیوں نے یہاں پناہ لے کر اپنی جان بچائی۔ ۶۵۷ ھ میں حساب فہمی کے لئے ہلاکو نے طلب کیا، اس کے دشمنوں نے ہلاکو تک یہ خبر پہنچائی کہ صاحب دیوان نے خلیفہ شہید کے ایک قریبی شخص کو جو مداین کی جیل میں قید تھا خفیہ طور پر شام پہنچا دیا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس پر بھاری جرمانہ لگا کر ارومیہ کے مقام اشنہ کے زندان خانہ میں قید کر دیا گیا۔ جہاں اس نے ۶۵ سال کی عمر میں جہان فانی کو الوداع کہا۔ (مزید مطالعہ کے لئے جہاں کشائی جلد سوم مختصر الدول، حوادث الجامعہ و جامع التواریخ جلد سوم دیکھئے)۔

[۲۳] عبد الغنی بن الدرنوس نجم الدین الخاص۔ المستعصم کے مقربان خصوصی میں تھا۔ وہ ابتداء میں معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ اور بغداد میں خشت پزی سے روزی کماتا تھا۔ المستنصر کے زمانے میں شاہی کبوتروں کے ایک برج کا نگران ہوا۔ المستعصم کے دور میں ترقی کر کے رئیس البراجین یعنی شاہی کبوتروں کا نگران اعلیٰ مقرر ہوا۔ پھر ترقی کے میدان مارتا ہوا حاجب دربار، نجم الدین الخاص اور خلیفہ کی ناک کا بال ہو گیا۔ جملہ امور مالی اس کے مشورے سے انجام پانے لگے اور ارکان خلافت و خلیفہ کے مابین اس کی حیثیت واسطہ کی ہو گئی کہ اسے بیچ میں ڈالے بغیر خلیفہ سے مطلب براری آسان نہ رہی۔ سقوط بغداد کے بعد بھی اس کے اعزاز میں کمی نہ آئی اور وہ خازن دیوان و بعد ازاں خازن کارخانہ مقرر ہوا، یہ منصب منگولوں کے ہاں بڑا اہم سمجھا جاتا تھا اور اس پر بڑے اہم شخص کا تقرر کیا جاتا تھا۔ نجم الدین الخاص ۶۷۷ ھ میں اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہا۔ بغداد میں فوت ہوا اور اپنی نجی رہائش گاہ میں پیوند زمین ہوا۔ ابن الدرنوس جیسے بازاری آدمی کے المستعصم کے ہاں نوازے جانے اور ترقی درجات پر ابن الطقطقی نے بڑی لے دے کی ہے اور خلیفہ کی سفلہ پروری کا مذاق اڑایا ہے، مگر ہلاکو اور اس کے جانشینوں کے ہاں ابن

الدرنوس کی عزت افزائی اور ترقیٔ منازل کے بارے میں، جو ابن الطقطقی کے نزدیک بڑے لائق حکمران تھے، اس کا قلم خاموش ہے۔ میرے خیال میں ابن الدرنوس عامی تھا، لیکن باصلاحیت ضرور تھا اور اس کی ذاتی قابلیت نے اسے خشت پزی کی کیچڑ سے نکال کر کبوتران شاہی کے برج تک پہنچایا پھر قربت شاہی، حجابت و واسطہ کی بلندیوں تک پہنچا اور منگولوں نے بھی اس سے مالیات کی خدمات لیں۔ اور اس کے بعد نہایت اہم ذمہ داری شاہی صنعت وحرفت کی تنظیم اور صناع اور کاریگروں کی تربیت ونگہداشت پر مامور کیا (نجم الدین الخاص کے متعلق مزید تفصیلات کے لئے الفخری، حوادث الجامعہ، مختصر الدول اور جامع التواریخ کا مطالعہ مفید ہوگا)۔

[۲۴] خواجہ کے بیان سے وزیر خلیفہ کے ہلاکو کے ہاں جانے کا پتا نہیں چلتا ہاں خلیفہ کے بیان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وزیر ہلاکو کے معسکر میں جا چکا تھا۔ وسط محرم میں محاصرہ کے آغاز سے وزیر قاصد کی حیثیت سے کئی بار ہلاکو کے پاس گیا اور خواجہ سے کہ لشکر منگول میں موجود تھے۔ اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور گمان غالب یہ ہے کہ وہ خواجہ کے توسط سے خلیفہ کے خلاف سازش میں شریک تھا۔ اس لئے خواجہ نے اس کی آمد کا تصریح ذکر نہیں کیا ہے یا پھر حسب عادت ایجاز و اختصار سے کام لے کر وزیر کی آمد ورفت کے ذکر سے احتراز کیا ہے۔

[۲۵] برج عجم یا برج عجمی۔ بغداد کے مشرقی حصے میں تھا اور نسبتہ اس کی بلندی دوسرے برجوں سے کم تھی۔ یہ برج شمالی سمت میں باب الحلبہ (باب الطلسم) اور جنوبی سمت میں باب الکلواذی (باب الشرقی) کے مابین واقع تھا۔ چونکہ شہر پناہ کا یہ برج زیادہ اونچا نہ تھا۔ اس لئے منگول سردار ہلاکو نے اس کے سامنے پڑاؤ کیا تھا۔ اور اسی جانب حملہ کا زور بھی زیادہ تھا۔ (مختصر الدول، حوادث الجامعہ، الفخری، جامع التواریخ اور گائی لی اسٹرینج کی ''بغداد بعہد عباسیاں'' بزبان انگریزی)

[۲۶] بیمارستان عضدی، مشہور بویہی امیر عضد الدولہ دیلمی (۳۶۷ھ تا ۳۷۲ھ) کا تعمیر کردہ یہ شفاخانہ مغربی بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا۔ (مقدسی، یاقوت، ابن خلکان، لی اسٹرینج کی، ''بغداد بعہد عباسیاں'')۔

[۲۷] المستعصم کے تین بیٹے تھے۔ بڑا الامیر الکبیر ابو العباس احمد، اسے عوام ابوبکر کہتے تھے کیونکہ کرخ کے شیعوں کے خلاف تادیبی کاروائی اسی سے منسوب کی جاتی ہے، سو یا تو شیعوں نے طنزاً اسے 'ابوبکر' کا لقب دیا یا پھر سنیوں نے شیعوں کی پامالی پر اس کی عزت افزائی کی غرض سے اسے اس نام سے موسوم کیا۔ ابو العباس ۴ر صفر ۶۵۶ھ کو اپنے والد، بھائیوں اور تین ہزار سادات، ائمہ، قضاۃ، اکابر داعیان کے ہمراہ ہلاکو کے معسکر میں آیا۔ اور ۱۴ر صفر کو باپ اور پانچ خدام کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جو عباسی بھی ہاتھ لگا شہید کر دیا گیا۔ خلیفہ کا دوسرا بیٹا الامیر الاوسط ابو الفضائل (یا حسب روایت رشید الدین ابو الفضل) عبد الرحمٰن جس کا متن زیر تحشیہ میں ذکر ہے بڑا بہادر اور با صلاحیت تھا۔ ہلاکو کے سامنے جب اسے پیش کیا گیا تو وہ بھی اس کی جرات اور شجاعت و قابلیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بھی باپ کے ساتھ ۴ر صفر کو ہلاکو کے معسکر میں آیا اور گرفتار ہوا اور بروز جمعہ ۱۶ر صفر ۶۵۶ھ کو درجہ شہادت پر فائز ہوا خلیفہ کا تیسرا بیٹا الامیر الصغیر ابو المناقب مبارک بھی باپ کے ساتھ منگولوں کی قید میں آیا۔ اسے ہلاکو کی بیوی اولجائی خاتون نے جان بخشی کرا کے مراغہ بھجوا دیا۔ خواجہ طوسی کو اسکی تربیت کا حکم دیا اور اس کی شادی ایک منگول خاتون سے کر دی جس سے اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ خلیفہ کی بیٹیاں منگولوں کے ہاتھوں اسیر ہوئیں اور بعد میں ان کی شادیاں مسلمان امراء کے بیٹوں سے کی گئیں۔ (جامع التواریخ ۳: ۵۹ تا ۶۱ والفخری ۲۴۴)۔

[۲۸] شرف الدین مراغی بغداد کے رد داروں میں شمار ہوتا تھا اس لئے ہلاکو کی خدمت میں اہل شہر کے لئے امان طلب کرتے وقت معززین کی جماعت میں شامل تھا۔ اس کا جستہ جستہ حال مختصر الدول اور جامع التواریخ میں ملتا ہے مگر تفصیل کہیں نہیں ملتی۔

[۲۹] شہاب الدین ابو المناقب احمد بن محمود الزنجانی بغداد کے مشہور عالم تھے۔ مدرسہ مستنصریہ و مدرسہ نظامیہ میں وقفہ وقفہ سے منصب تدریس پر فائز رہے۔ سقوط بغداد کے وقت وہ قاضی القضاۃ تھے علم تفسیر میں صاحب تصنیف تھے اور خلیفہ ناصر لدین اللہ سے روایت حدیث کے اجازت یافتہ، سقوط بغداد کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسی سال یعنی ۶۵۶ھ میں وفات پائی (مختصر الدول، جامع

التواریخ، حوادث الجامعہ اور سبکی کی الطبقات الشافعیہ میں قاضی زنجانی کے حالات ملتے ہیں)۔

[۳۰] دروازہ کلواذی۔ کلوواذی نامی قصبہ بغداد کے مضافات میں بڑی پر فضا بستی اور شہر کی تفریح گاہ تھا۔ فصیل کا یہ دروازہ اسی بستی کے مقابل تھا اسی لئے اس کی نسبت سے پکارا جاتا تھا۔ یہ دروازہ مشرقی بغداد میں فصیل کے جنوب مغربی ضلع کے آخری سرے پر دریائے دجلہ کے متصل واقع تھا۔ اسے باب الشرق بھی کہتے تھے حالانکہ یہ دروازہ اپنے موقع کے لحاظ سے دروازہ جنوبی تھا۔ (معجم البلدان، مراصد الاطلاع، مختصر الدول، الفخری، جامع التواریخ و بغداد بعہد عباسیاں)

[۳۱] ۴ رصفر سے پہلے شہر کے باہر جو میدان کارزار گرم رہا اس میں اَن گنت جانیں گئیں۔ اس دوران میں ہلاکو نے دوات دار اور سلیمان شاہ کو جھوٹی تسلی دے کر شہر میں واپس بھیجا کہ اپنے آدمیوں کو لے کر باہر آئیں تاکہ انھیں شام روانہ کیا جائے۔ اس فریب میں آکر بقول رشید الدین ''خلقے بے اندازہ'' گلو خلاصی کی امید میں شہر سے باہر دواتدار اور سلیمان شاہ کے گرد جمع ہو گئی۔ ان سب کو ہزار، سو اور دس کی ٹولیوں میں بانٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پھر دواتدار اپنے تبعین و متعلقین کے ساتھ ۱۶ رصفر کو اور بعد ازاں سلیمان شاہ سات سو افراد کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔ اسی طرح ۴ رصفر کو ہلاکو نے خلیفہ کو طفل تسلی دے کر یہ اعلان کرا دیا کہ لوگ ہتھیار ڈال دیں اور شہر سے نکل آئیں تاکہ انھیں شمار کیا جا سکے۔ جب لوگ اس وعدہ پر باہر آئے تو ان سبھوں کو منگولوں نے تہہ تیغ کر دیا۔ خلیفہ کی گرفتاری کے بعد ۷ رصفر ۶۵۶ھ کو باقاعدہ قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوا۔ منگولوں کے مورخ رشید الدین کا مجبور قلم صرف اتنا لکھ کر دریا کو کوزہ میں بند کر گیا ہے ''لشکر بیک بار در شہر افتادند و تر وخشک می سوختند مگر خانہء معدودے چند از ارکاوناں و بعضے غرباء'' (یعنی منگولوں کا لشکر یک بارگی ہلہ کر کے شہر میں گھس آیا۔ جو بھی ہاتھ لگا اسے انھوں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ صرف عیسائی پادریوں اور بعض باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے گھر اس لٹس سے بچ سکے)۔ مختصر یہ کہ شہر خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ قصر خلافت کی غارت گری پر منگول سردار سونجاق مامور ہوا تھا اس نے سب کچھ ضبط کر کے شہر سے باہر معسکر منگول میں بھجوا دیا اور چھ سو سال کے طویل عرصے میں جو زر و مال اکٹھا کیا گیا تھا اسے انبار کر کے بغداد کے باہر لے جایا گیا۔ شہر کے

بیشتر محلے اور مقدس مقامات جلا دیئے گئے۔ انہیں میں بغداد کی جامع مسجد، امام موسیٰ کاظم اور امام محمد جواد کا روضہ اور رصافہ کے مقابر بھی تھے جن کی بے حرمتی کی گئی اور جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ شہر کے علماء، مشائخ و سادات کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ صرف خلیفہ کے ہمراہ ہلاکو کے ہاں جانے والے ایسے تین ہزار معززین کو ۱۵ رصفر کو باب کلواذیٰ کے سامنے موت کی نیند سلا دی گئی۔ خاندان عباسی کا جو نام لیوا ملا اسے تلوار کی دھار پر رکھ لیا گیا۔ اس خاندان کے صرف معدودے چند افراد جو کسی شمار قطار میں نہ تھے جان سلامت لے جا سکے۔ خلیفہ کے بڑے بیٹے احمد کو باپ کے ساتھ شہید کیا گیا۔ اور دوسرے بیٹے عبدالرحمٰن کو اس کے تیسرے دن یعنی ۱۶ رصفر کو ابدی نیند سلا دی گئی۔ بیس لاکھ آبادی کا شہر اپنی اسی فیصد ۸۰ آبادی سے محروم ہو گیا، شہر کی عالی شان عمارتیں، باعظمت مساجد اور مقدس روضے زمین دوز کر دیئے گئے بیشمار کتابیں جلا دی گئی اور دارالسلام، قبۃ الاسلام و مرکز خلافت تہس نہس ہو گیا۔ اتابکان شیراز کے مدح خواں سعدی، جس کا آقا منگولوں کا نمک خوار تھا اور جس نے بغداد کی تباہی پر ہلاکو کو مبارکباد دینے کی نیت سے مراغہ کا سفر کیا تھا، اس واقعہ پر چیخ اٹھا اور عربی اور فارسی میں نہایت جاں سوز و دل دوز مراثی لکھے:

آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں
برزوال ملک مستعصم امیر المومنیں
اے محمدؐ گر قیامت سربروں آری زخاک
سربروں آرو قیامت و رمیان خلق بیں

جب شہر میں لاشوں کے انبار لگ گئے، بدبو سے شہر کے باہر ٹھہرنا بھی ممکن نہ رہا تو ہلاکو نے وہاں سے اپنا پڑاؤ اٹھایا اور دیہہ وقف وجلابیہ میں چندے رک کر خلیفہ واعیان خلافت کا کام تمام کیا اور پھر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ان حالات میں خواجہ کا فرمانا کہ اہل شہر کو امان دی گئی اور شہر کی آبادی کا حکم دیا گیا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

سے زیادہ نہیں۔ بغداد کی لوٹ مار کا مال آذر بائی جان کے علاقہ کوہ تلہ پر کہ اورمی وسلماس کی ندی پر تھا، ایک مضبوط وبلند عمارت بنوا کر محفوظ کر لیا گیا۔ (تفصیل کے لئے رشید الدین کی جامع التواریخ وصاف اور دوسری معاصر کتب سے رجوع کریں)۔

[۳۲] جامع التواریخ (۳: ۶۰، ۶۱) کے مطابق ہلا کو انسانوں اور جانوروں کی لاشوں سے پھیلی ہوئی بدبو اور وباء کے باعث بیرون بغداد سے اٹھ کر چہار شنبہ ۱۴ ر صفر ۶۵۶ ھ کو مضافات کے دہیہ وقف اور جلابیہ نامی قصبے میں چلا گیا۔ یہیں اسیر خلیفہ کو طلب کیا گیا۔ خلیفہ کو آثار سے اپنے قتل اور تباہی کا یقین ہو گیا۔ سو اس نے اپنے وزیر ابن العلقمی سے تدبیر پوچھی اس نے طنز آمیز جواب دیا۔ خلیفہ نے غسل کی اجازت چاہی تو پانچ منگول سپاہیوں کی موجودگی میں دی گئی۔ خلیفہ نے اس موقع پر اپنی بدحالی پر کچھ پر اثر اشعار بھی پڑھے اور اسی دن سورج ڈھلتے اس کا ولی عہد خلافت اور پانچ خدام کے ساتھ کام تمام کر کے بنو عباس کے ڈھلتے سورج کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوبا دیا گیا۔

بہا لے گئی سیل تاتاران کو

[۳۳] خواجہ کا بیان ہے کہ المستعصم کا منجھلا بیٹا (پسر میامین) الامیر الاوسط ابو الفضائل عبد الرحمٰن باپ کے ساتھ (۱۴ ر صفر) کو شہید کیا گیا اور بڑا بیٹا (مہین پسر) الامیر الکبیر ابو العباس احمد کو دوسرے دن (۱۵ ر صفر) کو درجۂ شہادت پر فائز کیا گیا۔ یہ بیان رشید الدین کے بیان سے مختلف ہے جس کی رو سے بڑا بیٹا ۱۴ ر صفر کو باپ کے ساتھ اور منجھلا بیٹا ۱۶ ر صفر کو جمعہ کے دن شہید کئے گئے۔ تمام تاریخی بیانات سے رشید الدین ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ خواجہ کا بیان منفرد ہے۔ پھر یہ بھی ذہین میں رکھنا چاہئے کہ ابن العلقمی اور خود خواجہ نصیر الدین طوسی خلیفہ کے بڑے بیٹے کو واقعہ کرخ میں ملوث سمجھتے تھے اور طنزاً ابو بکر کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور سقوط بغداد کے بعد اس کی جان کے لاگو تھے۔ اسی لئے خلیفہ اس کو اپنے سے الگ نہ کرتا تھا، حالانکہ منجھلے بیٹے کو دوران محاصرہ وزیر کے ہمراہ ہلاکو کے ہاں بھیج چکا تھا اور ہلاکو اس کی شجاعت سے متاثر ہوا تھا۔ بناء بریں ابو العباس احمد (پسر بزرگ) کا باپ کے ساتھ مقتول ہونا ہی قرین قیاس ہے۔ حیرت ہے کہ خواجہ سقوط بغداد کے عینی شاہد ہوتے ہوئے ایسی غلطی کر بیٹھے۔

[۳۴] اوزان (زائے منقوطہ کے ساتھ) منگولوں کی اصطلاح میں بمعنی عمل جات، صنعت گراں استعمال ہوا۔ (جامع التواریخ) کے مطابق اس سے کمان گر اور تیر تراش اور (وصاف) کے مطابق زین دوز لگام ساز مراد ہیں۔ اوران (رائے غیر منقوطہ کے ساتھ) منگولی زبان میں عمل جات، کاریگراں صناع، پیشہ و اہل حرفہ کو کہتے ہیں۔ صحیح املاء رائے غیر منقوطہ سے ہے (جامع التواریخ، وصاف ولغات منگولی)۔

[۳۵] اوستو بہادر: ذیل کے تمام نسخوں میں ہلاکو کی جانب سے بغداد کی شحنہ گی پر مقرر کئے جانے والے شخص کا نام یہی درج ہے۔ مگر دوسری تمام تاریخوں از قبیل حوادث الجامعہ، الفخری، جامع التواریخ و وصاف میں اس کا نام علی بتایا گیا ہے۔ ایسا معلام ہوتا ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں کہ منگولوں اور ترکوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ دو نام رکھتے تھے۔ ایک اسلامی دوسرا ترکی یا منگولی، سو شحنہ بغداد کا اسلامی نام علی بہادر منگولی نام اوستو بہادر ہوگا۔ علی بہادر بڑا دیندار تھا نماز پنجگانہ نماز جمعہ، نماز تراویح کا پابند تھا۔ سقوط بغداد سے لے کر ۶۶۱ھ تک وہ بغداد کا شحنہ رہا اسی سال جوینی کی دشمنی اور سازش کی وجہ سے اسے کو خیانت مجرمانہ کی پاداش میں ہلاکو کے حکم سے شہید کردیا گیا۔

[۳۶] سیاہ کوہ کے نام کے ایران میں کئی پہاڑ ہیں۔ مگر جامع التواریخ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاہ کوہ ہمدان کے نواح میں تھا اور بعد کی کتابوں میں کوہ پنجۂ علی یا پنچہ علی داغ بھی کہا گیا ہے۔

[۳۷] بغداد کے محاصرہ کے دوران میں حلہ شیعوں کا گڑھ تھا، کچھ علوی صاحبان عقل و دانش (چند علوی دانش مند) ہلاکو کی خدمت میں حاضر ہوئے، اطاعت قبول کی اور منگولی شحنہ کی تقرری کی درخواست کی۔ ہلاکو نے دو افراد کو حلہ کی امارت پر مقرر کر کے علویان دانش مند کے ہمراہ کردیا۔ بعد ازاں ہلاکو نے اہل حلہ کی وفاداری کے امتحان کے غرض سے اپنے برادر نسبتی بوقا تیمور کو کہ اولجائی خاتون کا بھائی تھا۔ ایک فوج کے ساتھ حلہ بھیجا۔ حلہ والوں نے دریا پر پل باندھ کر منگولی لشکر کا شاندار استقبال کیا۔ بوقا تیمور نے ان لوگوں کی ثابت قدمی دیکھ کر ۱۰، صفر ۶۵۶ھ کو وہاں

سے کوچ کیا۔(جامع التواریخ ۳: ۶۲، ۶۳) حلہ کی آبادی اہل تشیع پر مشتمل تھی اور ہر چند کہ وہ عباسیوں کے ماتحت تھے۔مگر باہمی تعلقات کی نوعیت دگرگوں ہی رہی۔عباسیوں کو کمزور یا مشغول پا کر اہل حلہ ان کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکتے۔ان کے دشمنوں کی مدد کرتے اور ان کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔اسی طرح عباسی جب ان پر قابو پاتے انھیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے مثلاً ۵۵۲ھ میں سلطان محمد سلجوقی نے بغداد کا محاصرہ کیا تو عباسی خلیفہ المقتفی کے خلاف اہل حلہ نے سلجوقیوں کی مدد کی اس کا انتقام لینے کی غرض سے المقتفی کے جانشین المستنجد نے ۵۵۸ھ میں حلہ پر حملہ کیا۔اور یہاں آباد بنی اسد کو شکست دے کر شہر سے نکال دیا۔(الکامل لابن الاثیر بر مواقع یعنی سنین مذکورہ کے تحت)۔

[۳۸] بوقا تیمور ۱۰، صفر ۶۵۶ھ کو حلہ سے واسط کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا۔۱۷، صفر کو اس کا لشکر واسط کے سامنے خیمہ زن تھا۔اہل شہر نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا۔اور شہر کے دفاع کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔لیکن آخر کار انھیں شکست ہوئی اور شہر پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا منگول سپاہ نے حسب عادت لوٹ مار اور قتل و آتش زنی کا سلسلہ شروع کر دیا۔چالیس ہزار مسلمان شہید ہوئے اور شہر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔(جامع التواریخ ۳: ۶۳)

[۳۹] واسط کو برباد کر کے بوقا تیمور خوزستان کے مرکزی شہر شوشتر (ششتر) پہنچا۔اس کے ہمراہ شرف الدین ابن الجوزی بھی تھے کہ اہل شوشتر کو اطاعت پر آمادہ کرنے کی ذمہ داری انھیں پر ڈالی گئی تھی۔ ہر چند کہ اہل شوشتر نے منگولوں کی اطاعت قبول کر لی ،لیکن شہر میں موجود عباسی فوج نے کہ ترکوں پر مشتمل تھی ، مقابلہ کیا۔ان میں کچھ مارے گئے ، باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔(جامع التواریخ ۳: ۶۳)

[۴۰] بوقا تیمور کی پیش قدمی کے نتیجے میں بصرہ اور کوفہ والوں نے بے لڑے بھڑے منگولوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔اس دوران میں امیر سیف الدین بیتکچی کی درخواست پر ہلاکو نے نجف میں مزار امیر المومنین علی مرتضی رضی اللہ تعالی عنہ کی حفاظت اور وہاں کے باشندوں کی سلامتی کی غرض سے منگول سپاہیوں کا ایک دستہ تعینات کر دیا۔(جامع التواریخ ۳: ۶۳)

[۴۱] خواجہ نصیر الدین طوسی کے ذیل کے ترجمہ اور حواشی کے بعد ہم اپنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک مکتوب کا ذکر کرنا چاہیں گے جو ہلاکو کے حکم سے انھوں نے عربی زبان میں اہل حلب کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں بغداد پر منگولوں کے تسلط، المستعصم اور اس کی فوج کی تباہی کا ذکر کر کے اہل حلب کو ڈرایا گیا تھا کہ وہ بغداد کے حشر سے عبرت پکڑیں اور جادۂ اطاعت سے انحراف نہ کریں۔ اس خط کے بیشتر فقرے قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں اور قرآن میں اہل ایمان کے لئے جو فقرے اور کلمے استعمال ہوئے ہیں، خواجہ نے انھیں ہلاکو اور اس کی سپاہ کے لئے اور جو کلمے اور فقرے اہل شرک و کفر کے حق مین استعمال ہوئے ہیں انھیں المستعصم باللہ اور مظلوم مسلمانوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ خواجہ نے مکتوب کے اخیر میں ہلاکو کی اطاعت کو راہ ہدایت کا اتباع قرار دیا ہے یہ مکتوب خواجہ کے تملق و تعصب کی بدنما مثال ہے ہم جامع التواریخ کی تیسری جلد صفحہ ۶۳ سے اسے بلفظہ نقل کر کے اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مکتوب ہلاکو کی جانب سے لکھا گیا ہے۔ اس میں متکلم کی ضمیر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے استعمال کی ہے، لیکن خواجہ نے اسے ہلاکو کے لئے استعمال کیا ہے: فشتان ما بینھما؟۔

امابعد فقد نزلنا بغداد سنة ست و خميس و ست مأه فساء صباح المندرين، فدعونا مالكها وابىٰ، فحق عليه القول، فاخذ ناه اخذاً وبيلاً وقد دعوناک الى طاعتنا ، فان اتيت فروح و ريحان وان ابيت فخرى وخسران فلاتكن كا لباحث عن حتفه بظلفه والجارع مارن انفه بكفه فتكون من الاخسرين اعمالاً الذين ضل سعيهم فى الحياة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعاً وماذالک على الله بعزيز . والسلام على من اتبع الهدىٰ.

ترجمہ:۔ حمد و ثنا کے بعد۔ ہم ۶۵۶ ھ میں بغداد پہنچے (پڑاؤ کیا) پس وہ لوگ جو عذاب سے ڈرائے گئے تھے ان کی صبح بڑی بری ہوئی ہم نے (بغداد) کے مالک (المستعصم) کو (صلح و اطاعت کی جانب) بلایا مگر اس نے (ہماری اطاعت قبول کرنے سے) انکار کیا، سو اس پر بات ثابت ہوگئی اور ہم نے اسے سخت گرفت میں لیا (اے حاکم حلب) ہم تجھے اپنی اطاعت کی دعوت

دیتے ہیں۔ اگر تو مطیع ہو کر ہماری خدمت میں حاضر ہوگا تو تیرے لئے مسرت و شادمانی ہے اور جو تو نے (ہماری اطاعت سے) انکار کیا تو تیرے واسطے ذلت و خواری (خسارہ) ہے تو اس کی طرح نہ بن جو اپنی موت (قبر) اپنے کھر (پاؤں) سے کھودتا ہے اور اپنی ناک کا سرا (پھنگ نرمہ) اپنے بازو (ہاتھ) سے کاٹتا ہے، یوں تو ان لوگوں میں سے ہو گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ان کی کی کرائی محنت اکارت جاتی ہے حالانکہ وہ (اپنی نادانی سے) یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ اللہ کے لئے یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے (کہ جسے چاہے سیدھا راستہ دکھائے) اور سلامتی ہے اس کے لئے جو ہدایت کی راہ (ہلاکو کی اطاعت) اختیار کرتا ہے۔

(ماہ نامہ الولی، حیدرآباد ۱۹۸۷ء)

○○○

زوالِ خلافتِ عباسیہ کے اثرات

خلافت عباسیہ کا زوال کوئی معمولی حادثہ نہ تھا جس سے تاریخ کا طالب علم سرسری گزر جائے۔ یہ ایک خاندان حکومت کا زوال نہ تھا کہ خانوادہ ہائے حکومت کے عروج و زوال کی داستانوں سے کسی قوم یا ملک کی تاریخ خالی نہیں اور ایسا ہونا کبھی موجب حیرت و استعجاب نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ آل عباس کا زوال اور بغداد کا سقوط ایک ملت کا زوال، ایک تہذیب کا اختتام اور ایک دور کا خاتمہ تھا۔[۱] تاتاریوں کے ٹڈی دل نے ایشیا کے وسیع و عریض خطوں کو پامال کر ڈالا، جدھر ان کا گزر ہوا تباہی اور بربادی کے ہولناک مناظر نگاہوں کے سامنے پھر گئے اور خاک و خون کے طوفان فضاؤں پر چھا گئے۔ چین کی عظیم شہنشاہیت ان وحشیوں کے ہاتھوں تہس نہس ہوگئی۔[۲] خوارزم شاہوں کی باجبروت سلطنت صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔[۳] بخارا، سمرقند، نیشاپور، اصفہان اور رے کے بارونق شہر خاک کے تودوں میں تبدیل ہو گئے۔[۴] ساحر الموت کا سحران کی تیغ جہاں سوز سے ٹوٹا، اور یہ آشیانہ عقاب اجڑ گیا۔[۵] ستر لاکھ فرزندانِ توحید خاک و خون میں مل گئے اور شاید چشم فلک نے خون انسانی کی اتنی ارزانی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ اور اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین، جو دراصل ایک نئے المیہ کا افتتاحیہ تھا، اس وقت منظر عام پر آیا جب ہلاکو کے خونی دستے ہمدان کو پامال کرتے ہوئے دارالسلام، مدینۃ الاسلام بغداد کی جانب بڑھے، اور ۶۵۶ھ (مطابق ۱۲۵۸ء) میں قبۃ الاسلام گر گیا۔ بغداد کا عظیم الشان شہر وحشی تاتاریوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور شہر کے دروازے پہلی بار ایک غیر مسلم حملہ آور

کے لیے کھول دیے گئے۔ آخری عباسی خلیفہ امیر المومنین المستعصم باللہ اپنے بیٹوں اور علماء و عمائدین کی معیت میں سفید پرچم امن لیے ہلاکو کے لشکر گاہ میں داخل ہوا۔ خلیفۂ اسلام کی پذیرائی کے لیے ذلت و رسوائی آگے بڑھیں اور قید و بند نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔[٦]
ہلاکو کے حکم سے بقیۃ السیوف علماء کو مدرسہ مستنصریہ میں جمع کیا گیا اور ان کے سامنے ایک فتویٰ پیش کیا گیا کہ ان دونوں میں کون بہتر ہے؟ کافر بادشاہ عادل یا مسلم بادشاہ ظالم؟ حالات سے مجبور ہو کر ان علماء نے کافر بادشاہ عادل یعنی ہلاکو کو فضیلت کا فتویٰ دیا۔[٧]
خلیفہ کے قتل اور خلافت کے انتزاع کا فیصلہ چنداں آسان نہ تھا، کہ یہ خیال عام تھا کہ اگر خلیفہ المستعصم باللہ کو قتل کیا گیا تو سورج تاریک ہو جائے گا اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔ مگر اس عہد کے مشہور فلسفی اور عالم نصیر الدین طوسی نے، کہ ہلاکو کے مشیر تھے اور بغداد سے پہلے الموت کی پامالی میں نمایاں حصہ لے چکے تھے، اس خیال کی تغلیط کی اور ۴، صفر ۶۵٦ھ کو مستعصم باللہ قتل کر دیا گیا۔[٨] بادی النظر میں عوام کا یہ خیال ان کے واہمہ کا آفریدہ تھا اور دنیا پر کوئی مصیبت مستعصم باللہ کے قتل سے نہ نازل ہوئی۔ لیکن واقعات کے اسباب و علل پر نظر رکھنے والے ارباب فکر نے محسوس کیا کہ مستعصم باللہ کی شہادت سے وحدت اسلامی کا سورج گہنا گیا، دنیائے اسلام تاریک ہو گئی اور وہ عظیم ثقافت، جس نے انسانیت کو نئے اقدار حیات دیئے تھے، برباد ہو گئی۔ اس تباہی سے دنیائے اسلام میں ایک تہلکہ مچ گیا اور ہر مسلمان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ اتابکان شیراز کے [٩] پروردۂ نعمت سعدی شیرازی نے، [١٠] گو ان کے مربی تاتاریوں کے ساختہ پرداختہ تھے اور اس عظیم ابتلا کے موقع پر تاتاریوں کے خلاف یا عباسیوں کی موافقت میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا جرم عظیم تھا، سقوط خلافت کا مرثیہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کہا۔ جہاں یہ مرثیہ بغداد اور عباسیوں کی تباہی کا مرثیہ ہے وہیں مسلمانوں کی تباہی اور اسلام کی بے کسی کا دردناک نوحہ بھی ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

برزوال ملک مستعصم امیر المومنین

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آ ری زخاک

سر بروں آ رو قیامت درمیان خلق بیں

نا زنینانِ حرم راموجِ خونِ بے دریغ

زآسماں بگزشت و ما را خونِ دل از آستیں

خونِ فرزندانِ عمِ مصطفیٰ شد ریختہ

ہم بر آں جائے کہ سلطاناں نہا وندے جبیں[۱۱]

سعدی نے ایک عربی قصیدہ بھی لکھا تھا جس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

بکت جدر المستنصریتہ ندیتہ

علیٰ العلماء الراسخین ذوی المحجر

مدرسہ مستنصریہ کے دور دیوار ان علماء پر گریہ کناں ہیں جو ان کے حجروں میں رہا کرتے تھے۔

فاین بنو العباسِ مفتخرُ الوریٰ ذوی الخلقِ المرضیٰ والغرد الزهر

کہاں گئے آل عباس جو دنیا کے لیے باعث فخر تھے اور جن کے اخلاق پسندیدہ، روشن و تابندہ تھے۔

اس عہد کے ایک مشہور عربی شاعر تقی الدین بن ابی الیسر نے خلافت عباسیہ کے زوال پر یوں آنسو بہائے:

لِسائلِ الدمعِ عن بغداد اخبار فما وقوفک والاحبابُ قد ساروا

بہتے ہوئے آنسو بغداد کی تباہی کی داستان سنا رہے ہیں۔ اب کہ دوست رخصت ہوئے تم کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؟

تاجُ الخلافةِ والربعُ الذی شرفت به المعالمُ قد اعفاه اقفار

تاج خلافت اور وہ قصر جن سے دنیا کو شرف حاصل ہوا آج سنسان پڑے ہیں۔

وکم حریمٍ سبتہ التترُ غاصبۃً   وکان دون ذاک السترِ استارا

کتنی ایسی نازنینانِ حرم ہیں جنھیں زبردستی تاتاریوں نے اپنی باندی بنالیا۔ حالانکہ وہ کئی کئی پردوں میں رہا کرتی تھیں۔[۱۲]

خلافت عباسیہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں قائم ہوئی اور ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں ختم ہوگئی۔ ۵۲۳ سال کے طویل عرصہ میں خلافت عروج وزوال کے مختلف مراحل سے گزری۔ اقتدار میں قوت وضعف کے اعتبار سے خلافت عباسیہ کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

دور اول: بنوعباس کی عظمت کا دراصل یہی دور ہے۔ اس کا آغاز ۱۳۲ھ میں ابوالعباس السفاح کی خلافت سے ہوا، اور اس کا اختتام ۲۴۷ھ میں جعفر المتوکل علی اللہ کی شہادت پر ہوا۔ اس دور میں دس خلفاء نے حکومت کی۔ جن میں ابوجعفر المنصور (۱۳۶ھ۔۱۵۸ھ) اور ہارون الرشید (۱۷۰۔۱۹۳ھ) جیسے لائق افراد بھی شامل ہیں جن کا شمار دنیا کے چند عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اسی دور سے مامون (۱۹۸ھ ۲۱۸ھ) کا بھی تعلق ہے جس کے عہد حکومت میں علوم وفنون کو کافی ترقی ہوئی۔

دور دوم: ترک غلاموں [۱۳] کے استیلا، خلفاء کے عزل ونصب، قید و بند، بغداد اور سامرہ کی تباہی و بربادی کا یہ پہلا دور منتصر (۲۴۸ھ) کی خلافت سے معتمد کی تخت نشینی (۲۵۶ھ) تک رہا۔ اسی زمانہ میں عباسیوں کے مشرقی نائب خاندان آل طاہر [۱۴] کے ضعف کی وجہ سے صفاریوں [۱۵] کی خود مختار حکومت قائم ہوئی۔ اور مغرب میں ابن طولون [۱۶] نے مصر میں اپنی امارت قائم کرلی۔ خلافت عباسیہ کا زوال یہیں سے شروع ہوتا ہے جو بعض مستثنیات کے سوا اخیر تک باقی رہا۔

دور سوم: معتمد کے عہد خلافت سے مکتفی (۲۸۹ھ۔۲۹۵ھ) کی وفات تک یہ دور باقی رہا۔[۱۷] اس عہد میں معتمد کے بھائی موفق طلحہ کے حسن تدبیر سے ترکوں کا زور ٹوٹا اور خلیفہ کو کسی قدر آزادئ عمل حاصل ہوئی۔ موفق کے بیٹے معتضد (۲۷۹ھ۔۲۸۹ھ)

کا زمانہ عباسی خلافت کی نشأۃ ثانیہ کا دور ہے اور اس لیے اسے "سفاح ثانی" کہا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں داخلی شورشوں کے باوجود خلافت کے عروقِ مردہ میں خون زندگی دوڑا اور اس کی عظمت رفتہ باز آئی۔

دور چہارم: مقتدر باللہ (۲۹۵ھ۔۳۲۰ھ) کی تخت نشینی سے پھر انتشار کا آغاز ہوا۔ خلیفہ کی کم سنی سے ترک غلاموں نے فائدہ اٹھایا اور حکومت پر مستولی ہو گئے۔ اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوئی اور خانہ جنگیوں کی ابتدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں شمالی افریقہ میں عبید اللہ المہدی (۲۹۷ھ۔۳۲۲ھ) نے بنی فاطمہ کی خلافت قائم کی اور عملی انتشار کے ساتھ ساتھ نظری انتشار بھی شروع ہوا۔[۱۸] اس بدحالی کی اصلاح کی جو تدبیر کی گئی اس سے مزید خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اصلاح حال کے خیال سے راضی باللہ (۳۲۲ھ۔۳۲۹ھ) نے امیر الامرا[۱۹] کا ایک نیا منصب قائم کر کے ان صوبوں کو، جو براہ راست خلافت کی تحویل میں تھے، محمد بن رائق والی بصرہ[۲۰] کو ٹھیکے پر دے دیا۔ راضی کے بھائی متقی للہ (۳۲۹ھ۔۳۳۳ھ) کا عہد بھی انتشار اور دو عملی کی نذر رہا۔ خلیفہ کے نام پر امیر الامراء مالیہ کی وصول یابی میں جبر و استحصال کے مرتکب ہوتے اور اس منصب جلیل کے حصول کی خاطر باہم دگر زور آزمائی کرتے رہے۔[۲۱]

دور پنجم: یہ دور بنو بویہ کے تسلط کا دور ہے۔ امراء کی باہمی آویزشوں سے تنگ آ کر ۳۳۴ھ میں مستکفی (۳۳۳ھ۔۳۳۴ھ) نے معز الدولہ دیلمی [۲۲] کو بغداد آنے کی دعوت دی۔ اس وقت سے ۴۴۷ھ تک جب قائم بامر اللہ (۴۲۲ھ۔۴۶۷ھ) خلیفہ تھا۔ بغداد اور اس کے ماتحت علاقوں پر بنو بویہ متغلب رہے۔ آل بویہ بغداد کے عملاً حکمران تھے اور انھوں نے عباسیوں کو ذلیل وخوار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔[۲۳] ان کے صد سالہ دور استیلاء میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب بویہی امیر الملک الرحیم [۲۴] کے سپہ سالار ارسلان بساسیری[۲۵] نے ۴۵۰ھ میں بغداد پر قبضہ کر کے ایک سال تک بغداد کی مساجد سے فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ[۲۶] کے نام کا خطبہ جاری کیا اور

یوں اس زمانہ میں عباسیوں کی خلافت عملاً ختم ہو چکی تھی۔

دور ششم: ۴۴۷ھ میں سلطان طغرل سلجوقی [۲۷] بغداد آیا اور آل بویہ کا خاتمہ کر کے عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کو اپنی حمایت میں لے لیا۔ ابتداء میں عباسیوں اور سلجوقیوں کے تعلقات خوش گوار رہے مگر جلد ہی ولی عہد کے مسئلہ پر سلطان ملک شاہ سلجوقی [۲۸] اور خلیفہ مقتدی (۴۶۷ھ۔۴۸۷ھ) میں اختلافات کا آغاز ہوا اور اگر ملک شاہ کا اچانک انتقال نہ ہو جاتا تو مقتدی کو بغداد اور خلافت دونوں ہی سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ [۲۹] اس سے بھی زیادہ سنگین اختلافات مسترشد باللہ (۵۱۲ھ۔۵۲۹ھ) اور سلطان محمود سلجوقی [۳۰] کے درمیان رونما ہوئے اور نوبت جنگ تک پہنچی۔ یہ تنازعات وقتی صلح سے دب گئے مگر سلطان مسعود سلجوقی [۳۱] سے مسترشد کی جنگوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا جس میں خلیفہ قتل ہوا۔ [۳۲] خلفائے عباسی نے سلاطین سلجوقی کے اقتدار سے گلو خلاصی کی جدوجہد جاری رکھی تا آنکہ خلیفہ مقتفی لامر اللہ (۵۳۰ھ۔۵۵۵ھ) نے سلجوقیوں کے اقتدار کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ [۳۳]

دور ہفتم: مقتفی کے عہد خلافت سے شروع ہو کر مستعصم باللہ (۶۴۰ھ۔ ۶۵۶ھ) کی شہادت پر یہ دور ختم ہوا۔ اس دور کے خلفا میں ناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ۔ ۶۲۲ھ) کے عہد کو نہ صرف اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے تمام عباسی خلفاء سے زیادہ عرصے تک حکومت کی بلکہ اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی صلاحیتوں سے خلافت کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کی اور خود مختار امراء کے مقابلے میں خلافت عباسیہ کی حیثیت برقرار رکھنے میں ایک حد تک کامیاب ہوا۔

خلافت عباسیہ سطوت و اقتدار اور قوت و تسلط کے مختلف مدارج میں امت اسلامیہ کے بیشتر طبقات میں مقبول رہی اور اسے وحدت اسلامی کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ [۳۴] منصور کے عہد سے متوکل کے عہد تک خلافت عباسیہ صرف اسی لیے مطاع نہ تھی کہ اس کی عسکری قوت بے پایاں تھی یا اس کا مرکزی نظام حکومت مستحکم بنیادوں پر قائم تھا بلکہ اس کی

سب سے بڑی وجہ عوام وخواص کا یہ خیال تھا کہ خلافت کے جائز وارث آل عباس ہیں اور امت مسلمہ کی سربراہی کا حق انھیں کو پہنچتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب خلیفہ مامون نے خلافت کو علویوں کی جانب منتقل کرنے کا ارادہ کیا اور علی الرضا[۳۵] کو اپنا ولی عہد نامزد کر کے عباسیوں کے سیاہ علم کو علویوں کے سبز پرچم سے بدل دیا تو بغداد میں کہرام مچ گیا اور اس کے دو چچاؤں منصور بن مہدی [۳۶] اور ابراہیم بن مہدی[۳۷] کو یکے بعد دیگرے خاندان عباسی کی قیادت تفویض کی گئی۔ لیکن مامون نے علویوں کی جانب انتقال خلافت کا خیال ترک کر دیا تو اس کی مخالفت بھی ختم ہو گئی۔ یہی استحقاق خلافت کا نظریہ تھا جس کے زیر اثر مشہور طالع آزما یعقوب بن لیث صفار[۳۸] کے خراسانی سرداران فوج نے خلیفہ معتمد علی اللہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ لڑنے سے انکار کر دیا بلکہ عین معرکۂ کارزار میں یعقوب کے لشکر سے علیحدہ ہو کر خلیفہ کے علم کے نیچے چلے آئے اور نتیجۃً صفاریوں کو پسپا ہونا پڑا۔ [۳۹] عباسیوں کے اقتدار ہی کا اثر تھا کہ اسماعیل سامانی[۴۰] نے ساز وسامان کی کمی کے باوجود عمرو بن لیث صفار[۴۱] کو بلخ کے مقام پر شکست دی، جو محض تائید غیبی اور ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ تھی، [۴۲] تو لوگوں نے اسے خلیفۂ عباسی کی کرامت پر محمول کیا۔ عباسیوں سے گرویدگی ہی کی وجہ سے مشہور فاتح اور کشور کشا محمود غزنوی[۴۳] نے ہمیشہ بارگاہ خلافت کی اطاعت کو اپنا شعار بنائے رکھا اور فاطمی خلیفہ حاکم بامراللہ[۴۴] کے پیغام کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ [۴۵] اور اسی وجہ سے آل بویہ خلافت عباسیہ کو ختم کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اسی طرح یہ بھی اسی اعتقاد کا اثر تھا کہ سلطان طغرل سلجوقی اور دوسرے سلاطین سلجوقیہ نے عباسیوں کی اطاعت کو اپنا شعار بنایا اور عموماً اس سے انحراف نہ کیا اور اگر کبھی ایسا کیا بھی تو انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ ملک شاہ اور خلیفہ مقتدی میں مخالفت کا آغاز ہوا اور ملک شاہ نے ایک ماہ کی مدت میں خلیفہ کو بغداد سے نکل جانے کا حکم دیا، جو ملک شاہ کی اچانک موت سے نافذ نہ ہو سکا، تو خلیفہ کی ناراضگی کو اس کی موت کا سبب قرار دیا گیا اور اس کے جانشین خلیفہ سے مصالحت کرنے پر مجبور ہوئے حقیقت یہ ہے کہ عوام و

خواص کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عباسیوں کی مخالفت اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان سے سرتابی کے مترادف ہے۔ اسی طرح جب خلیفہ ناصرلدین اللہ اور علاء الدین محمد خوارزم شاہ[۴۶] میں اختلاف کا آغاز ہوا اور خوارزم شاہ کی فوج مدائن کے قریب ۶۱۴ھ میں طوفان ابرو باد کی نذر ہوگئی[۴۷] تو یہ عقیدہ اور بھی پختہ ہوگیا کہ عباسیوں سے گردن کشی منشائے الٰہی سے سرکشی ہے۔ یہ بات خلیفہ ناصرلدین اللہ کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو اس نے اپنے وزیر مؤیدالدین محمد بن برزالقمی[۴۸] کے تقرر کے موقع پر جاری کیا تھا۔ اس میں تحریر تھا:

''محمد بن برزالقمی ملک میں ہمارا نائب ہے۔ جس نے اس کی اطاعت کی اس نے ہماری اطاعت کی۔ اور جس نے ہماری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور خدا اسے جنت میں داخل کرے گا۔ جس نے اس کی نافرمانی کی، اس نے ہماری نافرمانی کی۔ اور جس نے ہماری نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور خدا اسے دوزخ میں ڈالے گا۔[۴۹]

یہی عقیدہ تھا جس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر خلافت عباسیہ ختم ہوگئی تو دنیا تاریک ہوجائے گی۔ عباسیوں کے اسی اقتدار کا اثر تھا کہ مشرق و مغرب کی خود مختار امارتوں نے خانہ جنگیوں اور باہمی جنگ و جدل کے باوجود انھیں کو اقتدار اعلیٰ کا منبع سمجھا، خطبوں میں ان کا نام لیا اور ان کے نام سے سکے ڈھلوائے۔ ان سے حکومت کی اجازت لینا ان کے لئے سرمایۂ افتخار تھا۔ یہ اقتدار صرف انھیں علاقوں میں نہ تھا جو کبھی عباسیوں کے زیر نگیں رہ چکے تھے بلکہ وہ علاقے بھی، جن پر عباسیوں نے کبھی حکومت نہ کی، وہاں بھی جب نئی حکومتیں قائم ہوئیں تو عباسیوں ہی سے حکومت کی اجازت حاصل کی گئی۔ مراکش اور اندلس میں مرابطون کی حکومت کے بانی امیر المسلمین یوسف بن تاشفین[۵۰] نے بھی اپنے حق حکمرانی کے جواز پر عباسیوں سے مہر تصدیق ثبت کرائی اور ان کی بارگاہ سے خلعت و خطاب پایا۔ یہی کیفیت ہندستان میں خاندان غلاماں کی تھی۔ سلطان شمس الدین

التمش[۵۱] نے خلیفہ مستنصر باللہ (۶۲۳ھ۔۶۴۰ھ) سے ۶۲۶ھ میں فرمان حکومت خطاب وخلعت حاصل کیا اور دلّی میں اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کی۔ یہ سلسلہ خلافت عباسیہ کے انتزاع و انقراض کے بعد بھی جاری رہا۔ اور سلطنت دہلی کی قلمرو میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی شہادت کے بعد ۶۹۵ھ تک، یہ جانتے ہوئے بھی کہ خلیفہ شہید ہو چکا ہے۔ اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا اور سکوں میں اسی کا نام کندہ ہوتا رہا۔ [۵۲] اور غالباً یہی وجہ تھی کہ خلافت عباسیہ کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت پیش آئی۔ اور مصر وشام میں سلطان الملک الظاہر بیبرس بندقداری[۵۳] نے خلافت عباسیہ کا ۶۵۹ھ میں احیاء کیا اور مستعصم باللہ کے چچا احمد بن خلیفہ ظاہر باللہ کو مسند خلافت پر متمکن کیا۔ یوں عہد انحطاط میں بھی خلافت کے جائز حق دار عباسی ہی سمجھے جاتے تھے اور ہر نیا حکمران ان سے اجازت لینے اور ان کی نیابت میں حکومت کرنے کو اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر اس کی حکومت جائز نہ سمجھی جائے گی۔ مگر خلافت عباسیہ کے زوال سے اقتدار سیاسی کی یہ مرکزیت ختم ہوگئی، اور پھر مسلمانوں میں سیاسی وحدت باقی نہ رہی، اور خلافت عباسیہ کا زوال ملت اسلامیہ کی مرکزیت اور وحدت اقتدار کا زوال ثابت ہوا۔

عباسیوں کی سیاسی برتری عملی نقطۂ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ نظری اعتبار سے بھی مسلم تھی۔ مشہور سیاسی مفکر ابوالحسن الماوردی[۵۴] نے الاحکام السلطانیہ میں خلافت ہی کو جائز طرز حکومت قرار دیا ہے اور امارت وسلطنت کو اسی وقت درست تسلیم کیا ہے جب اسے بارگاہِ خلافت سے منظوری کی سند مل جائے[۵۵]۔ امام غزالی[۵۶] نے بھی خلافت کے وجود کو خالص مذہبی نقطہ نظر سے باقی رکھنے پر زور دیا ہے کہ اس کے بغیر اعمال دین اور امور دنیوی کی بجا آوری درست نہیں۔ [۵۷] جب سیوطی[۵۸] نے خلافت عباسیہ کے زوال پر نوحہ خوانی کی تو ان کے پیش نظر خلافت کا یہی مذہبی پہلو تھا۔[۵۹] خلافت عباسیہ کے خاتمہ سے اس حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا جو نظریاتی اعتبار سے جائز خیال کی جاتی تھی، اور جسے مذہبی حیثیت حاصل تھی۔

خلافت راشدہ میں امور دنیا احکام دین کے تابع تھے۔خلفائے راشدین مسلمانوں کے دینی اور دنیوی دونوں ہی سربراہ تھے،اور قرآن کی اشاعت ،حدیث کی روایت اور مسائل پیش آمدہ میں تشریع کی نگرانی و ذمہ داری ان کے فرائض میں محسوب ہوتی تھیں۔ اس طرح تشریع بالکلیہ حکومت کے دائرۂ اختیار میں تھی۔ انفرادی تشریع کی کوئی گنجائش نہ تھی[۶۰] خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کی خلافت قائم ہوئی تو یہ صورت باقی نہ رہی۔حکومت کے بجائے تشریع کی جانب مختلف مقامات کے علما نے نجی طور پر توجہ مبذول کی، اور ایسی تشریع کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مرکزیت نہ تھی بلکہ اہل حجاز، اہل عراق اور اہل شام کے اصول استخراج، بنیادی ماخذات کی قدر مشترک کے باوجود ایک دوسرے سے ہیئت و ترکیب میں مختلف ہوگئے[۶۱]،اور ایسا اس لئے ہوا کہ مختلف مقامات کے علماء محدثین و فقہاء کے معیارِ رد و قبولِ روایت میں فرق تھا و نیز اصول درایت کے استعمال میں بھی کوئی یکساں طریقہ ان کے مابین موجود نہ تھا۔اس عدم ارتباط اور فکری غیر مجانست کے باعث مختلف مذاہب فقہی پیدا ہوئے اور ہر شہر کے فقہاء مستقل مدرسۂ قانون کے بانی ہوگئے بلکہ بعض اوقات تو ایک شہر میں بھی متعدد مسالک فقہی قائم ہوئے۔[۶۲] خلافت عباسیہ کے آغاز میں امام ابوحنیفہ [۶۳] اور ان کے تلامذہ نے ایک مبسوط اور باقاعدہ ضابطۂ قانون مرتب کیا۔اپنی خوبیوں اور ائمۂ احناف کی وجہ سے یہ ضابطۂ قانون دنیائے اسلام کے بہت بڑے حصے میں رائج ہوگیا۔امام ابویوسف [۶۴] کے عہد ہارون میں منصب قاضی القضات پر فائز ہونے سے اس کی اشاعت کو مزید تقویت پہنچی۔اس کے بعد امام مالک[۶۵]،امام شافعی[۶۶] اور امام احمد بن محمد بن حنبل[۶۷] کے فقہی مذاہب مدون ہوئے۔اور دنیائے اسلام میں قانونی ہم آہنگی کا آغاز ہوا۔مگر اس کے باوجود اجتہاد کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور داؤد ظاہری[۶۸]،ابن جریر طبری[۶۹] اور دوسرے فقہاء کے فقہی مذاہب وجود میں آئے۔اجتہاد نے اسلامی تشریع کو فروغ دیا اور فقہ اسلامی متحرک اور ترقی پذیر رہی۔خلافت عباسیہ کے دور زوال میں امت مسلمہ انتشار کا شکار ہوئی

اس سے اجتہاد کی نشو نما رکنے لگی اور جب خلافت عباسیہ کا سقوط ہوا تو اس کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ تقلید کی بندشیں سخت سے سخت ہو گئیں اور یوں خلافت عباسیہ کا زوال اجتہادی صلاحیتوں کے انحطاط اور فقہ اسلامی کے جمود کا باعث ہوا۔ اجتہاد کے سوتے خشک ہو گئے۔ اسلامی تشریع ارتقاء کی نئی منزلیں نہ طے کرسکی اور جہاں تک اسے عباسیوں کے دور اقتدار میں پہنچا دیا گیا تھا اس سے آگے اس کے قدم نہ بڑھے۔

خلافت عباسیہ اپنے آغاز سے اختتام تک کبھی بھی تمام دنیائے اسلام پر حکمران نہ رہی۔ سب سے پہلے اندلس میں عبدالرحمٰن اول [۷۰] نے ایک آزاد حکومت قائم کر لی، جس نے عباسیوں کی بالادستی کبھی تسلیم نہیں کی۔ اس کے بعد ادریس بن عبداللہ علوی [۷۱] نے مغرب اقصیٰ میں ایک دوسری خودمختار حکومت قائم کی۔ ۲۹۷ھ میں عبیداللہ المہدی نے شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ کی خلافت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح آغاز ہی سے مملکت اسلامیہ میں عباسیوں کے علاوہ متعدد حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ جنھوں نے خلفائے عباسی کی کبھی اطاعت نہ کی بلکہ اپنے کو ان کا حریف اور مقابل سمجھا۔ لیکن جہاں تک ثقافتی اور تمدنی مسائل کا تعلق ہے بغداد کا سکہ ہر جگہ چلتا تھا، اور قرطبہ، فاس، مہدیہ و قاہرہ اور ان تمام مقامات پر جہاں عباسیوں کے حریفوں کی حکومتیں تھیں ثقافت کی دنیا میں خلفائے عباسیہ ہی کی عمل داری تھی۔ تمام دنیائے اسلام ایک واحد ثقافت کی حامل تھی۔ جو ثقافت و تہذیب بغداد کے شہر میں پروان چڑھی اس کا چلن قرطبہ اور قاہرہ میں بھی ہوا، اور یوں خلافت عباسیہ کی بدولت دنیائے اسلام کو ایک واحد تمدن اور مشترکہ ثقافت ملی۔ جس نے نہ صرف اپنے عہد کی دنیا کو حضارت و تہذیب کے درس دیئے بلکہ صحیفۂ عالم پر اس کے دوام کی مہر بھی ثبت کر دی اور آج کی تہذیبی ترقی میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ زوال بغداد کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ثقافت و تہذیب کی یہ ہم آہنگی اور یکسانی باقی نہ رہی۔

عہد عباسیہ میں، گو مملکت اسلامیہ کی مادری زبان صرف عربی نہ تھی، بلکہ اسپینی، فارسی، بربری، کردی، ترکی و ہندوستانی زبانیں بولنے والی اقوام بھی اس کی حلقہ بگوش تھیں،

اور ان میں سے بعض زبانوں کو اسلام سے پہلے بھی علمی حیثیت حاصل تھی مگر مسلمانوں کی علمی و تعلیمی زبان عربی تھی۔ ایک مشترک ذریعہ افہام و تفہم کی حیثیت سے اس زبان کو عمومیت حاصل ہوئی۔ اسلامی ممالک کے طلبہ و علماء کے علمی رحلات و اسفار، جو اتحاد خیال اور ذہنی و فکری ہم آہنگی کا بہت بڑا سبب تھے، صرف اس لئے ممکن تھے کہ بلاد اسلامیہ میں ذریعہ تعلیم و تعلم اور علمائے اسلام کی تصانیف کی زبان عربی تھی۔ مسلمانوں کی ذہنی کوششوں کا اظہار عموماً عربی زبان کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس سے دنیائے اسلام میں علمی اتحاد کی فضا قائم ہوئی اور مسلمانوں کے علمی کارنامے عموماً، بلا اختلاف وطن و زبان، ایک ہی قوم کے کارنامے اور ایک ہی زبان کی تصانیف محسوب ہوئے[۷۲]۔ خلافت عباسیہ کے زوال سے عربی زبان کی یہ عمومی حیثیت اور نتیجۂ علما و طلبہ کے علمی سفروں کے سلسلے اگر ختم نہ ہوئے تو بھی ان میں اس حد تک کمی واقع ہوگئی کہ ان کے اثرات کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کوئی شائبہ نہ رہا۔

خلافت عباسیہ کے زوال کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ لوگوں میں مایوسی اور قنوطیت بڑھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں ترک دنیا، زندگی سے بے زاری، حقائق سے اغماض اور جدو جہد سے صرف نظر کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان میں راہبانہ طرز حیات کو مقبولیت حاصل ہوئی اور یوں ایک ایسے تصوف نے فروغ پایا جو اسلام کی روح کے خلاف تھا۔ کیونکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے[۷۳]۔ اور بقول علامہ اقبال خلافت عباسیہ کے زوال کے نتیجہ کے طور پر اسلامی معاشرہ میں عجمی تصوف نے برگ و بار پایا۔ سخت کوشی، مشکل طلبی اور جدو جہد کا جذبہ قوم کے دلوں سے مفقود ہو گیا۔ اور حقائق سے مقابلہ کرنے کے بجائے امت مسلمہ صوفیہ کے تصرف و کرامات پر تکیہ کرنے لگی۔[۷۴]

سطور بالا کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ خلافت عباسیہ کا زوال مسلمانوں کی سیاسی وحدت، ملی یک جہتی، قانونی ہم آہنگی، تمدنی و ثقافتی یکسانی، لسانی و علمی و تعلیمی اتحاد اور جذبہ اتحاد و سخت کوشی کا زوال تھا۔ اور آخری خلیفہ امیر المومنین المستعصم باللہ

کی شہادت، بغداد کی تباہی، دنیائے اسلام کی بربادی اور مسلمانوں کا قتل عام وقتی حادثے نہ تھے کہ آئے اور گزر گئے اور انھوں نے تاریخ پر اپنے اثرات نہ چھوڑے۔ بلکہ یہ سانحے اپنے اثرات کے لحاظ سے بڑے دور رس ثابت ہوئے اور ان کی وجہ سے امت اسلامیہ کی اجتماعیت کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر مجتمع نہ ہو سکا۔ اور اسلام کے قصر بلند میں ایسا رخنہ پڑا جو آج تک بند نہ ہو سکا:۔

فما کانَ قیسٌ هلکه هلکُ واحدٍ ولکنه بنیانُ قومٍ تهدما

حواشی:

[۱] منگولیا اور جنوبی سائبیریا کے باشندوں کو تاتار کا نام اہل چین نے دیا۔ انھوں نے ان کی تین قسمیں کی ہیں [۱] دیوار چین کے قریب بسنے والے سفید تاتار [۲] صحرائے گوبی کے شمال میں رہنے والے سیاہ تاتار۔ اور [۳] سیاہ تاتاریوں کے شمال میں جنگلات میں آباد شکاری تاتاری قبائل۔ اسی تیسرے خاندان میں تموچین ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوا جو چنگیز خاں کے نام سے تاتاریوں کا مشہور حکمران ہوا ہے۔ اس کے عہد میں اسلامی ممالک پر ان کی یلغاروں کا آغاز ہوا۔ تاریخ شعوب اسلامیہ۔ کارل بروکلمین (ترجمہ انگریزی، مطبوعہ لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۴۴۔ ۲۴۵)۔

[۲] ایضاً، ص ۲۴۶

[۳] المختصر فی اخبار البشر۔ ابوالفدا۔ مطبوعہ حسینیہ مصر، ۱۳۲۵ھ، ج ۳، ص ۱۲۳۔

[۴] ایضاً، ج ۳، ص ۱۲۷، ۱۲۸

[۵] و [۶] تاریخ الخمیس لدیار بکری بحوالہ تاریخ ادبیات عرب (انگریزی) نکلسن۔ مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء ص ۴۴۵، ۴۴۶ و المختصر فی اخبار البشر، ج ۳، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

[۷] الفخری فی آلاداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ۔ ابن طقطقی، مطبوعہ رحمانیہ مصر، ۱۳۴۵ھ

ص ۱۱

[۸] الوافی بالوفیات۔ صلاح الدین صفدی۔ ج ۱، ص ۱۷۹ بحوالہ تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء، ج ۴، ص ۴۰۰

[۹] سنقر ترکمان نے، کہ سلجوقیوں کا پروردۂ نعمت تھا، ۵۴۳ھ میں اتابکان شیراز کی خودمختار حکومت فارس میں قائم کی۔ چوتھے اتابک سعد نے ۶۰۰ھ میں غزوں کو شکست دے کر کرمان پر قبضہ کرلیا۔ جب خوارزم شاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو اس نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۶۲۳ھ میں اس جانشین ابوبکر ہوا جو سعدی کا ممدوح تھا۔ اس نے منگولوں سے صلح کر کے اپنی حکومت اور فارس و کرمان کو تباہی سے بچالیا۔ شیراز کو اتابکوں کے عہد میں بڑی رونق حاصل ہوئی (تاریخ ایران (انگریزی)۔ سر پرسی سائیکس۔ مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء، ج ۲، ص ۴۴، ۵۵)

[۱۰] شرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ سعدی شیرازی نے ۱۲۹۱ء میں شیراز میں وفات پائی۔ ان کی تعلیم مدرسۂ نظامیہ بغداد میں ہوئی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ گلستان و بوستان وکلیات سعدی ان سے یادگار ہیں (تاریخ ادبیات ایران (انگریزی، براؤن۔ کیمرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۱ء۔ ج ۲، ص ۵۲۶)

[۱۱] کلیات سعدی۔ مطبوعہ مطبع محمدی بمبئی ۱۹۶۱ء ص ۲۲۱، ۱۷۶۔

[۱۲] تاریخ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی، ج ۴، ص ۴۰۲

[۱۳] ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا آغاز مامون نے کیا۔ معتصم کے عہد میں فوج میں ان کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان کے لئے ایک نیا شہر سامرا (سُرَّ مَنْ رَاٰیٰ) آباد کرنا پڑا۔ خلیفہ نے بھی بغداد کے بجائے نئے شہر میں قیام کیا۔ واثق کے زمانے میں ترکوں کو مزید تغلب حاصل ہوا۔ متوکل نے ان کا زور توڑنے کی کوشش کی مگر ترکوں کی سازش سے شہید ہوا۔ اس کے بعد حکومت میں ان کا اقتدار اتنا بڑھا کہ ان کی مرضی پر خلفاء کے وجود کا انحصار تھا۔ مزید تفصیل کے لیے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی کتاب النظم اسلامیہ (ترجمۂ اردو) مطبوعہ ایوان اشاعت کراچی ۱۹۵۲ء، ص ۷۴ و بعد ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۴] مامون نے ۲۰۵ھ میں طاہر بن حسین کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ اس وقت سے اس کے خاندان میں امارت خراسان قائم ہوئی اور ۲۵۹ھ میں اس خاندان کے امیر محمد بن طاہر کی یعقوب صفار سے شکست پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۷ء، ج ۵، ص ۳۶۸، ۳۶۹۔

[۱۵] سجستان میں خارجیوں کے خلاف رضا کار فوج میں یعقوب اور اس کا بھائی عمرو شامل ہوئے۔ یہ جلد ہی رضا کاروں کے سربراہ ہو گئے۔ طاہریوں کے مقابلہ میں انھیں کامیابیاں ہوئیں اور انھوں نے ۲۵۱ھ میں اپنی حکومت قائم کر لی جو ۲۸۷ھ میں ختم ہوئی (الکامل، ج ۵، ص ۳۳۷، و ج ۶، ص ۹۵)۔

[۱۶] احمد بن طولون نے کہ فرغانہ کا ترک تھا، مصر کے نائب امیر کی حیثیت سے ترقی کر کے مصر وشام پر قبضہ کر لیا اور ۲۶ سال تک خود مختارانہ حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خمارویہ ۲۷۰ھ میں اس کا جانشین ہوا (المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۲، ص ۵۳)

[۱۷] ابو احمد طلحہ الموفق باللہ خلیفہ متوکل کا بیٹا اور اپنے بھائی معتمد کا ولی عہد تھا۔ معتمد برائے نام خلیفہ تھا۔ اصل اقتدار موفق کو حاصل تھا۔ اس نے ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا معتضد ولی عہد ہوا (المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۲، ص ۵۴)

[۱۸] نظری انتشار سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ بنو فاطمہ کے ادعائے خلافت کے بعد بیک وقت تین دعویٰ دارانِ خلافت پیدا ہو گئے۔ عباسیۂ بغداد۔ فاطمیۂ مہدیہ اور امویۂ قرطبہ۔ اور یوں تعدد خلافت کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ چھڑ گیا جو آج بھی مابہ النزاع ہے۔

[۱۹] امیر الامراء کے اقتدار اور چیرہ دستیوں کی تفصیل کے لیے النظم اسلامیہ (اردو) ص ۸۰۔۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۰] محمد بن رائق والی بصرہ ۳۲۴ھ میں امیر الامراء ہوا، اور ۳۳۳ھ میں ناصر الدولہ حمدانی کے حکم سے قتل کر دیا گیا (المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۲، ص ۸۴، ۸۵)

[۲۱] المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۲، ص ۸۴، ۸۵، ۸۸

[۲۲] ابوالشجاع بویہ کا بیٹا احمد معزالدولہ اوراس کے بھائی رکن الدولہ وعمادالدولہ معمولی حیثیتوں سے ابھر کر فارس پر مستولی ہوگئے بعدازاں معزالدولہ نے اہواز پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے وہ بغداد آیا اس پر قابض ہوکر ۳۵۶ھ میں اپنی وفات تک حکومت کی (المختصر فی اخبار البشر ج ۲، ص ۸۷، ۱۰۲،۹۴)

[۲۳] خلافت وسلطنت۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی۔ مطبوعہ جمعیۃ الفلاح کراچی ۱۹۶۳ء ص ۸۵ و بعد۔

[۲۴] بغداد کا آخری بویہی حکمران ابونصر خسرو فیروز ۴۴۰ھ میں منصب امارت پر فائز ہوا۔ ۴۴۷ھ میں طغرل نے اسے گرفتار کر کے اس کی حکومت کا خاتمہ کیا (المختصر فی اخبار البشر ج ۲، ص ۱۶۹، ۱۷۳)

[۲۵] بہاء الدولہ بویہی کا یہ ترکی غلام طغرل کے بغداد سے چلے جانے کے بعد اس پر مستولی ہوگیا۔ خلیفہ قائم عباسی کو نکال کر قصرِ خلافت کو لوٹ لیا۔ جامع منصور میں مستنصر باللہ فاطمی کا خطبہ جاری کیا۔ طغرل نے دوبارہ آکر خلیفہ کو بحال کیا۔ ۴۵۱ھ میں بساسیری کو گرفتار کر کے قتل کرادیا اوراس کی لاش سے سر کاٹ کر بغداد بھیجا جہاں اسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ (المختصر فی اخبار البشر، ج ۲، ص ۱۷۷۔۱۷۹)

[۲۶] ابوتمیم معد المستنصر باللہ ۴۲۷ھ میں خلیفہ ہوا اور ۴۸۷ھ میں وفات پائی۔ اس کا عہد حکومت عوام، امراء، اور خود اس کی مصیبتوں کا دور ہے۔ اس نے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ آخر میں وزیر بدر جمالی نے امور سلطنت کی اصلاح کی اور گو اختیارات وزیر کے ہاتھ میں رہے مگر خلیفہ کو کسی قدر سکون میسر آیا۔ الکامل، ج ۸، ص ۱۷۲ و ۱۷۳۔

[۲۷] محمود غزنوی کی وفات کے بعد طغرل بن سلجوق نے خراسان وایران کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر کے ۴۲۹ھ میں آل سلجوق کی سلطنت قائم کی۔ خلیفہ عباسی نے اسے حسنِ خدمات کے صلے میں سلطان کا خطاب دیا۔ ۴۵۵ھ میں وفات پائی (الکامل، ج ۸، ص ۹۴ و ۹۵)۔

[۲۸] ملک شاہ خاندانِ سلجوق کا تیسرا حکمران ہے۔ اس نے ۴۶۵ھ سے ۴۸۵ھ تک بیس

سال حکومت کی۔اس کے عہد میں سلطنت سلاجقہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس کے بعد زوال شروع ہو گیا(المختصر فی اخبار البشر ج ۲،ص ۱۸۹و ۲۰۳)

[۲۹] ابن خلکان ج ۲،ص ۱۶۴ بحوالہ النظم الاسلامیہ۔ص ۹۶۔

[۳۰] محمود بن محمد بن ملک شاہ نے ۵۱۱ھ سے ۵۲۵ھ تک حکومت کی۔۵۲۱ھ میں مسترشد سے چند جھڑپوں کے بعد صلح ہو گئی اور محمود بغداد سے چلا گیا۔(المختصر فی اخبار البشر ج ۳،ص ۵ و خلافت وسلطنت،ص ۱۳۸،۱۳۹)

[۳۱] ملک شاہ کے پوتے مسعود بن محمد نے ۵۲۵ھ سے ۵۴۷ھ تک حکومت کی اس کے ساتھ ہی آل سلجوق کی عظمت بھی ختم ہو گئی (المختصر فی اخبار البشر، ج ۳،ص ۲۳)

[۳۲] الفخری۔ص ۲۲۲و ۲۲۳

[۳۳] المختصر فی اخبار البشر، ج ۳،ص ۳۷

[۳۴] النظم الاسلامیہ،ص ۱۰۲۔

[۳۵] علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب مدینہ میں ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور طوس میں ۲۰۲ھ میں وفات پائی۔وہ شیعہ اثنا عشریہ کے آٹھویں امام ہیں(المختصر فی اخبار البشر، ج ۲،ص ۲۳و ۲۴)

[۳۶] و [۳۷] مامون نے ۲۰۱ھ میں علی الرضاء کو ولی عہد نامزد کیا۔اہل بغداد اور بنو عباس نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔اس میں اس کے دو چچا منصور اور ابراہیم پیش پیش تھے۔محرم ۲۰۲ھ میں مامون کو معزول کر کے ابراہیم کی بیعت کی گئی مگر جب مامون نے شعار عباسی کو بحال کر دیا تو ۲۰۳ھ میں اہل بغداد نے ابراہیم کی بیعت فسخ کر دی۔اس نے ایک سال گیارہ ماہ خلافت کی اس کے بعد رو پوش ہو گیا۔۲۱۰ھ میں اسے گرفتار کر کے مامون کے سامنے پیش کیا گیا جس نے اسے معاف کر دیا (المختصر فی اخبار البشر، ج ۲،ص ۲۲،۲۳،۲۴،۲۸و ۲۹)

[۳۸] یعقوب خاندان صفاریہ کا بانی ہے۔اس نے معمولی حیثیت سے ترقی کر کے فارس سے لے کر سندھ تک کے وسیع علاقے پر حکومت کی۔اسے غلطی سے خارجی کہا گیا ہے مگر خوارج سے

اس کا کوئی تعلق نہیں اس نے ۲۶۵ھ میں اہواز کے مقام جندی سابور میں وفات پائی (المختصر فی اخبار البشر، ج ۲، ص ۵۲)

[۳۹] سیاست نامہ۔ نظام الملک طوسی، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۱ء، ص ۹۔۱۱۔

[۴۰] اسماعیل بن احمد بن اسد سامانی مشہور ایرانی سپہ سالار بہرام چوبین کی نسل سے تھا۔ ۲۷۹ھ میں ماوراء النہر کا حکمران ہوا۔ صفاریوں کو شکست دینے کے بعد ۲۸۷ھ میں خراسان بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس نے ۲۹۵ھ میں انتقال کیا (المختصر فی اخبار البشر، ج ۲، ص ۶۱)

[۴۱] عمرو بن لیث اپنے بھائی کی وفات کے بعد ۲۶۵ھ میں خراسان، بحستان، کرمان وسندھ کا حکمران ہوا۔ ۲۸۷ھ میں اسماعیل نے شکست دے کر اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا جہاں اس کو بحالت اسیری ۲۸۹ھ میں قتل کر دیا گیا (المختصر فی اخبار البشر۔ ج ۲، ص ۵۲، ۵۸)

[۴۲] واقعہ یہ ہوا کہ عمرو کی فوج ستر ہزار تھی جو جملہ ساز و سامان سے لیس تھی اور اسماعیل کی سپاہ قلت تعداد کے ساتھ بے ساز و سامان بھی تھی۔ جب دونوں فوجیں بلخ کے باہر صف آراء ہوئیں تو عمرو اپنی فوج کی صفوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ اس کا گھوڑا بدکا اور اسے سیدھا لے کر اسماعیل کے وسط لشکر میں پہنچ گیا جہاں اسے گرفتار کر لیا گیا اور اس کی فوج بے لڑے بھڑے بھاگ کھڑی ہوئی (مزید تفصیل سیاست نامہ طوسی کی فصل سوم میں ملاحظہ فرمائیں)

[۴۳] محمود ۳۶۱ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ سبکتگین کے بعد ۳۸۷ھ میں غزنی کا حکمران ہوا اور جب ۴۲۱ھ میں مرا تو خراسان، کرمان۔ سندھ و بحستان کے وسیع علاقوں پر اس کی حکومت تھی۔ (الکامل، ج ۷، ص ۳۴۹ و ۳۴۷)۔

[۴۴] ابو علی منصور بن عزیز باللہ الملقب بہ حاکم چھٹا فاطمی خلیفہ ۳۸۶ھ میں خلیفہ ہوا اور ۴۱۱ھ میں غائب ہو گیا غالباً اسے اس کی بہن ست الملک نے امراء سے سازش کر کے قتل کرا دیا تھا۔ وہ مجموعۂ اضداد تھا۔ اس کے احکام لوگوں کے لیے آج بھی باعث حیرت ہیں (المختصر فی اخبار البشر، ج ۲، ص ۱۵۱) مزید مطالعہ کے لیے تاریخ فاطمین مصر مولفہ ڈاکٹر زاہد علی ملاحظہ فرمائیں۔

[۴۵] خلافت وسلطنت۔ ص ۱۱۰ (محمود نے حاکم کا خط بغداد بھیج دیا تا کہ اسے منظر عام پر جلا دیا جائے اور فاطمی سفیر کو قتل کرادیا)

[۴۶] علاء الدین محمد خوازم شاہ نے سرحد عراق سے ترکستان اور غزنہ سے سرحد ہند تک کے وسیع علاقہ پر اکیس سال حکومت کی۔ ۶۱۷ھ میں تاتاریوں سے شکست کھا کر بھاگا اور ماژندران کے قریب ایک جزیرہ میں کسمپرسی کے عالم میں جان دی (المختصر فی اخبار البشر، ج ۳، ص ۱۲۷)

[۴۷] المختصر فی اخبار البشر ج ۳، ص ۱۱۸

[۴۸] قم میں پیدا ہوا۔ بغداد میں نشونما پائی اور ۶۲۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ امور مملکت کا ماہر دفاتر کے اصول کا عالم، ادیب و راوی تھا۔ حضرت مقدادؓ بن اسود کندی کے خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ وہ خلیفہ ناصر، ظاہر اور مستنصر کے عہد میں وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہا (الفخری ص ۲۳۹۔۲۴۱)

[۴۹] ایضاً، ص ۱۱۰

[۵۰] یوسف بن تاشفین ۴۶۲ھ میں مرابطین کا امیر ہوا۔ مغرب اقصیٰ اور اندلس کو مسخر کیا اور مراکش کا شہر آباد کر کے اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ وہ دوراندیش، دیندار، تجربہ کار اور سیاست داں تھا۔ اندلس کی زوال پذیر اسلامی حکومت کو اس نے نئی زندگی بخشی اور جنگ زلاقہ میں ۴۷۹ھ میں عیسائیوں کو شکست دے کر اندلس کے مسلمانوں کو ان کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی۔ ۴۸۴ھ میں اس نے اندلس کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا جس پر اس کے بعد اس کے جانشینوں نے حکومت کی۔ یوسف نے ۳۸ سال حکومت کر کے ۵۰۰ھ میں وفات پائی۔ اسے خلیفہ مستظہر باللہ نے خلعت اور اجازت فرمانروائی عطاء کی (المختصر فی اخبار البشر ج ۲، ص ۱۷۵، ۱۹۸، ۲۰۰ و ۲۲۱)

[۵۱] مشہور ترک قبیلہ البری کے سردار کا بیٹا بچپن میں بھائیوں کی رقابت سے اسیر ہو کر بخارا میں فروخت ہوا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے اسے خریدا۔ اپنی لیاقت سے ترقی کر کے منصب بلند پر پہنچا اور بدایوں کا گورنر ہوا۔ ایبک کی وفات کے بعد ۶۰۷ء میں دہلی کا سلطان ہوا۔ اس نے

۶۳۳ھ میں وفات پائی۔ برعظیم ہند و پاکستان میں اسلامی حکومت کا استحکام اس کی حسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔ (طبقاتِ ناصری، قاضی منہاج الدین سراج۔ مطبوعہ کابل ۱۹۶۳ء، ج اول، ص ۴۴۰و بعد)

[۵۲] انتظام سلطنت دہلی (انگریزی) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۵۸ء، ص ۲۷ و ۲۸ (مستعصم باللہ کا نام سلطنت دہلی کے سکوں پر جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے اخیر عہد تک کندہ کیا گیا۔)

[۵۳] دشت قپچاق کا ترکمان بیبرس، امیر ایدگین بندقداری صالحی کا غلام تھا۔ اسے آخری ایوبی حکمران مصر الملک الصالح ایوب نے لے لیا تھا۔ وہ اپنی لیاقت سے ترقی کے مدارج طے کر کے ایوبیوں کے مملوک امراء میں جلد خاصا اہم ہو گیا۔ قطز، حاکم مصر و شام کو ۶۵۸ ھ میں قتل کر کے الملک الظاہر کے لقب سے سلطان مصر و شام ہوا۔ ۶۷۲ ھ میں وفات پائی۔ اس نے بلاد نوبہ اور دیگر مقامات فتح کئے۔ مملوک سلاطین مصر میں اس کے عہد کو امتیاز حاصل ہے۔ (المختصر فی اخبار البشر ج ۴، ص ۱۰، ۱۱) خلافتِ عباسیہ کا احیاء مصر میں اسی نے کیا (ایضاً، ج ۳، ص ۲۱۳)

[۵۴] ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب بصری، ماوردی ۳۶۴ ھ میں پیدا ہوا اور ۴۵۰ ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ آل بویہ کے دور اقتدار میں بغداد کا شافعی المذہب قاضی رہا اور فقیہہ و مصنف کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔ اس کی اصل شہرت اس کی کتاب الاحکام السلطانیہ کی وجہ سے ہے جو اسلامی سیاسی افکار پر ہر دور میں قابل استناد کتاب سمجھی گئی ہے (البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مطبوعہ لاہور ۱۴۰۴ھ، ج ۱۲، ص ۸۰)

[۵۵] الاحکام السلطانیہ۔ ابوالحسن الماوردی۔ مطبوعہ مصطفیٰ بابی حلبی مصر ۱۳۸۰ھ، ص ۳۳۔

[۵۶] حجۃ الاسلام امام محمد بن محمد طوس میں ۴۵۰ ھ میں پیدا ہوئے۔ نیشاپور اور دوسرے مقامات میں تحصیل علم کی۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں مسندِ درس پر متمکن ہوئے۔ ۴۸۸ھ میں درس وتدریس سے کنارہ کش ہو کر بیت المقدس اور مصر و شام کے سفر کیے اور ۵۰۵ ھ میں وفات پائی۔ ان کی کثیر التعداد تصانیف میں احیاء علوم الدین سب سے ممتاز ہے (المختصر فی اخبار البشر ج ۲، ص

(۲۲۵

[۵۷] تاریخ الخلفاء، سیوطی، مطبوعہ اصح المطابع کراچی، ص ۳۵۶ و ۳۵۷۔

[۵۸] شیخ الاسلام جلال الدین عبدالرحمٰن بالائی مصر کے مقام سیوط میں ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں پیدا ہوئے اور جزیرہ روضہ میں ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں وفات پائی۔ ان کی ذات عہد مملوکیہ کی علمی سرگرمیوں کا مثالیہ ہے۔ وہ مفسر، محدث، فقیہ، فلسفی، مورخ، لغوی اور سوانح نگار تھے۔ انھوں نے پانچ سو کے قریب کتابیں تالیف کیں جن میں الاتقان فی علوم القرآن، تفسیر جلالین، تاریخ الخلفاء، طبقات المفسرین، حسن المحاضرہ فی تاریخ المصر و القاہرہ مشہور ہیں (تاریخ ادبیاتِ عرب (انگریزی) نکلسن۔ ص ۴۵۴ و ۴۵۵۔)

[۵۹] تاریخ الخلفاء۔ ص ۳۵۶ و بعد۔

[۶۰] تاریخ التشریع الاسلامی۔ محمد الخضری، مطبوعہ استقامت مصر ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۴

[۶۱] اسلامی اصول فقہ کی اصل (انگریزی) جوزف شافت۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۶ و بعد

[۶۲] تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۱۸۰ و بعد۔

[۶۳] نعمان بن ثابت امام اعظم ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ انھوں نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور ان سے حدیث روایت کی۔ وہ فقیہِ عراق اور اہل سنت کے چار اماموں میں سے پہلے امام ہیں (البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔ ج ۱۰، ص ۱۰۷)

[۶۴] ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ امام اعظم کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کے شاگردوں میں امام محمد اور امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں۔ وہ دنیائے اسلام کے پہلے قاضی القضاۃ تھے (البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۱۸۰)

[۶۵] مالک بن انس ۹۳ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ وہ اہل سنت کے دوسرے امام ہیں امام شافعی اور امام محمد ان کے مشہور شاگرد ہیں۔ وہ فقیہ و محدث اہل حجاز اور امام دارالہجرت کہلاتے ہیں (البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰، ص ۱۷۴)

[٦٦] محمد بن ادریس شافعی قرشی ۱۵۰ھ میں بمقام غزہ (فلسطین) پیدا ہوئے۔ ان کی وفات ۲۰۴ھ میں مصر میں ہوئی۔ انھوں نے امام مالک سے فقہ اہل حجاز اور امام محمد سے فقہ اہل عراق حاصل کی۔ وہ اہل سنت کے تیسرے امام ہیں (البدایہ والھایہ۔ ج ۱۰۔ ص ۲۵۱)

[٦٧] اہل سنت کے چوتھے امام احمد بن حنبل شیبانی ۱۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۴۱ھ میں بغداد میں ہوا۔ وہ امام شافعی اور امام ابو یوسف کے شاگرد تھے اور امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے محدث تھے۔ فتنۂ خلق قرآن میں مامون، معتصم اور واثق نے انھیں ۱۵ سال تک سخت سے سخت اذیتوں میں مبتلا رکھا مگر وہ اپنے موقف پر ثابت قدم رہے (البدایہ النہایہ۔ ج ۱۰، ص ۳۲۵)

[٦٨] داؤد بن علی اصفہانی ظاہری کوفہ مین ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں ۲۹۷ھ میں انتقال کیا۔ وہ ظاہر حدیث پر عمل کرتے تھے اور قیاس کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ان کا فقہی مسلک پانچویں صدی تک باقی رہا۔ (تاریخ التشریع الاسلامی۔ محمد الخضری۔ ص ۲۹۷)

[٦٩] ابو جعفر محمد بن جریر طبری ۲۲۴ھ میں آمل میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ وہ بہت بڑے مفسر، مورخ، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کا فقہی مسلک پانچویں صدی ہجری کے نصف تک معمول بہ رہا بعد ازاں اس کا چلن ختم ہو گیا (تاریخ التشریع الاسلامی، ص ۲۷۱، البدایہ والنہایہ، ج ۱۱، ص ۱۱۰)

[٧٠] مشہور اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کا پوتا عبد الرحمٰن ۱۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ عباسیوں کے کارندوں سے بھاگ کر شمالی افریقہ سے ہوتا ہوا ۱۳۸ھ میں اندلس پہنچا اور وہاں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ اس نے ۱۷۱ھ میں وفات پائی مگر جو حکومت قائم کر گیا تھا وہ اس کے خاندان میں ۴۲۵ھ تک باقی رہی (الکامل، ج ۵، ص ۸۳ و بعد)

[٧١] حضرت حسنؓ بن علیؓ کے پڑپوتے ادریس اول نے عباسیوں کے خوف سے شمالی افریقہ میں پناہ لی اور مغرب اقصیٰ کے بربر قبائل کی مدد سے پہلی علوی حکومت قائم کی جو ۱۷۲ھ میں قائم ہوئی اور اس کے خاندان میں ۳۴۲ھ تک باقی رہی جب کہ انھوں نے بنی فاطمہ و بنی امیہ کی مخالفتوں میں

امویوں کی حمایت کی، اسی زمانہ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ (الکامل، ج ۵، ص ۷۶)

[۷۲] تاریخ ادبیات عرب (انگریزی) نکلسن۔ص ۴۴۶ و ۴۴۷

[۷۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت اور ترک دنیا سے نہایت سختی کے ساتھ صحابہ کرامؓ کو منع فرمایا۔ ایک موقع پر ایک صحابی سے فرمایا: وعلیک با لجهاد فانه رهبانية الاسلام" تم جہاد میں حصہ لو کہ اسلام کی رہبانیت جہاد ہے)، دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا: انی لم اومر با لو هبا نیة (مجھے ترک دنیا یعنی رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا)۔ (مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۸۲ و ۲۶۶ و ج ۶، ص ۲۲۶ و سنن دارمی کتاب النکاح، حدیث ۳)

[۷۴] تشکیل جدید الٰہیات (خطبات اقبال) ترجمہ سید نذیر نیازی۔ مطبوعہ بزم اقبال، لاہور ۱۹۵۸ء۔ ص ۲۳۱ و بعد)

(المعارف، لاہور ۱۹۶۸ء)

○○○

فاتح صِقلّیہ اسد بن فُرات

اسد بن فُرات کی شخصیت بڑی پہلودار تھی، وہ ایک محدث، فقیہہ، قاضی اور عالم ہی نہ تھے، بلکہ ایک سپہ سالار، امیر البحر اور فاتح بھی تھے۔ اسدؔ کی زندگی کے اسی عسکری پہلو سے ہم کسی قدر آئندہ سطروں میں بحث کریں گے۔ مگر ان کی اس حیثیت پر گفتگو کرنے سے پہلے مغربی سمندروں میں مسلمانوں کی جاں سپاریوں کا اجمالی جائزہ لینا ضروری ہے۔

اگرچہ مسلمانوں کی بحری معرکہ آرائیوں کا آغاز عہد فاروقی میں ہوا اور عامل بحرین حضرت علاء بن حضرمی نے ایران پر بحری راستے سے حملہ کیا، مگر جہازوں کی کمی کے باعث اس مہم کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور حضرت عمرؓ نے مزید بحری پیش قدمیوں کی اجازت نہ دی[۱]۔ اسلامی بحریہ کا باقاعدہ آغاز دراصل حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوا۔ اسی اسلامی بیڑے نے ۲۸ھ میں قبرص کے جزیرے پر قبضہ کیا[۲]۔ اس جنگ میں شامی بیڑے کی قیادت امیر شام حضرت معاویہؓ نے کی، اور مصری بیڑے کی قیادت حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح والیٔ مصر نے کی۔ اس کے بعد جب ۳۱ھ میں جنگ ذات الصواری میں رومیوں کے بحری بیڑے سے اسکندریہ کے قریب معرکہ آرائی ہوئی تو مصر و شام کے مشترکہ بحری بیڑے نے رومیوں کو عبرتناک شکست دی[۳]۔ جنگ ذات الصواری کی شکست دراصل بحر روم سے رومی بحریہ کی سیادت کا خاتمہ تھی۔ بقول حتی یہ جنگ رومیوں کے حق میں دوسری ''جنگ یرموک'' ثابت ہوئی[۴]۔ اب شام و مصر کے سواحل اسلامی بحری افواج کی جولاں گاہ بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ مسلمان بحر روم کے متعدد اہم جزائر پر قابض ہو گئے۔

حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں نے وسیع پیمانے پر رومیوں کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ۴۶ھ میں امیر البحر عبداللہ بن قیس کی سرکردگی میں والی مصر حضرت معاویہؓ بن حُدیج نے دوسو جہازوں کا بیڑا صقلیہ پر حملے کے لیے روانہ کیا[۵] اور یوں شمالی افریقہ اور شام و مصر کے سواحل بحری معرکہ آرائیوں کی جولاں گاہ بن گئے۔ ۴۹ھ میں رومیوں نے سواحل شام پر بڑے وسیع پیمانے پر حملہ کیا مگر اسلامی بیڑے کے ہاتھوں انہیں شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا[۶]۔ اسی زمانے میں قسطنطیہ پر مسلمانوں نے بحری راستے سے حملہ کیا اور شہرِ قیصر کا دوبارہ محاصرہ کیا[۷]۔ حضرت معاویہؓ ہی کے زمانے میں شام میں عکا کے ساحلی شہر میں جہاز سازی کا کارخانہ قائم ہوا۔ اس سے پہلے ایسے کارخانے صرف مصر میں تھے۔ ان کارخانوں کو دارالصناعۃ کہتے تھے[۸]۔ مغربی زبانوں کا درسنہ یا آرسنل اسی دارالصناعۃ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔[۹]

اس کے بعد رومیوں کے خلاف بحری جنگوں میں شدت پیدا ہوئی اور جنادہ بن ابی امیہ ازدی نے جزیرۂ روڈس پر قبضہ کرلیا۔ ۵۴ھ میں قسطنطیہ کے قریب بحیرۂ مارمرہ میں جزیرۂ اروار پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ پھر کریٹ پر حملہ کیا گیا۔[۱۰]

عہد عبدالملک میں والی افریقہ حسان بن نعمان نے تونس کے مقام پر جہاز سازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا[۱۱]۔ والی افریقہ موسیٰ بن نصیر لخمی نے ۸۴ھ میں اس کارخانے کو وسعت دی اور بحری بیڑے کو یوں مزید استحکام بخشا کہ تونس کے شہر کو جو ساحل سمندر سے بارہ میل دور تھا ساحل سے ملا دیا[۱۲]۔ اسی طرح بنو مروان کے عہد میں ہی شام میں عکا کے دارالصناعۃ کو بعض جنگی مصلحتوں کی بنا پر صور منتقل کردیا گیا۔[۱۳]

موسیٰ بن نُصیر کے عہد امارت میں بحر روم کے جزائر پر کامیاب اور مسلسل حملوں کے سلسلے دوبارہ شروع ہوئے[۱۴]۔ موسیٰ کا حملۂ اندلس ان کی بحری معرکہ آرائیوں کا نقطۂ عروج تھا۔

ولید کے عہد میں مسلمان بحری بیڑے اپنی کارکردگی اور وسعت کے لحاظ سے

بڑی اہمیت کے حامل تھے۔[۱۵]

ولید کے جانشین سلیمان کے زمانے میں اسلامی بحریہ نے رومیوں پر کامیاب حملے کیے اور ۹۸ھ میں مسلمہ کی سرکردگی میں قسطنطیہ کا محاصرہ کیا گیا جو ۹۹ھ میں سلیمان کی وفات تک جاری رہا۔[۱۶]

اسلامی بحری افواج کی ترتیب و تنظیم کا کام عہد ہشام میں ازسرنو کیا گیا اور ۱۱۷ھ میں تونس کے بحری مرکز کو مضبوط کیا گیا[۱۷]۔ عہد اموی کے بعد عباسیوں کے دور میں خلافت کے مختلف علاقوں میں خودمختار یا نیم خودمختار حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ خصوصاً مغربی صوبوں میں ان کے اقتدار کا نقشہ نہ جم سکا اور اندلس میں خودمختار امارت [۱۸] اور مغرب اقصیٰ میں آل حسنؓ کی ادریسی حکومت وجود میں آئیں[۱۹]۔ اس خوف سے کہ مبادا یہ حریف طاقتیں مصر کی جانب پیش قدمی کریں۔ ۱۸۴ھ میں ہارونِ اعظم نے شمالی افریقہ کی حکومت ایک نامور عرب سردار ابراہیم بن اغلب تمیمی کو چالیس ہزار دینار سالانہ کے عوض موروثی طور پر عطاء کردی[۲۰]۔ اس اغلبی سلطنت کی بحری معرکہ آرائی ہماری اس گفتگو کا موضوع ہے۔

۱۹۶ھ میں ابراہیم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ امیر ہوا۔ اس کے عہد میں ۱۹۸ھ میں صقلیہ والوں سے مسلمانوں کی مصالحت ہوگئی اور فریقین نے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیا[۲۱]۔ اس کا جانشین اس کا بھائی زیادۃ اللہ (۲۰۱ھ تا ۲۲۳ھ) ہوا۔ زیادۃ اللہ کو اپنے ابتدائی عہد حکومت میں خانہ جنگیوں کا سامنا کرنا پڑا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۰۹ھ میں ملک کا بڑا حصہ اس کے قبضے سے نکل گیا اور صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے پاس رہ گیا[۲۲]۔ اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر صقلیہ کے رومی امیرالبحر فیمی نے افریقہ کے ساحل پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کردیا اور ۱۹۸ھ کے دس سالہ معاہدۂ متارکۂ جنگ کو بالائے طاق رکھ دیا[۲۳]۔ جب زیادۃ اللہ کو داخلی انتشار سے فرصت ملی تو اس نے رومیوں کی طرف توجہ کی۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں رومی امیرالبحر صقلیہ فیمی ایک جرم کی پاداش میں معتوب ہوا۔ مایوسی اور غصہ کے عالم میں اس کی آتش انتقام بھڑک اٹھی۔ وہ

سیدھا قیروان آیا اور زیادۃ اللہ سے صقلیہ پر حملہ آور ہونے اور رومیوں کے خلاف جنگ کرنے کی درخواست کی۔ اس کے ساتھ ہی صقلیہ سے رومی سفارت بھی آئی اور تجدید معاہدہ کی خواہاں ہوئی۔ اس مسئلہ سے متعلق کسی فیصلہ تک پہنچنے کی غرض سے زیادۃ اللہ نے مجلس مشاورت طلب کی۔ حاضرین میں قاضی القضاۃ اسد بن فرات بھی تھے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ اہل صقلیہ نے معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے جزیرہ پر حملہ کر کے اسے دارالاسلام بنا لینا چاہئے۔ طویل مباحثہ کے بعد اس رائے کو تسلیم کیا گیا۔ اور زیادۃ اللہ نے ایک بحری مہم تسخیرِ صقلیہ کی غرض سے قاضی اسد بن فُرات کی سرکردگی میں روانہ کی۔ [۲۴]

جزیرۂ صقلیہ پر مسلمانوں کا یہ حملہ اپنی نوعیت کا پہلا حملہ نہ تھا بلکہ اس سے پہلے بھی مسلمان اس پر چودہ پندرہ بار حملہ آور ہو چکے تھے [۲۵]۔ اور اس کے ایک حصے سرقوسہ پر ان کا عارضی طور پر قبضہ بھی رہا تھا۔ مگر اب کی بار وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ پورے جزیرے کو دارالاسلام بنا لیں۔

اس مہم کے سربراہ قاضی اسد کی کنیت ابو عبداللہ والد کا نام فرات اور دادا کا نام سنان تھا۔ ان کا خاندان بنو سلیم بن قیس کے موالی میں سے تھا۔ اسد کا آبائی وطن نیشاپور (ایران) تھا۔ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے والد ہجرت کر کے حران (دیار بکر) چلے آئے تھے۔ اسد یہیں ۱۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر دو ہی سال کی تھی کہ ۱۴۴ھ میں ان کے باپ محمد بن اشعث کے ہمراہ شمالی افریقہ چلے گئے، اسد بھی ان کے ساتھ تھے۔

اسد پانچ سال تک قیروان میں رہے، ابھی وہ سات برس کے ہی تھے کہ تونس کے ایک گاؤں میں ان کے والد نے سکونت اختیار کر لی۔ اسد نے زندگی کی دس بہاریں یہیں گزار دیں۔ اس زمانہ میں انہوں نے قرآن کی تعلیم مکمل کی۔ سترہ سال کے ہوئے تو تونس شہر کے مشہور عالم علی بن زیاد سے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل کی۔ وہ تیس سال کی عمر تک شمالی افریقہ میں مختلف علوم و فنون کے حصول میں منہمک رہے۔ بعد ازاں مزید تحصیل علم

کی غرض سے ۱۷۲ھ میں اسد نے مشرق کا رخ کیا۔ اس زمانے میں حجاز اور عراق علومِ اسلامیہ کے گہوارے تھے۔ اسد نے ان دونوں چشمہ ہائے علم وحکمت سے فیض اٹھایا۔ وہ پہلے علم حدیث کی تحصیل کی غرض سے حجاز آئے اور مدینہ منورہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالک کا حلقۂ درس نہ صرف حجاز میں بلکہ پورے عالم اسلام میں اہل مدینہ کی روایات کا امین تھا۔ اہل مصر، افریقہ، مغرب اور اندلس کو اس درسگاہ سے تعلق خصوصی تھا۔ چنانچہ اسد بھی اپنے ہم وطنوں کی تقلید میں امام صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ یہاں انہوں نے ان سے مؤطا کا درس سبقاً سبقاً لیا۔ اس کے بعد انہوں نے استاد سے مزید تحصیل علم کی خواہش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر کہ ''وہی تمہارے لیے بھی کافی ہے، جو میں دوسروں کو دے رہا ہوں''۔ ان کے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد اسد کو عراق جا کر فقہ حنفی کی تحصیل کا شوق ہوا۔ استاد سے اجازت لے کر رخصت ہوئے اور بغداد آئے۔ امام اعظمؒ کے تلامذہ میں سے امام ابو یوسف، امام محمد اور امام اسد بن عمرو کے حلقہائے درس میں شریک ہوئے اور ان سے فقہ حنفی پڑھی، امام محمد کو ان سے بڑی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی، اور عام درس میں شرکت کے علاوہ اسد کو رات کے وقت بھی وہ پڑھاتے تھے، اور ان کی مالی اعانت سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ابھی اسد عراق میں حصولِ علم میں مصروف ہی تھے کہ ۱۷۹ھ میں امام مالک نے مدینہ میں وفات پائی۔ اس کے بعد ہی اسد عراق سے وطن روانہ ہوئے۔ راہ میں مصر پڑتا تھا۔ یہاں امام مالک کے ممتاز شاگرد امام عبدالرحمٰن بن قاسم موجود تھے۔ اسد نے فقہ مالکی کی مزید تحصیل کی غرض سے ابن قاسم کے درس میں شرکت کی اور ان سے روزانہ فقہی مسائل پر سوالات کرتے، وہ جو جوابات دیتے، اسد سوال و جواب کی ترتیب سے لکھ لیتے تھے۔ یہ سوال و جواب ساٹھ اجزاء میں مدون ہو گئے اور یہی کتاب دنیا میں فقہ مالکی کی سب سے پہلی کتاب قرار پائی۔ اسد نے اس مجموعے کا نام الاسدیہ رکھا۔ اس کے بعد اسد ۱۸۱ھ میں مصر سے قیروان واپس آئے۔

قیروان میں اسد نے موطا امام مالک اور الاسدیہ کا درس جاری کیا۔ افریقہ و مغرب کے جلیل القدر علماء نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت پورے علاقے میں پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب الاسدیہ جسے المدونہ بھی کہتے ہیں مشہور ہوگئی۔ درس و تدریس کے فرائض کے علاوہ اسد کے سپرد افتاء کی خدمت بھی تھی۔ افتاء میں ان کی روش یہ تھی کہ وہ عموماً فقہ حنفی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اس عہد میں جزئیات جس قدر فقہ حنفی کی منضبط ہوگئی تھیں اتنی فقہ مالکی کی نہ ہوئی تھیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسد نرے مقلد نہ تھے بلکہ مسائل فقہی میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور چونکہ فقہ حنفی ان کے اجتہاد سے قریب تر تھی، اس لیے اسی پر ان کا مدار زیادہ تھا۔

۱۹۱ھ میں افریقہ کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن غانم کی وفات کے بعد ابومحرز اس منصب پر فائز ہوئے مگر افریقہ کے علماء و فضلاء کا برابر اصرار تھا کہ اسد جیسے جلیل القدر عالم کی موجودگی میں منصب قضاء پر کسی اور کو فائز کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے والی افریقہ زیادۃ اللہ نے ۲۰۳ھ میں اسد کو مساوی حیثیت سے عہدۂ قضاء میں ابومحرز کا شریک کار بنا دیا اور ۲۱۱ھ میں ابومحرز کو اس عہدے سے معزول کر کے اسد کو بلا شرکت غیرے پورے افریقہ اور مغرب کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ [۲۶]

اسد کی علمی جلالتِ شان مسلّم، مگر ان کی اصل شہرت ان کی فوجی مہارت اور عسکری قیادت کے باعث ہے۔ ان کی عسکری قیادت کی جولاں گاہ سرزمین صقلیہ ہے۔ اسد کی سرکردگی میں اسلامی لشکر افریقہ کے ساحلی شہر سوسہ سے یوم شنبہ، ۱۵ ربیع الاول ۲۱۲ھ (مطابق ۱۰ جون ۸۲۷ء) کو روانہ ہوا۔ خود زیادۃ اللہ اور اس کے اعیانِ دولت ساحلِ سمندر تک لشکر کی مشایعت میں آئے۔ جب لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو دس ہزار جاں باز مجاہدین سے جو عرشۂ جہاز پر کھڑے اپنی تلواروں کو لہرا رہے تھے، امیر عسکر نے یوں خطاب کیا:

''لوگو! میرے آباء و اجداد آج تک کبھی والی مقرر نہیں ہوئے اور میں بھی اس منصبِ جلیلہ پر فائز نہ کیا جاتا اگر علم کو اپنا زیور نہ بناتا۔ اس لیے علم کی تحصیل میں سعی و کوشش

کرو۔ اسی میں جاں فشانی کرو اور اس کے ہو رہو۔ اس راہ میں مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، تمہیں ان سے خائف نہ ہونا چاہئے۔ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ اس سے تم دین و دنیا دونوں میں سر بلند ہو سکتے ہو''۔

اس کے بعد اس بیڑے نے لنگر اٹھائے۔ یہ بیڑا سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا، جن میں سات سو سوار اور دس ہزار پیادہ فوج تھی۔ اسد نے صقلیہ جانے کے پامال راستے کو اختیار نہ کیا جو سر قوسہ کو جاتا تھا اور جس پر عموماً مسلمان حملہ آور ہوتے تھے بلکہ انہوں نے صقلیہ کے ایک اور شہر مازر کا رخ کیا، جہاں فوجی استحکامات نسبتہً کم تھے۔ تین دن کی مسافت طے کر کے یہ اسلامی بیڑا ۱۸ ربیع الاول کو مازر کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔ شہر پر بڑی آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ اسد نے یہاں مورچہ بندی کی اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ مگر جب تین دن تک دشمنوں کا کوئی دستہ نہ آیا تو انہوں نے شہر پر مسلمان حاکم مقرر کر کے آگے پیش قدمی کی۔ اگلا پڑاؤ مرج پر ہوا۔ یہاں دشمن پہلے سے موجود تھا۔ اسلامی لشکر بھی ٹھہر گیا۔ مرج میں جو عیسائی لشکر خیمہ زن تھا اس کی مجموعی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی، اور اس میں قسطنطنیہ کی مرکزی امدادی فوج اور صقلیہ کی رومی فوج کے علاوہ وینس کی فوج بھی شامل تھی اس ٹڈی دَل کے مقابلے میں اسلامی لشکر کی کل تعداد دس ہزار تھی۔ جب فریقین میدانِ جنگ میں اترے تو اسد نے مسلمان مجاہدین کو مخاطب کر کے کہا:

''مجاہدو! یہ ساحل کے وہی کفار ہیں جو روپوش ہو کے یہاں جمع ہو گئے ہیں، یہ تو تمہارے بھاگے ہوئے غلام ہیں''۔

اس کے بعد وہ علمِ جنگ لے کر دشمن کی صفوں پر حملہ آور ہوئے، بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ خود امیر عسکر اسد شدید زخمی ہوئے، لیکن زخموں کے باوجود انہوں نے علم ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ مسلمانوں کو کامل فتح نہ حاصل ہو گئی۔ جنگ میں عیسائی فوج کا بڑا حصہ کام آیا، جو باقی بچے وہ یا تو قید ہوئے یا پھر بھاگ گئے۔ مرج کی فتح سے آگے بڑھنے کے راستے صاف ہو گئے اور اسلامی فوج نے قرب و جوار کے

ایک بڑے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اور بعض مقامی سرداروں سے جزیہ پر صلح کر کے انہیں ان کی حکومتوں پر باقی رکھا۔ اس کے بعد اسد نے اپنی فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے کر کے جزیرے میں پھیلا دیئے۔ اور خود آگے بڑھ کر صقلیہ کے پایۂ تخت سرقوسہ کا محاصرہ کرلیا۔ اسی زمانہ میں افریقہ سے امدادی فوج بھی آ گئی اس لیے اسد کو بری و بحری راستوں سے شہر کے محاصرہ میں خاصی سہولت ہوئی۔ مگر دورانِ محاصرہ سرقوسہ کی مدد کے لیے ایک بڑی رومی فوج آ گئی۔ اب اسلامی لشکر کی کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف اہل شہر اور دوسری طرف یہ نیا عیسائی لشکر اور ان کے بیچ میں مسلمان۔ اس نازک صورتِ حال کا تدارک یوں کیا کہ اسد نے فوج اسلام کے گرد وسیع اور گہری خندق کھدوائی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک بڑی کھائی تیار کروائی اور یوں دونوں عیسائی افواج کے درمیان سد سکندری کی طرح حائل ہوگئے۔ محاصرہ خاصا طویل ہوگیا اور جہاں محصورین کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں وہیں لشکر اسلام نے بھی بڑی تکلیفیں اٹھائیں، اسلامی لشکر پر سب سے بڑی افتاد یہ پڑی کہ محاصرہ کے دوران میں امیر لشکر قاضی اسد بن فراتؒ نے بہتر (۷۲) سال کی عمر میں ربیع الآخر ۲۱۳ھ میں زخموں سے انتقال کیا۔ انہیں اسی سرزمین میں سپردِ خاک کیا گیا اور بطورِ یادگار ان کی قبر پر ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ جب اسد کی وفات کی خبر افریقہ پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ زیادۃ اللہ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ یہاں بھی ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ قیروان کی یہ مسجد آج بھی موجود ہے اور اس پر اسد بن فرات کا نام کندہ ہے۔ اسد نے صقلیہ کے جن مقامات پر قبضہ کیا وہاں باقاعدہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے مازر کو اپنا مرکز بنایا اور مازر سے سرقوسہ تک کے علاقے زیرِ نگیں کیے۔ بعض قلعوں میں اپنے آدمی متعین کئے اور بعض قلعوں کو ان کے سابق مالکوں کی تحویل میں جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر رہنے دیا۔ اسد کا یہ نظام بعد کے مسلمان گورنروں نے بھی ایک عرصہ تک باقی رکھا۔

مختصر یہ کہ اسد بن فرات جب بساطِ علم و قضاء سے اٹھ کر میدانِ جنگ اور دربار حکومت میں آئے تو انہوں نے اپنی پامردی، دوراندیشی اور شجاعت سے یہ ثابت کردیا کہ

وہ ایک بہادر سپاہی، ماہر سپہ سالار اور مدبر گورنر بھی ہیں۔ ایسے جامع الصفات بزرگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

حواشی

[۱] محمد بن جریر طبری۔ تاریخ الامم والملوک۔ مطبوعہ دارالمعارف، مصر ۶۴-۱۹۶۳ء، جلد چہارم، ص ۱۷۹، ۲۵۸ و ۲۵۹۔

[۲] ایضاً، ص ۲۵۸۔

[۳] ایضاً، ص ۲۸۸، ۲۹۲۔

[۴] فلپ کے حتی۔ ہسٹری آف دی عربس (انگریزی)۔ مطبوعہ میکملن اینڈ کو، نیویارک ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۱۔

[۵] احمد بن یحییٰ بلاذری۔ فتوح البلدان، مطبوعہ مطبعہ استقامت، مصر ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۷۔

[۶] ایضاً، ص ۱۲۴۔

[۷] طبری، جلد پنجم، ص ۲۳۲۔

[۸] بلاذری، ص ۱۲۴۔

[۹] سید سلیمان ندوی، لغات جدیدہ۔ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۳۵۶ھ، ص ۱۱ و جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ مطبوعہ دارالہلال، مصر ۱۹۵۸ء، جلد اول، ص ۲۱۹ (جدید عربی میں اسے ترسانہ اور ترسنہ کہتے ہیں)۔

[۱۰] بلاذری، ص ۲۳۷ و طبری جلد پنجم، ص ۲۹۳۔

[۱۱] ابن خلدون۔ المقدمہ۔ مطبوعہ مکتبۂ تجاریۂ کبری، مصر (س ن)، ص ۲۵۳۔

[۱۲] ابن ابی الدنیا قیروانی، المونس فی اخبار افریقیہ وتونس۔ مطبع دولت تونسیہ، تونس، ۱۲۸۶ھ، ص ۳۸۔

[۱۳] بلاذری، ص ۱۲۵، (بلاذری کی عام روایت سے پتا چلتا ہے کہ ہشام دارالصناعۃ کو عکا سے صور لے گیا۔ ایک دوسری روایت سے جو واقدی سے مروی ہے یہ پتا چلتا ہے کہ جب بنو مروان منصب خلافت پر فائز ہوئے تو دارالصناعۃ کو عکا سے صور لے گئے۔ متوکل کے عہد تک دارالصناعۃ صور ہی میں رہا)۔

[۱۴] عزالدین ابن الاثیر۔ الکامل فی التاریخ۔ مطبوعہ بریل لائیڈن ۱۸۶۶ء جلد ۴، ۲۱۶۔

[۱۵] ابن الدنیاء القیروانی، المونس فی اخبار افریقیہ وتونس، ص ۳۳۔

[۱۶] ابن الاثیر، جلد پنجم، ص ۱۷۰ و تاریخ التمدن الاسلامی، جلد اول، ص ۲۱۷ و ابو عبداللہ محمد بن ابی الدنیا قیروانی۔ کتاب المونس فی اخبار افریقہ وتونس، ص ۳۸، ۳۹۔

[۱۷] طبری، جلد ششم، ص ۵۲۳، ۵۳۰، ۵۳۱۔

[۱۸] شیخ الاسلام جلال الدین سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ مطبوعہ مطبع اصح المطابع س ن، کراچی، ص ۳۹۲، ۳۹۳ و الملک المؤید ابوالفداء المختصر فی اخبار البشر، مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۵ھ۔ جلد دوم ص ۳ (اندلس میں اموی حکومت ۱۳۸ھ کے اخیر میں قائم ہوئی اور ۴۲۵ھ میں داخلی انتشار کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہوگیا)۔

[۱۹] ابوالفداء جلد دوم، ص ۱۱، ۷۰ (مغرب اقصیٰ میں ادریسی حکومت ۱۷۰ھ میں قائم ہوئی اور ۳۰۷ھ میں بنو فاطمہ، مہدیہ و بربر قبائل کی مخالفتوں کے باعث اس کا سقوط ہوگیا)۔

[۲۰] ابوالفداء جلد دوم، ص ۱۶، ۶۳ (اغالبہ کی حکومت افریقہ میں ۱۸۴ھ میں شروع ہوئی اور ۲۹۶ھ میں بنو فاطمہ کے حامیوں نے اس کا خاتمہ کردیا)۔

[۲۱] انسائی کلوپیڈیا برٹینکا، مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۱۰ء (طبع یازدہم) جلد بست و پنجم، ص ۳۱۔

[۲۲] ابن عذاری المراکشی۔ البیان المغرب فی تاریخ المغرب (ترجمہ اردو پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن) مطبوعہ لاہور ۱۹۲۴ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵۔ (۲۰۹ھ میں منصور نامی شخص نے بغاوت کی اور قریب قریب پورے ملک پر مستولی ہوگیا۔ قیروان بھی اس کے زیر نگین آ گیا تھا۔ مگر اس کا عروج شعلۂ

مستعجلہ ثابت ہوا اور ۲۱۱ھ تک زیادۃ اللہ نے تمام علاقے اس سے واگذار کرا لیے)۔

[۲۳] ابن الاثیر۔ جلد ۶، ص ۲۳۵۔

[۲۴] ایضاً، جلد ۶، ۲۳۵، ۲۳۶ و ایس، پی، اسکاٹ، ہسٹری آف دی عرب ایمپائر ان یورپ (ترجمہ اردو موسوم بہ اخبار اندلس۔ مولوی خلیل الرحمٰن) طبع لاہور ۱۳۴۰ھ جلد ۲، ص ۱۱، ۱۲ (فیمی کا جرم یہ تھا کہ اس نے صقلیہ کی ایک خانقاہ کی کنواری راہبہ کو اغواء کر کے اسے داشتہ بنا لیا تھا۔ اگرچہ بقول اسکاٹ، یہ جرم اس زمانہ میں نادر الوقوع نہ تھا مگر فیمی کی حیثیت اتنی بلند نہ تھی کہ وہ رومی قانون سے مستثنیٰ کیا جاتا۔ اس لیے قیصر روم نے یہ حکم دیا کہ فیمی کی ناک کاٹ لی جائے۔ اس حکم کے خلاف فیمی نے احتجاجاً بغاوت کی اور جب اسے شکست ہوئی تو دربار اغالبہ میں فوجی مدد کے لیے حاضر ہوا)۔

[۲۵] عہد اموی میں صقلیہ کے جزیرے پر جو حملے ہوئے ان کی نوعیت تعزیری اور جوابی حملوں کی تھی، جزیرے پر مستقل طور پر قابض ہونے کی کوئی کوشش اس عہد میں نہیں کی گئی۔ عہد اموی کے حملے ۳۳ھ بعہد حضرت عثمانؓ، ۴۶ھ بعہد حضرت معاویہؓ ۸۵ھ و ۸۶ھ میں بعہد خلافت عبدالملک ۱۰۲ھ بعہد خلافت یزید ثانی، ۱۰۹ھ میں بزمانہ خلافت ہشام ہوئے۔ ہشام ہی کے عہد میں ۱۱۰ھ میں، ۱۱۱ھ میں، ۱۱۲ھ میں، ۱۱۴ھ میں، ۱۱۵ھ میں، ۱۱۶ھ میں، ۱۲۲ھ میں صقلیہ پر حملے ہوئے۔ ۱۳۵ھ میں جو حملہ ہوا وہ دورِ احتلال میں ہوا۔ جبکہ افریقہ سے اموی عمل دخل اٹھ گیا تھا، اور عباسیوں کا اقتدار بھی وہاں جم نہ سکا تھا۔ ۱۲۲ھ کے حملوں میں صقلیہ کا ساحلی شہر سرقوسہ باج گذاری کی شرط پر مسلمانوں کا مطیع ہو گیا تھا۔ ۱۳۵ھ کا حملہ اسی رقم خراج کی وصولی یابی کے لیے کیا گیا تھا۔ اس طور سے مکمل ارادۂ تسخیر سے پہلے جزیرۂ صقلیہ پر مسلمانوں نے چودہ بار حملے کیے۔ مزید تفصیل کے لیے اخبار اندلس جلد دوم، باب پانزدہم اور تاریخ صقلیہ جلد اول صفحات ۶۷-۱۰۶ ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۶] عبدالرحمٰن بن محمد انصاری، معالم الایمان فی معرفۃ اہل القیروان۔ مطبوعہ مطبع عربیہ تونسیہ، تونس ۱۳۲۰ھ جلد دوم ص ۲ تا ۱۳ و برہان الدین ابن فرحون مالکی۔ دیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب مطبوعہ مطبع سعادت، مصر، ۱۳۲۹ھ، ص ۹۸ و مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ التعلیق الممجد علی موطا امام محمد۔ مطبوعہ مصطفائی لکھنؤ، ۱۲۹۷ھ، ص ۱۷۔

(الحق، اکوڑہ خٹک ۱۹۷۰ء)

ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی

ابن الجوزی بڑے جامع الصفات بزرگ تھے۔ انھوں نے ڈھائی سو سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ کتابیں بارہ (۱۲) سے زیادہ فنون پر مشتمل ہیں، وہ صرف ایک کثیر التصانیف شخص نہ تھے بلکہ کثیر الاشغال بھی تھے۔ مصنف کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر، ایک خوش بیان واعظ، ایک بذلہ سنج بزرگ اور ایک کہنہ مشق مدرس بھی تھے۔ اللہ نے انھیں بڑی لمبی عمر عطا کی اور ستاسی (۸۷) سال کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ گو اس طویل مدت میں ان کی زندگی کتنے ہی نشیب و فراز سے گزری، خصوصاً اس کے ابتدائی سال یتیمی کے صدمے سے نڈھال رہے اور آخری سال اسیری کے وشنہ سے فگار، مگر انھوں نے کسی حال میں اپنی زندگی کے اولین مقصد یعنی تصنیف و تالیف کو نظر انداز نہ کیا اور بڑے انہماک سے اس میں مصروف رہے۔

ابن الجوزی کے حالاتِ زندگی معاصر اور متاخر تذکروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔ مگر ان کے مستند ترین حالات ان کے نواسے یوسف بن قزادعلی[۱] نے اپنی نادر کتاب مرأۃ الزماں فی تاریخ الاعیان میں لکھے ہیں۔ مراۃ الزمان چالیس جلدوں میں لکھی گئی تھی، لیکن بعد میں اسے مختصر کر کے آٹھ جلدوں میں محدود کیا گیا۔ یوسف بن قزادعلی نے جو سبط ابن الجوزی کے نام سے مشہور ہیں، اس کتاب میں ابتدائے آفرینش سے اپنے عہد تک کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس کے متعدد ذیول بھی لکھے گئے۔ ہم ذیل میں ابن الجوزی کے حالاتِ زندگی ان کے نواسے سبط ابن الجوزی کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔

ابن الجوزی بغداد کے محلے ''دربِ حبیب'' میں ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے[۲]۔ نام عبدالرحمٰن کنیت ابوالفرج اور لقب جمال الدین تھا۔ والد کا نام محمد تھا۔ نسبی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان جوزی اس لئے کہلاتا تھا کہ ان کے اجداد میں سے ایک صاحب جن کا نام جعفر تھا، بصرہ کے ایک دریائی گھاٹ، جس کا نام جوزہ تھا، کی جانب منسوب تھے۔ اس کے بعد یہ سارا خاندان اسی نسبت سے مشہور رہوا۔ ابن الجوزی ابھی تین ہی سال کے تھے کہ والد نے انتقال کیا اور ان کا کوئی مادی سہارا نہ رہا۔ اس موقع پر ان کی پھوپھی نے، جو نہایت دیندار اور متمول خاتون تھی، اس دریتیم کی پرورش کا بار اٹھایا۔ ان کی پھوپھی کے سسرالی اعزہ نحاس (تانبے) کا کاروبار کرتے تھے۔ اس لئے بعض لوگوں نے ابن الجوزی کو الصفار (ٹھٹیرا) بھی لکھا ہے، حالانکہ یہ پیشہ ان کے آباؤ اجداد کا نہ تھا۔

جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو پھوپھی انھیں ابوالفضل بن ناصر[۳] کی مسجد میں لے گئیں۔ یہاں انھوں نے ابوالفضل سے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کی۔ فقہ کی تحصیل ابوبکر دینوری[۴] اور ابن الفراء حنبلی[۵] سے کی، ابوالقاسم علوی[۶] سے فن وعظ اور ابو منصور ابن جوالیقی[۷] سے علم لغت سیکھا۔ حصول علم کے شوق میں انھوں نے ہر عالم کے آستانے پر حاضری دی اور اس عہد کے بغداد کے سرآمد روزگار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے شیوخ کی تعداد ایک عام اندازے کے مطابق اسی [۸۰] سے زیادہ ہے۔ ان کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب ''المشیخۃ'' میں کیا ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے درس وتدریس، وعظ وتذکیر اور تصنیف وتالیف میں زندگی گزاری۔ وہ اخیر عمر میں منبر پر کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی ان دو انگلیوں سے دو ہزار اجزاء لکھے ہیں، میرے ہاتھ پر ایک لاکھ مسلمان تائب ہوئے ہیں اور ایک ہزار یہودی اور نصاریٰ نے اسلام قبول کیا ہے۔[۸] یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے، ان کا تراشہ میرے حجرے میں جمع ہے، مرنے کے بعد جب مجھے نہلائیں تو غسل کے لئے اس تراشے سے پانی گرم کریں۔

چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔[۹]

واعظ کی حیثیت سے ابن الجوزی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے وعظ کی محفلوں میں حاضرین کی تعداد کم سے کم دس ہزار ضرور ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو یہ تعداد ایک لاکھ تک پہونچ جاتی تھی اور عوام الناس ہی نہیں بلکہ اعیان دولت، وزراء علماء بھی ان محافل میں شرکت کرتے تھے اکثر موقعوں پر خود خلیفہء وقت سامعین کے حلقے میں ہوتا تھا۔ ابن الجوزی کے وعظ بغداد کی تمام قابل ذکر مساجد میں ہوتے تھے مگر بعض مساجد مختلف اوقات میں ان کے مواعظ کے لئے مخصوص رہی ہیں۔ وعظ کے علاوہ دوسرا مشغلہ ان کا درس وتدریس تھا۔ نہ صرف یہ کہ بغداد کے عام مدارس میں ان کے حلقہ ہائے درس برپا ہوتے تھے بلکہ بعض مدارس انھیں کے درس کی غرض سے قائم کئے گئے تھے۔ چنانچہ ۵۷۱ ھ میں خلیفہ مستضی باللہ[۱۰] کے عہد میں محلّہ ''دار الرداشی'' میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا اس کے اخراجات کے لئے جائداد وقف کی گئی اور اس کی تدریس ونگرانی کے کام ابن الجوزی کے سپرد کئے گئے۔ اسی طرح ۵۸۸ ھ میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[۱۱] کے قایم کردہ مدرسہ کو ان کے پوتے عبدالسلام[۱۲] سے لے کر ابن الجوزی کی تحویل میں دے دیا گیا اور انھوں نے یہاں درس دینا شروع کیا[۱۳]۔ بغداد کے محلہ باب الازج کے مدرسہ میں جب انھیں مدرس مقرر کیا گیا تو بڑا اہتمام کیا گیا قاضی القضاۃ، صاحب الباب اور دوسرے امراء وعمائد کے علاوہ پچاس ہزار کے مجمع میں انھوں نے درس کا آغاز کیا[۱۴]۔ ایک مدرس کی حیثیت سے ابن الجوزی کو جو شہرت حاصل ہوئی اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور بغداد کے علاوہ باہر سے بھی طلبہ ان سے درس لینے آتے تھے[۱۵]۔ ابن الجوزی نے درس وتدریس کا یہ مشغلہ چالیس سال سے زیادہ مدت تک جاری رکھا۔[۱۶]

ایک واعظ اور مقرر کی حیثیت سے ان کی خوش بیانی اور شیریں مقالی کا عموماً اعتراف کیا گیا ہے۔ ایک مقرر کے لئے ذکاوت اور حاضر جوابی بہت ضروری ہے، چنانچہ ابن الجوزی میں یہ صفت بھی بطور خاص موجود تھی۔ ان کی حاضر جوابی کے چند واقعات کا

تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

ا۔ایک مرتبہ وہ وعظ کے دوران میں ترک دنیا کی تلقین کر رہے تھے۔انھوں نے کہا کہ دنیا کی مثال نہر طالوت کی ہے، آدمی کو اس سے گزر جانا چاہیئے وہاں ٹھہرنا نہ چاہیئے۔ایک آدمی نے کھڑے ہوکر یہ اعتراض کیا کہ آخر یہ بات کیسے ممکن ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں حب دنیا ودیعت ہے اور ارشادالٰہی ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰاتِ (خواہشاتِ نفسانی کی محبت انسان کے لئے آراستہ کی گئی ہے) ابن الجوزی نے فوراً جواب دیا

الامن اغترف (دنیا سے اتنا تمتع جائز ہے، جتنا کہ پیاس بجھانے کے لئے نہر طالوت سے ایک چلو پانی پینے کی اجازت بنو اسرائیل کو دی گئی تھی) [۱۷]۔

۲۔ایک شخص نے کھڑے ہوکر یہ فقرہ چست کیا کہ حضرت آدمؑ نے اپنے رب کے بتائے ہوئے کلمات یاد کئے اور انھیں طلب مغفرت کے لئے دوہرایا۔فتلقّیٰ آدم من ربّہٖ کلماتٍ آپ جو یہ وعظ کہہ رہے ہیں تو آپ کو کس نے سکھایا ہے؟ ابن الجوزی نے کہا کہ بیٹا باپ کا وارث ہوتا ہے۔معترض سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔[۱۸]

۳۔ایک بار محفل وعظ میں دو قاریوں نے تلاوتِ قرآن کی۔پہلے کی آواز اچھی تھی لوگ کافی محظوظ ہوئے، مگر دوسرے قاری کی آواز سے لوگوں کو تکدر ہوا۔تلاوت کے بعد جب ابن الجوزی وعظ کے لئے کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا کہ کسی شخص کے پاس دو (۲) باندیاں بڑی گائک تھیں۔ایک کی آواز بڑی دلنشیں تھی جب وہ گاتی تو وہ شخص عالم حظ وانبساط میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا۔دوسری کی آواز اچھی نہ تھی جب وہ گانے بیٹھتی تو بے چارہ مالک اپنے پھٹے ہوئے کپڑے سینے لگتا۔[۱۹]۔

ایک مقرر کی کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چست فقرے اور برجستہ تشبیہوں سے کام بھی لے۔ابن الجوزی اس صفتِ خاص میں اپنے ہم عصروں سے بھی ممتاز تھے۔ان کے فقروں کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو اچھی عربی جانتا ہو، تاہم چند ایسے فقرے

ذیل میں دیئے جاتے ہیں:۔[۲۰]

۱۔ وعظ میں انھوں نے ایک بار کہا ''مَن قنعَ طابَ عیشُہ ومَن طمعَ طالَ طیشُہ'' (جس نے قناعت کی اس کی زندگی اچھی کٹی اور جس نے لالچ کی اس کا طیش وغصہ طویل ہوا)

۲۔ ایکبار فرمایا'' البخلُ فراشُ العارِ والحرصُ فراشُ النارِ والکرمُ فراشُ الدار'' (بخل شرم کا بستر ہے حرص آگ کا بستر اور کرم گھر کا بستر ہے)

۳۔ ایک مرتبہ فرمایا'' الطاعۃ تنشطُ اللسانَ والمعاصی تذلُ الانسان'' (طاعت الٰہی زبان کو گویائی بخشتی ہے اور نافرمانی انسان کو ذلیل کر دیتی ہے)۔

۴۔ ایک وعظ کے دوران میں کہا'' آہ مِن واعظٍ اذا خطبَ سبقت الباء الطاء'' (حیف ہے اس مقرر پر جو تقریر کرنے لگے تو خطبہ دینے کے بجائے خبط ہو جائے)

۵۔ ایک موقع پر کہا '' الشعرَا وُتارُ الرباب یغنی علیھا شیطانُ الشبابِ'' (شعر رباب کے تار کی طرح ہے جسے شباب کا شیطان چھیڑتا ہے)

ابن الجوزی کی زندگی بڑی سادہ اور زاہدانہ تھی۔ وہ بہت کم آمیز انسان تھے۔ دنیاداری سے انھیں بالکل رغبت نہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت ذکر الٰہی میں بسر ہوتا تھا، چنانچہ وہ ہفتہ میں ایک قرآن ختم کرتے تھے اور گھر سے جمعہ کی نماز یا مجلس وعظ میں شرکت کے سوا کسی اور غرض سے باہر نہ نکلتے تھے۔ لہو ولعب سے انھیں اجتناب تھا اور وہ مذاق اور ٹھٹھول میں کبھی حصہ نہ لیتے تھے۔ اسی طرح اکل حلال کا بڑا التزام رکھتے تھے۔ کبھی کسی کی دعوت یا تحفہ اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک اس کے مال حلال ہونے کا یقین نہ ہو جاتا۔ وہ اپنی وفات تک اسی روش میں قائم رہے۔ کلمۂ حق کے اظہار سے نہ چوکتے اور ان کی حق گوئی خلفاء کے حضور بھی ان کو سچ بات کہنے پر آمادہ کرتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ مجلس وعظ میں خلیفہ سے انھوں نے یہ خطاب کیا کہ جو لوگ آپ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ اہل بیت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، وہ آپ کو غفلت میں رکھنا چاہتے ہیں ان لوگوں سے وہ

لوگ بہتر ہیں جو آپ کو خوفِ خدا یاد دلاتے ہیں۔ کسی ظالم حاکم کو عوام پر ظلم کرنے کی کھلی چھٹی دے دینا اور اس سے باز پرس نہ کرنا خود بڑا ظلم ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ قحط کے زمانے میں فاقے کرتے تھے تاکہ قحط زدہ لوگوں کے دکھ درد کا احساس ہو۔ آپ کو یہی روش اختیار کرنی چاہئے۔[۲۱]

سخت حیرت ہوتی ہے کہ ابن الجوزی جیسا بے نفس اور پاکیزہ سیرت انسان حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے نہ بچ سکا اور یہ حاسدان کے ہم مذہب حنابلہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''بخدا اگر امام احمد بن حنبل[۲۲] اور وزیر ابن ہبیرہ[۲۳] کا تعلق درمیان میں نہ ہوتا تو میں حنبلی مسلک سے کنارہ کش ہو جاتا۔ اگر میں حنفی یا شافعی ہوتا تو لوگ مجھے اپنے سروں پر بٹھاتے'' [۲۴]۔ ان حاسدوں کی مخالفتوں سے انھیں اپنی عمر کے آخری سالوں میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑی اور وہ اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۵۹۰ ھ میں بغداد سے بڑی ذلت کے ساتھ واسط لائے گئے اور یہاں پانچ سال تک قید تنہائی میں رکھے گئے۔ اس ابتلاء کا حال سبط ابن الجوزی کی زبان سے سنیئے۔[۲۵]۔

''۵۹۰ ھ میں خلیفہ ناصر[۲۶] نے ابن القصاب[۲۷] کو وزیر بنا کر عجم سے بلوایا، اس نے بغداد آتے ہی استاد الدار ابن یونس [۲۸] کا بڑی سختی سے مواخذہ کیا اور اسے گرفتار کر لیا، میرے نانا (ابن الجوزی) کو ابن یونس سے تعلق خصوصی تھا۔ ان کے حریفِ قدیم عبدالسلام بن عبدالوہاب بن شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی نے ابن القصاب کو یہ پٹی پڑھائی کہ ''ابن الجوزی ابن یونس کا دست راست ہے اور اس کی سازشوں سے ابن یونس نے میرے دادا کا مدرسہ اسے دلوا دیا اور میری کتابیں جلوا دیں۔ یہ ابن الجوزی ابوبکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی نسل میں ہے اور بڑا غالی ناصبی (دشمن آل علیؓ) ہے'' چونکہ ابن القصاب شیعہ تھا یہ بات سن کر میرے نانا کا سخت مخالف ہو گیا۔ اس نے خلیفہ کے پاس اُنکی شکائتیں لکھ بھجیں اور اس سے یہ حکم حاصل کر لیا کہ ان کو عبدالسلام کے حوالے کر دیا جائے۔ ادھر تو مخالف ان سازشوں میں مصروف تھے ادھر ان تمام باتوں سے بے خبر میرے

نانا اپنے مکان واقع محلہ باب الازج کے تہہ خانے میں بیٹھے ہوئے تصنیف و تالیف میں منہمک تھے۔ سخت گرمیوں کے دن تھے اور میں (سبط ابن الجوزی) کہ اس وقت کم سن تھا، ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک عبدالسلام اپنے آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس آیا اور میرے نانا کو بہت بُرا بھلا کہا۔ گھر کے تمام اثاثے اور نانا کی تمام کتابوں کو اس نے سر بہ مہر کر دیا۔ عبدالسلام نے اس پر اکتفاء نہ کی، بلکہ گھر کی عورتوں کو بھی گالیاں دی، اور ان کی بڑی ذلت کی۔ پھر رات کے وقت میرے نانا کو ایک کشتی میں ڈال کر واسط لے گیا۔ ان کے جسم پر پورے کپڑے بھی نہ تھے اور اسی نیم لباسی کی حالت میں انھیں واسط لے جایا گیا۔ عبدالسلام نے واسط کے سرکاری عہدہ داروں سے یہ کہا کہ میرے نانا کو مطمورہ [۲۹] میں ڈالدیا جائے مگر چونکہ اس ضمن میں خلیفہ کا کوئی حکم نہ تھا اس لئے اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہرکیف میرے نانا کو واسط کے عملے کے سپرد کر کے عبدالسلام بغداد چلا آیا۔ واسط کے حکام نے یہ رعایت کی کہ قید میں رکھنے کے بجائے میرے نانا کو محلہ درب الایوان کے گھر میں نظر بند کر دیا اور دروازہ پر ایک دربانؑ مقرر کر دیا کہ ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتا رہے۔ اس وقت ان کی عمر اسی (۸۰) سال تھی۔ انھیں حالتِ اسیری میں اپنے سارے کام خود ہی کرنے پڑتے تھے، وہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوتے، خود ہی کھانا پکاتے اور کنوئیں سے پانی نکالتے تھے۔ وہ اس قید میں پانچ سال تک رہے۔ اس دوران میں انھیں حمام میں جانے کی اجازت نہ تھی چنانچہ پانچ سال تک وہ حمام میں داخل نہ ہو سکے۔ اس اسیری میں ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ زمانہ اسیری میں انھوں نے اپنے بغدادی دوستوں اور متعلقین کے نام بہت سے اشعار لکھ کر بھیجے۔ انھیں اشعار میں سے مندرجہ ذیل شعر بھی ہیں۔

احبۃ قلبی لو یباع رجوعکم   علینا لکنا بالنفوس فدینا کم

(اے میرے دلی دوستو اگر ہمارے پاس تمھاری واپسی خریدی جاسکتی تو اسے ہم اپنی جانوں کے عوض خریدتے)

فلا تحسبوا انی نسیت ودادکم　　　　وانی وان طال المدیٰ لست انساکم

(یہ نہ سمجھو کہ میں نے تمھاری محبت بھلا دی ہے گو مدت طویل ہو گئی ہے مگر میں تمھیں بھولا نہیں ہوں)

قضی اللہ بالتفریق بینی وبینکم　　　　فیالیتنا من جملۃٍ ما عرفناکم

(اللہ نے ہمارے درمیان جدائی کرا دی　　　　اک کاش ہم تمھیں جانتے ہی نہ ہوتے)

بہرکیف ۵۹۵ھ میں انھیں رہائی ملی اور وہ بغداد واپس آئے لیکن یہ ایسا صدمہ تھا جس سے وہ جاں نبر نہ ہو سکے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ ان کی کتابیں جو ان کی ساری زندگی کا حاصل تھیں، بڑی بے دردی کے ساتھ ضائع کی گئیں۔ عبدالسلام نے انھیں سربمہر کر دیا تھا اس کے بعد ان (ابن الجوزی) کے دوسرے بیٹے ابوالقاسم علی نے جو عبدالسلام کا بڑا گہرا دوست تھا، انھیں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا۔ [۳۰]''

بقول سبط ابن الجوزی ان کتابوں کے اتنے دام بھی ابوالقاسم علی کو نہ ملے، جتنے ان میں استعمال کی گئی سیاہی پر صرف ہوئے تھے۔ (وباعھا ولا بثمن المداد)۔ دل شکستہ ابن الجوزی ۷، رمضان ۵۹۷ھ کو بیمار پڑے اور پندرہ روز بیمار رہ کر ۲۲/رمضان کو عشاء و مغرب کے درمیان انھوں نے انتقال کیا۔ ان کا جنازہ بروز جمعہ دن کے وقت اٹھا۔ جنازہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ اس پیکر علم وعمل کو امام احمد بن حنبل کے مقبرے کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق لوحِ مزار پر یہ اشعار کندہ کرائے گئے:۔

یا کثیرُ العفوِ عمن　　　　کثرُ الذنبُ لدیہ

(اے اللہ تو بہت زیادہ گناہ کرنے والے کو بھی معاف کر دیتا ہے)

جاءکَ المذنبُ یر　　　　جو الصفح عن جرمِ یدیہ

(تیرے حضور گناہ گار آیا ہے اور اپنے گناہوں کی بخشائش کا امیدوار ہے)

انا ضیفٌ وجزاء الضیفِ　　　　احسانٌ الیہ

(میں تیرا مہمان ہوں اور مہمان کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے)

ابن الجوزی کے تین بیٹے ابو بکر عبد العزیز، ابو القاسم علی، اور ابو محمد یوسف تھے۔

بڑے بیٹے باپ ہی کی طرح محدث اور واعظ تھے۔ عنفوانِ شباب میں ۵۵۴ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مخالفوں نے زہر دیدیا تھا۔ دوسرے بیٹے ابو القاسم علی نے بھی حصول علم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور حدیث میں صاحبِ تصنیف تھے مگر کردار کے لحاظ سے باپ کے برعکس تھے۔ جس زمانہ میں ابن الجوزی قید ہوئے تو ابو القاسم نے ان کی ساری کتابیں بیچ ڈالیں اور باپ کے مخالفوں کے ہاتھ میں آلہ کار بنے رہے۔ انھوں نے اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۶۳۰ھ میں وفات پائی۔ تیسرے بیٹے جو باپ کو بہت محبوب تھے اور وہ عصائے پیری تھے، ان کا نام ابو محمد یوسف تھا۔ ۵۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ باپ کی وفات کے وقت سترہ (۱۷) سال کے تھے۔ علوم متداولہ میں کمال بہم پہونچایا۔ خلفاء کے ہاں اقتدار پایا اور ۶۴۰ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ[۳۱] کے استاذِ دار مقرر ہوئے۔ باپ کا نام انھیں نے روشن کیا۔ بیٹیاں کئی تھیں اور سب کی سب علم حدیث کی عالمہ تھیں۔ ان بیٹیوں میں ایک کا نام رابعہ[۳۲] تھا جن کے بطن سے علامہ شمس الدین ابو المظفر یوسف بن قزاوعلی معروف بہ سبط ابن الجوزی متوفی ۶۵۴ھ پیدا ہوئے جو بہت بڑے عالم اور نانا کے علم کے وارث تھے۔

لیکن ابن الجوزی کی ان مادی یادگاروں کے سلسلے تادیر قائم نہ رہ سکے اور ان کی جو یادگاریں ہم تک پہونچیں وہ ان کے معنوی فرزند ہیں، یعنی ان کی تصانیف۔ ابن الجوزی کی تصانیف کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے ہم ذیل میں ان کا فن وار ذکر کرتے ہیں۔[۳۳]

۱۔ علم تفسیر:۔ پندرہ کتابیں تفسیر قرآن سے متعلق لکھیں۔ جن میں مشہور زاد المسیر فی علم التفسیر ہے۔

۲۔ علم حدیث:۔ اٹھائیس کتابیں (۲۸)، جن میں اہم غریب الحدیث ہے، علم حدیث سے متعلق ہیں۔

۳۔علم تاریخ وسیر:۔ بارہ (۱۲) کتابیں ہیں، جن میں اہم المنتظم فی تاریخ الملوک والا مم دس جلدوں میں، سلوۃ المحزون دو جلدوں میں، مناقب بغداد، کتاب المفاخر فی ایام الناصر اور کتاب الاعاصر فی ذکر الامام الناصر ہیں۔ حفاظ حدیث کے حالات پر بھی انھوں نے کتاب لکھی ہے۔

۴۔علم العربیہ:۔نو (۹) کتابیں عربی ادب پر لکھی ہیں۔مشہور کتاب فضائل العرب ہے۔

۵۔علم اصول الفقہ:۔ بارہ (۱۲) کتابیں اصول فقہ کی ہیں جن میں مشہور منہاج الوصول الی علم الاصول ہے۔

۶۔فقہ:۔بیس (۲۰) کتابوں میں سے اہم کتاب الانصاف فی مسائل الخلاف ہے۔

۷۔مناقب:۔مناقب پر تیئس (۲۳) کتابیں ہیں۔اہم مناقب عمر بن الخطاب اور کتاب شرف اصحاب الحدیث ہیں۔

۸۔رقائق:۔چوبیس (۲۴) کتابوں میں سے مشہور صفۃ الصفوۃ چار جلدوں میں ہے۔

۹۔عبادات وعقائد:۔بتیس (۳۲) کتابوں میں سے مشہور تلبیس ابلیس ہے۔

۱۰۔علم طب:۔طب پر چھ (۶) کتابیں لکھی ہیں۔خاص کتاب الشیب والخضاب ہے۔

۱۱۔علم شعر:۔علم شعر پر دس (۱۰) کتابیں ہیں۔اہم احکام الاشعار دو جلدوں میں ہے۔

۱۲۔وعظ:۔وعظ پر ساٹھ (۶۰) کتابیں لکھی ہیں سب سے مشہور کتاب الذخیرۃ ہے۔

ان تمام علمی تنوع کے ساتھ ساتھ ابن الجوزی کو فن شعر گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے اشعار پر وعظ وپند کا رنگ غالب ہے مگر اس کے باوجود ان کے اکثر اشعار لطف سے خالی نہیں۔ان میں شاعرانہ نوک جھوک بھی ہے اور تعلّی بھی۔اسی طرح دنیا کی بے ثباتی کا بھی بیان ہے اور سوز وگداز عشق کا بھی۔اپنے حریفوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

اذا فهتُ لم ینطقْ عدوی بلفظةٍ   اذا ورد الفرغام لم یبلغ الذئب

(جب میں بولتا ہوں تو میرا حریف ایک لفظ بھی بول نہیں سکتا۔ہاں جب شیر پانی پینے گھاٹ پر آتا ہے تو وہاں بھیڑیے نہیں پہنچتے۔)

اپنے وعظ کے حسن پر تعلی کرتے ہیں:۔

تزدحمُ الالفاظُ والمعانی   علیٰ فوادی وعلیٰ لسانی

(ہجوم کرتے ہیں الفاظ ومعانی   میرے دل وزبان پر)

تجری بی الافکارُ فی المیدانِ   ازاحمُ النجم علیٰ المکانِ

(میرے افکار مجھے میدانِ علم میں دوڑاتے ہیں اور بلندیٔ مکان میں ستاروں سے ہمسری کرتا ہوں)

بے ثباتیٔ عالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

یا ساکن الدنیا تاھب   وانتظر یومُ الفراقِ

(اے دنیا کے باسی تیاری کر اور انتظار کر روزِ فراق کا)

وابک الذنوب یادمع   تنھل من سُحب الماٰق

(گناہوں کو ان آنسوؤں سے دھو جو آنکھوں کے بادلوں سے بہتے ہیں)

یامن اضاع زمانہٗ   ارضیت مایغنی بباق

(اے وہ شخص کہ اس نے اپنا وقت گنوادیا تو کیا تو باقی کے عوض فانی پر راضی ہوگیا)

شوق وسوز وگداز عشق کا بیان ملاحظہ ہو:۔

ومازال یشکو الشوق حتیٰ کأنہّٗ   تنفّسَ من احشانہ تکلّمَا

(وہ شوقِ عشق کا شکوہ کرتا رہا تا آنکہ ایسا معلوم ہوا کہ اس نے قلب وجگر کی گہرائیوں سے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا)

ویبکی فابکی رحمۃً لبکاتہٖ   اِذا مابکیٰ دمعاً بکیت لہٗ دما[۳۴]

(اور وہ روتا ہے تو میں بھی اس پر محبت سے رونے لگتا ہوں۔ وہ آنسو روتا ہے تو میں خون روتا ہوں)

حواشی

[۱]۔ سبط ابن الجوزی: ۔شمس الدین ابوالمظفر یوسف بن عبداللہ قزاوغلی، ابن الجوزی کی بیٹی رابعہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔باپ ان کے ترکی النسل تھے۔نانا کی آغوشِ تربیت میں پلے اور انھیں کے تعلق سے سبط ابن الجوزی کے نام سے مشہور ہوئے۔علوم حدیث وفقہ کی تحصیل کی اور نانا کی طرح مجالس درس ووعظ کے صدر نشین ہوئے۔شام کے ایوبی حکم رانوں کے دربار میں بڑا اعتبار پایا۔خصوصاً الملک لافضل سے بڑی خصوصیت تھی۔نانا کے مسلک حنبلی سے رجوع کر کے مسلک حنفی اختیار کیا۔۶۵۴ھ میں انتقال کیا۔مراۃ الزمان ان کی اہم تالیف ہے(سبط ابن الجوزی۔مراۃ الزمان فی تاریخ الاعیان مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۵۲ء جلد ہشتم قسم اول ودوم سے اقتباس)

[۲]۔ابن الجوزی کی صحیح تاریخ ولادت کا تعین نہیں ہوسکا ہے۔اس سلسلے میں سب سے مستند روایت ان کے نواسے (سبط ابن الجوزی) کی ہے۔ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے نانا سے کئی بار ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں دریافت کیا مگر ہر بار ان کا جواب یہی ہوتا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے(مـــاأحـــقـــقـــه) مگر میری تاریخِ ولادت تقریباً ۵۱۰ھ ہوگی۔(مرآۃ الزماں، ج ۸، ق۲ص ۴۸۳) میں نے اسی بیان پر اعتماد کر کے ان کی ولادت ۵۱۰ھ درج کی ہے۔جب سال ولادت سے متعلق ''تقریباً'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو ماہ وروز کا کیسا ذکر؟۔

[۳]۔ابوالفضل بن ناصر:۔ابوالفضل محمد بن ناصر فارسی الاصل تھے۔۴۷۷ھ میں پیدا ہوئے وہ محدث، حافظ اور فقیہ تھے۔ابن الجوزی کے اکابر شیوخ میں تھے وہ ان کی ثقاہت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔گیارہ سال کی عمر میں ابن الجوزی نے ان سے حدیث کی تعلیم شروع کی۔۵۵۰ھ میں وفات پائی (مرآۃ ج۸، ق۱،ص ۲۲۶)

[۴]۔ابوبکر دینوری محدث وفقیہ تھے۔علم مناظرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔۵۳۲ھ میں

انتقال کیا۔ مقبرۂ امام احمد کے قریب دفن کیے گئے (ابن الجوزی۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ حیدر آباد (دکن) ۱۳۵۸ء جلد دہم، صفحہ ۷۳)

[۵]۔ ابن الفراء حنبلی:۔ محمد بن محمد فراء ۴۵۹ھ میں پیدا ہوئے محدث، فقیہہ اور زاہد تھے۔ پیر کے دن ۱۹/صفر ۵۲۷ھ کو وفات پائی اور اپنے گھر ہی میں جو محلہ باب الازج میں تھا سپرد خاک کیے گئے۔ (المنتظم ج ۱۰، ص ۳۴)

[۶]۔ ابوالقاسم علوی:۔ علی بن یعلیٰ العوض الہروی محدث اور واعظ تھے۔ نیشا پور کے عوام وخواص میں بہت مشہور تھے۔ وہ بغداد آئے اور یہاں وعظ کہے، ان مواعظ کی بڑی پذیرائی ہوئی، جب یہاں سے رخصت ہوئے تو اہل شہر دور تک ساتھ گئے ابن الجوزی اس وقت کم سن تھے وہ ابوالقاسم کے وعظ میں شریک ہوئے پھر ان سے ان کی قیام گاہ پر ملے، فن وعظ سیکھا اور اس سے متعلق بات چیت کی۔ انھوں نے ۵۲۷ھ میں مرو میں وفات پائی۔ (المنتظم، ج ۱۰، ص ۳۲)

[۷]۔ ابومنصور جوالیقی:۔ موہوب بن احمد ۴۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ بغداد کے محلہ باب المراتب میں نشونما پائی۔ حدیث ولغت کے ماہر تھے۔ مدرسۂ نظامیہ میں عربی ادب کے استاد تھے۔ خلیفہ مقتفی نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھی تھیں۔ متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ جب کسی مسئلہ پر بات چیت ہوتی تو کافی غور وفکر کے بعد بولتے اور جو بات نہ جانتے اس سے اپنی ناواقفیت کے اظہار میں جھجک نہ محسوس کرتے تھے۔ ابن الجوزی نے ان سے حدیث اور غریب الحدیث سماعت کی اور ان کی تصانیف بالخصوص المعرب کا درس لیا۔ فن لغت بھی انھیں سے سیکھا۔ بروز یک شنبہ ۱۵/محرم ۵۴۰ھ کو وفات پائی (المنتظم ج ۱۰، ص ۱۱۸)

[۸]۔ مرآۃ الزماں ج ۸، ق ۲، ص ۴۸۱ و ۴۸۲۔

[۹]۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیات سعدی۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۔

[۱۰]۔ خلیفہ مستضیئ باللہ:۔ ابومحمد حسن المستضیئ باللہ اپنے باپ المستنجد باللہ کی وفات کے بعد ۵۶۶ھ میں خلیفہ ہوا۔ اس کا عہد صرف اس لئے مشہور ہے کہ ۵۶۷ھ میں مصر وشام سے بنی فاطمہ کا عمل دخل اٹھ گیا اور سلطان صلاح الدین نے مصر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ مستضیئ نے ۵۷۵ھ

میں وفات پائی۔ (ابن طقطقی۔ الفخری فی آلاداب السطانیہ۔ مطبوعہ رحمانیہ مصر ۱۳۴۵ھ ص ۲۴۳)

[۱۱]۔ حضرت شیخ عبدالقادر حنبلی جیلانی :۔ شیخ جیلان میں ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں حدیث و فقہ حنبلی کی تحصیل کی اور تصوف میں شیخ ابوالخیر حماد و باس کے شاگرد ہوئے۔ مدرسہ باب الازج ان کے سپرد کیا گیا۔ یہاں انھوں نے حدیث کی تعلیم اور وعظ کا آغاز کیا۔ ان کے زہد و وعظ کا دور دور شہرہ ہوا۔ مدرسہ کی عمارت حاضرین مجلس و وعظ کے لئے ناکافی ہوئی تو شیخ نے شہر پناہ کے باہر وعظ کہنا شروع کیا۔ بکثرت لوگ ان کے ہاتھ پر تائب ہوئے۔ ان کا وعظ مدت العمر جاری رہا۔ شیخ نے ۹۱ سال کی عمر میں ۵۶۱ھ میں وفات پائی اور اپنے مدرسے میں مدفون ہوئے۔ وہ مشہور قادریہ سلسلۂ تصوف کے بانی ہیں۔ الغنیۃ لطالب طریق الحق، الفتوح الربانی اور فتوح الغیب ان کی تصانیف سے ہیں۔ (المنتظم ج ۱۰، ص ۲۲۱ و انسائی کلوپیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ ۶۹ و ۷۰ طبع لیڈن ۱۹۶۰ء)

[۱۲]۔ عبدالسلام :۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے پوتے اور شیخ عبدالوہاب کے بیٹے تھے۔ انھوں نے باپ دادا کے طریقے سے ہٹ کر آزادہ روی اختیار کی۔ درباری کی چاٹ لگ گئی تھی۔ ابتداء میں پوبارہ رہے۔ مگر پھر خلیفہ کی نظروں سے گر گئے۔ کتب خانہ ضبط اور مدرسہ چھن گیا۔ اخیر میں خلیفہ ناصر کے چھوٹے بیٹے الامیر الصغیر علی کے وکیل ہو گئے تھے۔ سبط ابن الجوزی کے ایک مندرجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم ابن الجوزی سے عبدالسلام کی گاڑھی چھنتی تھی اور ان کی نجی مجلسوں میں شراب نوشی و امرد پرستی کے مشغلے بھی جاری رہتے تھے۔ عبدالسلام نے ۶۱۱ھ میں انتقال کیا۔ (مرآۃ، ج ۸، ق ۲، ص ۵۲۹ و ۵۳۱)

[۱۳]۔ مرآۃ، ج ۸ ، ق ۱، ص ۴۱۵   [۱۴]۔ ایضاً ص ۳۲۶۔

[۱۵]۔ ابن کثیر دمشقی، البدایہ والنہایہ، مطبوعہ القدوسیہ، لاہور ۱۴۰۳ھ۔ ج ۱۳، ص ۲۸ و بعد۔

[۱۶]۔ مرآۃ ج ۸، ق ۲، ص ۴۸۲۔

[۱۷]۔ ایضاً ص ۴۸۹۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (جب طالوت اپنی فوج کے ساتھ رخصت ہوئے تو انھوں نے کہا اللہ ایک دریا کے بارے میں تمھیں آزمائش میں ڈالے گا، جو اس کا پانی پیئے گا وہ ہم

میں سے نہیں ہے، اور جو اسے نہ چکھے گا وہ ہم میں سے ہے بجز اس کے جو اس پانی سے ایک چلو بھر لے لے) سورۃ بقرہ آیت ۲۴۹۔

[۱۸]۔ مرآۃ ج ۸، ق۲، ص۴۹۲۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (سو آدم کو ملے اپنے رب کے پاس سے چند کلمے، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی) سورۃ بقرہ آیت ۳۷۔

[۱۹]۔ مراۃ ج ۸، ق۲، ص۴۹۰

[۲۰]۔ ایضاً ص۴۹۱

[۲۱]۔ ایضاً ص۴۹۱ و ۴۹۲

[۲۲]۔ امام احمد بن حنبل :۔ اہل سنت کے چوتھے امام احمد بن حنبل شیبانی ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ امام شافعی اور امام ابو یوسف کے شاگرد تھے۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ فتنہء خلق قرآن میں امام کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی اور مامون، معتصم و واثق کے مظالم کا پندرہ سال تک بڑی پامردی سے مقابلہ کرتے رہے (ابن کثیر دمشقی، البدایہ و النہایہ۔ ج ۱۰، ص۳۴۰ و بعد۔)

[۲۳]۔ وزیر ابن ہبیرہ :۔ عون الدین ابو المظفر یحی بن ہبیرہ ۴۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے ابتدائی زندگی بڑی تنگی ترشی میں کٹی۔ ابن ہبیرہ نے بڑی محنت سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ تجوید، حدیث، فقہ، نحو، لغت اور عروض میں مہارت پیدا کی اور کتابیں لکھیں۔ ملازمت کا آغاز بہت معمولی اسامی سے کیا، مگر اپنی اعلی صلاحیتوں کے باعث ترقی کے زینے طے کرتے رہے اور خلیفہ مقتفی کے عہد میں منصب وزارت پر فائز ہوئے۔ وہ اپنی وفات تک اس عہدۂ جلیلہ سے وابستہ رہے خلیفہ مقتفی اور خلیفہ مستنجد بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ابن ہبیرہ جیسا جامع الصفات وزیر پورے خاندانِ عباسی میں کوئی اور نہیں گزرا ہے۔ سیاست و تدبر میں ابن ہبیرہ کا جواب نہ تھا۔ عراق سے آل سلجوق کی حکومت انھیں کے زور تدبر سے ختم ہوئی۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کی سالانہ تنخواہ ایک لاکھ دینار تھی مگر سال کے اختتام پر ان کے پاس کچھ نہ بچتا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ مجھ پر کبھی زکوۃ واجب نہ ہوئی۔ جن لوگوں نے عالم پریشانی میں ابن ہبیرہ سے

بدسلوکی کی تھی انھوں نے ان کو بھی نوازا اور جو حسن سلوک سے پیش آتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ ان کی عنایات سے بہرہ اندوز نہ ہوتے تو کون ہوتا۔ طبیعت میں بلا کا انکسار تھا مگر اس کے ساتھ ہی وقار بھی تھا۔ ابن ہبیرہ کی سیات کاری، تدبر، سخاوت، تواضع اور وقار کے بہت سے واقعات کتب تاریخ میں مذکور ہیں۔ ابن الجوزی سے وزیر کا تعلق خصوصی تھا اور وہ قصر وزارت میں ہر جمعہ کو وعظ کہتے تھے۔ اس مجلس میں شرکت کی صلائے عام تھی۔ وزیر نے اس تعلق کو مزید مستحکم یوں کیا کہ ابن الجوزی کے بیٹے ابو القاسم سے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی۔ ۵۶۰ ھ میں اچھے خاصے سوئے تھے کہ طبیعت خراب ہوئی، طبیب کو بلایا گیا، اس نے دوا دی مگر افاقہ کے بجائے حالت اور خراب ہوگئی اور چند گھنٹوں میں وزیر نے انتقال کیا۔ ابن الجوزی جنھوں نے اپنے مربی کو آخری غسل دیا، کہتے تھے کہ انھیں طبیب نے زہر دے دیا تھا۔ (المنتظم، ج ۱۰ ص ۲۱۴ ۔ ۲۱۷ مرآۃ، ج ۸ ق اص ۳۳۲ والفخری، ص ۲۲۹ ۔ ۲۳۱)

[۲۴]۔ مرآۃ، ج ۸، ق ا، ص ۳۲۶۔ [۲۵]۔ ایضاً ص ۴۳۸ ۔ ۴۴۰۔

[۲۶]۔ خلیفہ ناصر لدین اللہ:۔ ابو العباس احمد کی بیعت خلافت ۵۷۵ ھ میں اپنے باپ مستضئ کی وفات کے بعد ہوئی۔ اس نے ۶۲۲ ھ میں انتقال کیا۔ مدت حکومت ۴۷ سال کے قریب ہے جو عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ ہے۔ وہ بڑا بیدار مغز، مدبر، شجاع اور فاضل شخص تھا مگر ساتھ ہی بخیل بھی تھا۔ اس کے حسنِ تدبیر سے خلافت عباسیہ نے ترقی کی۔ ناصر اپنے حریفوں کو مختلف سیاسی اور سازشی حربے استعمال کر کے کمزور کرتا رہتا تھا۔ اس کے عہد میں جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اس نے متعدد رباط، مہمان خانے اور مساجد تعمیر کروائیں۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب حکمران تھا۔ (الفخری، ص ۲۳۶)

[۲۷]۔ ابن القصاب:۔ مؤید الدین ابو المظفر محمد بن احمد بن قصاب عجمی النسل تھا۔ اس کا باپ بغداد میں گوشت بیچتا تھا اس لئے ابن القصاب کہلاتا تھا۔ اس نے علم دفتری یعنی حساب، مساحت و مراسلت میں دست گاہ حاصل کی اور دیوان خلافت میں ملازم ہوا۔ ترقی کر کے منصب وزارت تک پہونچا۔ اس نے اپنی خوش انتظامی سے امور وزارت کو بخوبی انجام دیا، خوزستان و بلادِ عجم فتح

کئے ۔ ابن القصاب کا ان معدودے چند وزراء میں شمار ہوتا ہے جو صاحب سیف و قلم تھے ۔ (الفخری، ص ۲۳۸)

[۲۸] ۔ ابن یونس :۔ جلال الدولہ ابوالمظفر عبید اللہ بن یونس حنبلی خلیفہ ناصر کا وزیر تھا۔ وہ ابتداء میں زمرۂ شاہدین عدل میں تھا پھر ترقی کر کے وزیر ہوا۔ طغرل بن ارسلان کے خلاف لشکر کشی میں فوج خلیفہ کا سرعسکر یہی تھا۔ اس فوج کو شکست ہوئی، مگر ابن یونس پامردی سے ڈٹا رہا، طغرل نے اسے گرفتار کر لیا۔ ایک مدت تک اسیر رہا۔ جب رہا ہوا تو بغداد آیا مگر اس کے بعد اس کا عہد وزارت جلد ہی ختم ہو گیا اور اس نے وفات پائی (مرآۃ، ج ۸، ق ا، ص ۲۶۵ و الفخری، ص ۲۳۷)

[۲۹] ۔ مطمورۃ :۔ زیر زمین سرداب جس میں بیج وغیرہ چھپا کر رکھے جاتے ہیں۔ نیز زیر زمین قید خانہ اور یہاں یہی مراد ہے (لوئس معلوف یسوعی ۔ المنجد ۔ مطبوعہ بیروت ۱۹۵۱ء، ص ۴۹۰)

[۳۰] ۔ المرآۃ، ج ۸، ق ۲، ص ۵۰۰ ۔ ۵۰۲ ۔

[۳۱] ۔ خلیفہ مستعصم باللہ :۔ ابواحمد عبداللہ آخری عباسی خلیفہ، بغداد ۶۴۰ھ میں خلیفہ ہوا اور صفر ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھ سے شہید ہوا۔ دیندار، نیک سیرت، فیاض اور سیر چشم تھا مگر امور سلطنت سے چنداں آگاہ نہ تھا۔ (الفخری، ص ۳۴۴)

[۳۲] ۔ رابعہ خاتون :۔ ابن الجوزی کی یہ فاضلہ بیٹی اپنی دوسری بہنوں کی طرح حدیث کی عالمہ تھیں ۔ ان کا پہلا نکاح ابوالفتح بن رشید طبری سے ہوا، مگر شوہر کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا نکاح عبداللہ ترکی سے ہوا ۔ جس سے یوسف پیدا ہوئے جو سبط ابن الجوزی کے نام سے مشہور ہیں ۔ (المرآۃ، ج ۸ ق ا، ص ۳۳۲)

[۳۳] ۔ مرآۃ، ج ۸، ق ۲، ص ۴۸۳ ۔ ۴۸۹ ۔ [۳۴] ۔ ایضاً، ص ۴۹۳ ۔ ۴۹۴ و ۴۹۹ ۔

(مطبوعہ "نگار"، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ooo

کتاب	مصنف	قیمت
14۔تاروں پہ لکھے نام (خاکے)	امراؤ طارق	150/-
15۔ اسلامی روایات کا تحفظ	ڈاکٹر جمیل واسطی	120/-
16 ڈھونڈو گے انہیں (خاکے)	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	200/-
17۔تفسیر سورۃ ھود	شہر یار بانو	60/-
18۔الصدیق	پروفیسر علی محسن صدیق	300/-
19۔جدید ترکی (ترکی کی سیاسی تاریخ)	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	250/-
20۔کالا گلاب (افسانے اور ناولٹ)	نجم فضلی	150/-
21۔شجر حیات (ناول)	نجم فضلی	زیر اشاعت
22۔تفسیر سورۃ یوسف	شہر یار بانو	60/-
23۔تفسیر سورۃ الرعد	شہر یار بانو	60/-
24۔تفسیر سورۃ ابراہیم	شہر یار بانو	زیر اشاعت
25۔تفسیر سورۃ نحل	شہر یار بانو	60/-
26۔تفسیر سورۃ حجر	شہر یار بانو	60/-
27۔دشت امکاں (سفر نامہ نجد و حجاز) اشاعت ثانی نگار سجاد ظہیر		200/-
28۔مطالعہ تہذیب	نگار سجاد ظہیر	125/-
29۔کتاب الملل والنحل	عبدالکریم امام شہرستانی مترجم: پروفیسر علی محسن صدیقی	280/-
30۔دست قاتل (افسانے)	نگار سجاد ظہیر	75/-
31۔عرب اور موالی (زیر طبع)	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	350/-
32۔مختار ثقفی	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	50/-

33۔ خواتین اور معاشرتی برائیاں	ڈاکٹر صادقہ سید	60/-
34۔ نصف گرما کی شب کا خوابِ عجیب	ولیم شیکسپیئر منظوم اردو ترجمہ: منشی غلام قادر واسطی	60/-
35۔ حجاج بن یوسف (غیر معروضیت کا شکار)	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	12/-
36۔ غلامی (ایک تحقیقی جائزہ)	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	15/-
37۔ سورہ بنی اسرائیل	شہر یار بانو	60/-
38۔ سورہ کہف	شہر یار بانو	60/-
39۔ سورہ انبیاء و سورہ مومنون	شہر یار بانو	60/-
40۔ سورہ مریم و سورہ طٰحٰہ	شہر یار بانو	60/-
41۔ کتاب المحبر	محمد ابن حبیب بغدادی ترجمہ: ڈاکٹر حمید اللہ	زیر طبع
42۔ مقالاتِ تاریخی	پروفیسر علی محسن صدیقی	250/-
43۔ شمس کبیر	کبیر احمد جائسی	زیر طبع

قرطاس

پوسٹ بکس نمبر 8453، کراچی 75270

فون/فیکس: 9243966

"مقالاتِ تاریخی" پروفیسر علی محسن صدیقی کے ان

مقالات کا منتخب مجموعہ ہے جو اسلامی علوم، بالخصوص اسلامی تاریخ کے

موضوع پر تحریر کئے گئے اور مختلف علمی جرائد میں شائع ہو [illegible]

اس مجموعہ میں شامل مضامین کا عرصۂ تحریر ثلث صدی [illegible]

اور بعض مضامین اتنے اہم ہیں کہ ان پر نہ [illegible]

گیا تھا اور نہ ہی آج تک کوئی اضا [illegible]

ادارۂ قرطاس ملک [illegible] مورخ کے دیگر

اہم علمی مقالات کے مزید [illegible] شائع کرے گا، انشاءاللہ

مقالاتِ تاریخی

پروفیسر علی محسن صدیقی

قرطاس